جملہ حقوق محفوظ

۷۸۶

مطالب الغالب

یعنی

دیوانِ غالب اردو کی بہترین و جدید ترین شرح

مؤلفہ

مولانا سُہا

حسب فرمائش

شیخ مبارک علی تاجر کتب اندرون لوہاری دروازہ لاہور

۱۹۲۸ء

([illegible])

باہتمام میر قدرت اللہ کریمی پریس لاہور میں چھپا

قیمت فی جلد ۸ مجلد ے

بار دوم

آفاق احمد

عرضِ حال

مدھیہ پردیش اردو اکادمی' اردو کے عظیم شاعر مرزا غالب کی دوسری صدی تقریبات کے موقع پر بھوپال کے مایہ ناز شاعر اور شارح مولانا سہا مجددی کی شرح "مطالب الغالب" کا عکسی ایڈیشن شائع کرنے کی سعادت حاصل کر رہی ہے۔ اس سے پہلے ۱۹۸۲ء میں اکادمی دیوان غالب جدید المعروف بہ نسخۂ حمیدیہ کا عکسی ایڈیشن ڈاکٹر عبدالرحمٰن بجنوری کے مقدمے سمیت شائع کر چکی ہے۔

نسخۂ حمیدیہ کا عکسی ایڈیشن شائع کرنے کی ضرورت یوں محسوس ہوئی تھی کہ وہ بے حد کمیاب تھا اور خطرہ تھا کہ اگر اس کی اشاعت عمل میں نہیں آئی تو بالکل نایاب ہو جائے گا۔ کم و بیش یہی خطرہ "مطالب الغالب" کے سلسلے میں بھی درپیش تھا۔ چناں چہ اکادمی کی اشاعتی کمیٹی کے فاضل اراکین نے یہ فیصلہ کیا کہ غالب کی دوسری صدی تقریبات کو جہاں اردو اکادمی ظاہری شان و شوکت کے ساتھ منائے وہاں وہ مستقل نوعیت کا ایک کام یہ بھی کرے کہ "مطالب الغالب" کے عکسی ایڈیشن کی اشاعت اپنے ہاتھ میں لے۔

اکادمی نے جب اس کام کی تکمیل کا بیڑا اٹھایا تو محسوس ہوا یہ اتنا آسان نہیں ہے جتنا سمجھ لیا گیا تھا۔ "مطالب الغالب" کی تلاش کی مہم شروع کی گئی تو سب سے پہلے دستِ تعاون میرے دوست ڈاکٹر عبدالباقی (جبل پور) نے دراز کیا اور ان کی کوششوں سے "مطالب الغالب" کا پہلا ایڈیشن دستیاب ہو گیا۔ یہ ۱۹۲۳ میں شائع ہوا تھا۔ لیکن یہ دیکھ کر بڑی مایوسی ہوئی کہ جگہ جگہ سے اس کے اندرونی صفحات ندارد تھے۔ غالباً "لائق طلباء" نے "امتحانی ضروریات"

کے لیے اُنھیں کتاب سے جدا کر دیا تھا اور یہ بھی نہیں سوچا تھا کہ وہ کتنا بڑا ادبی جرم کر رہے ہیں۔ یہ بات میرے علم میں تھی کہ شمس الرحمٰن فاروقی صاحب کے پاس "مطالب الغالب" ہے۔ میں نے اس سلسلے میں اُنھیں الہ آباد فون کیا۔ انھوں نے فوراً شروع کے ۶ صفحات، دیباچے کے آخری دو صفحات اور آخر کے چار صفحات کی فوٹو اسٹیٹ کاپی فراہم کرائی اور یہ توقع ظاہر کر کے حوصلہ بڑھایا کہ "آپ کی نگرانی میں مطالب الغالب کی اشاعت بحسن خوبی انجام پائے گی۔" فاروقی صاحب کے پاس "مطالب الغالب" کا تیسرا ایڈیشن مطبوعہ ۱۹۲۱ء کا نسخہ تھا۔ اسی دوران مجھے خیال آیا کہ علی گڑھ میں میرے کرم فرما حکیم ظل الرحمٰن کے پاس "غالبیات" کا جو خزانہ ہے اس میں مطالب الغالب کا بھی نسخہ ہے۔ ظل الرحمٰن بھائی کسی کو کتاب دینے کے معاملے میں بے حد محتاط ہیں لیکن آپ نے کمال مہربانی فرمائی اور نسخہ عنایت کیا۔ لیکن اس میں ٹائٹل اور انتساب والے صفحات کم تھے، دیباچہ سے شروع ہوتا تھا۔ میں نے تلاش کی مہم جاری رکھی اور اپنی مشکلات استادِ محترم ڈاکٹر ابو محمد سحر کے سامنے پیش کیں۔ آپ کا کرم ہمیشہ میرے شاملِ حال رہا ہے۔ آپ نے اپنے ذاتی ذخیرۂ کتب میں سے مطالب الغالب کا ایک مجلد نسخہ عنایت فرمایا لیکن یہ ناقص الاول اور ناقص الآخر تھا۔ یعنی صفحہ ۵ سے شروع ہوتا تھا اور صفحہ ۳۹۶ پر ختم ہو جاتا تھا۔ اس کے علاوہ صفحہ ۳۵۲ سے لیکر آخر تک دیمک حاشیے کو چاٹتی ہوئی اصل عبارت تک آگئی تھی۔ جبکہ باقی صفحات بہت اچھی حالت میں تھے۔ پتہ چلا کہ یہ بھی "مطالب الغالب" کا تیسرا ایڈیشن تھا۔ اسی دوران میرے شاگرد دوست عزیز اندوری نے اپنے محترم والد کی قائم کردہ لائبریری سے "مطالب الغالب" کا ایک نسخہ عنایت فرمایا۔ یہ پہلا ایڈیشن تھا لیکن ناقص الاول تھا۔ حکیم ظل الرحمٰن والا نسخہ دوسرا ایڈیشن تھا۔ ان چار نسخوں کے حصول کے بعد مجھے اطمینان ہوا کہ ان سب کی مدد سے ایک اچھا عکسی ایڈیشن شائع کیا جاسکتا ہے۔ زیر نظر ایڈیشن میں مقدمہ نسخۂ اول سے شامل کیا گیا ہے۔ صفحہ ایک سے ۳۵۲ تک سحر صاحب کے عنایت کردہ نسخے سے، صفحہ ۳۵۲ سے ۳۹۶ تک حکیم ظل الرحمٰن کے نسخے سے اور آخر والے صفحات پھریاتی صاحب کے دیے ہوئے نسخے سے شامل کیے گئے ہیں۔ یہاں یہ تحریر کرنا ضروری ہے کہ مولانا سُہا نے جو مقدمہ تحریر کیا ہے اُسے صفحات کی مولانا سُہا کی دی ہوئی

ترتیب کے مطابق لیا ہے۔ اور بعد میں شرح ہے جو از سرِ نو صفحہ نمبر ایک سے شروع ہوتی ہے۔

جب "مطالب الغالب" کو طباعت کے لیے لقاء الرحمٰن صاحب کے حوالے کیا تو اُنھوں نے کہا کہ کاغذ بہت بوسیدہ ہو کر پیلا پڑ گیا ہے۔ اگر اس کا سائز بڑھا کر فوٹو اسٹیٹ کرایا گیا تو داغ دھبے اور سطح اور نمایاں ہو کر عیب بن جائیں گے۔ اس مسئلہ کا حل میرے بھائی شاہد علی خاں نے، جو کہ مکتبہ جامعہ کے روحِ رواں ہیں اور کتابوں کی طباعت کا کافی عملی تجربہ رکھتے ہیں، یہ نکالا کہ بڑے سائز میں الیکٹرو اسٹیٹ کاپی نکالی جائے اور پھر داغ دھبوں کو کیمیائی عمل سے دور کیا جائے۔ اُن کے مشورے پر لقاء صاحب نے عمل کیا اور شب و روز کی مقدور بھر محنت کے بعد کتاب کو اس حالت میں لائے کہ چھپنے کے قابل ہو گئی۔

"مطالب الغالب" کے اصل نسخوں کی اشاعت ۲۰×۳۰/۱۶ سائز کے کاغذ پر ہوئی تھی جبکہ اکادمی کا موجودہ ایڈیشن انلارج کر کے ۲۳×۳۶/۱۶ پر شائع کیا جا رہا ہے۔

"مطالب الغالب" کا پہلا، دوسرا اور تیسرا ایڈیشن بہ فرمائش شیخ مبارک علی تاجرِ کتب اندرون لوہاری دروازہ لاہور چھاپا گیا جبکہ اس کے مہتمم اور پریس بدلتے رہے۔ پہلا ایڈیشن (۱۹۲۳) بہ اہتمام ملک دین محمد مینیجر دین محمدی اسٹیم پریس لاہور کے ذریعہ، دوسرا ایڈیشن (۱۹۲۸ء) بہ اہتمام میر قدرت اللہ کریمی پریس لاہور کے ذریعہ اور تیسرا ایڈیشن (۱۹۳۱) بہ اہتمام حافظ محمد عالم پرنٹر عالمگیر الیکٹرک پریس لاہور کے ذریعے شائع کیے گئے۔

بعد والے دو نسخوں کے کاتبوں نے کوشش کی تھی کہ کتابت میں بہت زیادہ فرق نہ آئے لیکن کافی محنت کے باوجود کاتب صاحبان اپنی کاوش میں کامیاب نہیں ہو سکے ہیں، مثلاً، پہلے ایڈیشن کے پانچویں صفحے کی پہلی لائن "بعض علوم" پر ختم ہوتی ہے۔ دوسرے ایڈیشن میں کوشش کامیاب رہی ہے جبکہ تیسرے ایڈیشن میں لفظ "کو" کا اضافہ ہو گیا ہے۔ اسی طرح اسی صفحے کی آخری لائن کے آخری الفاظ "آج تک شاعری کے حدود" ہیں لیکن دوسرے اور تیسرے میں "آج تک شاعری" پر یہ صفحہ ختم ہوتا ہے۔

اسی طرح صفحہ ۲۰ تک آتے آتے تینوں ایڈیشنوں کی پہلی لائن اس مصرعے سے شروع ہوئی ہے:

"یا شب کو دیکھتے تھے کہ ہر گوشۂ بساط"

لیکن آخری لائن کا خاتمہ پہلے اور دوسرے ایڈیشن میں تو " زمین و آسمان " پر ہوتا ہے لیکن تیسرے میں لفظ " کا " کا اضافہ ہو جاتا ہے۔

مناسب معلوم ہوتا ہے کہ یہاں چند باتیں مولانا سُہا مجددی کے بارے میں بھی کر لی جائیں۔

جب " مطالب الغالب " شائع ہوئی تو اُس وقت تک مولانا سہا کے نام میں مجددی کا اضافہ نہیں ہوا تھا۔ دراصل بعد میں جب مولانا سہا نے حضرت شاہ محمد یعقوبؒ کے ہاتھ پر بیعت کی تو خود کو مجددی بھی لکھنے لگے۔

مولانا سُہا نے ۵۵ سال کی عمر پائی اور ۲۷ر دسمبر ۱۹۴۷ء کو بھوپال میں انتقال کیا۔ اُن کے دوستوں اور قدر دانوں میں ہندوستان کے چوٹی کے اردو ادیب اور شاعر شامل تھے۔ مولانا سُہا کا قد بہت چھوٹا تھا لیکن بونوں جیسے قد کا حامل یہ شخص ایک اعلیٰ دماغ انسان تھا۔ جوشؔ ملیح آبادی نے " یادوں کی برات " میں اپنے جن " قابلِ ذکر احباب " پر قلم اٹھایا ہے اُن میں " مولانا سُہا بھوپالی " بھی شامل ہیں۔ جوشؔ اُن کی لیاقت کا اعتراف کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

" وہ جب کسی علمی مسئلے پر باتیں کرتے تھے تو پتہ چلتا تھا کہ وہ کس قدر وسیع المطالعہ ہیں۔ وہ پرانے رنگ کے شاعر اور نئے مزاج کے نقاد تھے "

مولانا سہا کی ادبی سربلندی کا اعتراف لالہ سری رام دہلوی نے " خم خانۂ جاوید " کے حصہ چہارم مطبوعہ ۱۹۲۶ میں اِن الفاظ میں کیا ہے:

" قد و قامت نہایت مختصر مگر طبیعت ذکی اور مشتاق ہنر۔ علم مجلس میں یگانہ ہیں۔ دیوانِ غالب اردو کی شرح میں حکمت و فلسفہ کے مسائل ان کی جدت طرازی کا ثبوت ہیں "

مولانا سہا کے دوست متین سروش نے اس خیال کا اظہار کیا ہے کہ یہ شرح نظم طباطبائی کے جواب میں لکھی گئی ہے۔ شمس الرحمٰن فاروقی نے " تفہیم غالب " میں بیخود دہلوی کے ساتھ سہا مجددی کو " انتہائی قابل قدر شارح " قرار دیا ہے جبکہ مظہر امام اپنے ایک مقالے " یکے از

شارحین غالب۔ مولانا سہا" (مطبوعہ مجموعہ مضامین ایک لہر آتی ہوئی") میں مطالب الغالب کے لیے لکھتے ہیں:

"مولانا سہا مجددی کی مطالب الغالب' غالب کی معدودے چند ابتدائی شرحوں میں سے ہے۔ یہ امر بذاتِ خود اس شرح کے لیے وجہ امتیاز ہے۔ لیکن اس سے قطع نظر بھی سہا نے اکثر اشعار کی افہام وتفہیم میں نہ صرف وقتِ نظر سے کام لیا ہے بلکہ اپنی نکتہ سنجی کا ثبوت بھی دیا ہے"

مولانا سہا کے ہم وطن اختر سعید خاں کو اس شرح میں سہا کے "ذہن کی دراکی" غالب کے اشعار کے کچھ ایسے' مطالب بیان کرتی اور کچھ ایسے معانی تلاش کرتی نظر آتی ہے جن معانی اور مطالب تک غالب کے شارحین کی نگاہ نہیں پہنچی تھی"

مدھیہ پردیش اردو اکادمی کو یہ فخر بھی حاصل ہے کہ اس نے سہا کی شاعری کی متاع گم شدہ کو حاصل کر کے "لمعاتِ سہا" (۱۹۸۵) کے نام سے شائع کیا اور جس کا دیباچہ جوش ملیح آبادی سے لکھوایا۔ جوش صاحب نے اپنے اس دیباچہ میں سہا کو "قصر ادب کا مینارۂ بلند" قرار دیا ہے۔

"مطالب الغالب" بھوپال میں غالب شناسی کے سلسلے کی ایک اہم کڑی ہے۔ یہ اُتنی ہی اہم ہے جتنی کہ ڈاکٹر عبدالرحمٰن بجنوری کی وہ تحریر تھی جو نسخۂ حمیدیہ میں شامل ہے اور" محاسن کلام غالب" کے نام سے کتابی صورت میں شائع ہوئی تو یہ جملہ غالبیات کی شاہ سُرخی بن گیا۔

" ہندوستان کی الہامی کتابیں دو ہیں۔ مقدس وید اور دیوانِ غالب"

بھوپال اپنی اس خوبی قسمت پر ناز کرسکتا ہے کہ اُس نے غالبیات کے سلسلے کے بعض ایسے تحفے نذر کیے ہیں جو صرف وہی دے سکتا تھا۔ ۱۹۱۸ء میں یہاں تقریباً ایک صدی پہلے کا لکھا ہوا غالب کے دیوان کا قلمی نسخہ ملا۔ ابھی غالب کے اس دیوان کو ملے ہوئے مشکل سے ۷۰ سال ہوئے ہوں گے کہ غالب صدی کے زمانے میں اسی بھوپال میں غالب کا ایک اور دیوان بخط غالب دریافت ہوا۔ پھر غالب کے دو غیر مطبوعہ اردو خطوط بنام

مولانا عباس رفعت اور ایک فارسی خط دریافت ہوا۔ آج مدھیہ پردیش اردو اکادمی غالب کی دوسری صدی کے موقع پر "مطالب الغالب" کا عکسی ایڈیشن شائع کر کے اپنی قدیم ادبی وراثت پر نازاں بھوپال کی طرف سے اِس صدی کے حضور میں ایک اور بے نظیر تحفہ پیش کرنے کی سعادت حاصل کر رہی ہے۔ ایک ایسے شاعر کی ابتدائی شرحوں میں سے ایک شرح جس نے بقول سہا مجددی :

" تمام دنیا میں کم از کم اپنی صدی کی آبنائوں کو افسردہ کر دیا تھا "

آفاق احمد

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

مقدمہ

دلائل کی ضرورت نہیں۔ مشاہیر کے اقوال نقل کر کے پڑھنے والوں کو مرعوب کرنا عبث ہے۔ کلام فی نفسہٖ ایک قوی الاثر حقیقت ہے۔ جو طبائع کو متاثر کرتی ہے۔

ایک ادیب کی ساری عمر اسی غور و فکر میں گذر جاتی ہے۔ کہ اثرِ کلام کیا چیز ہے؟ وہ اس اثر کی ماہیت معلوم نہیں کر سکتا۔ البتہ کلام ہی کو مختلف ناموں، سحر، اعجاز وغیرہ سے پکار اٹھتا ہے۔ لیکن یہ سب محض الفاظ ہوتے ہیں۔ اُن نقوش تاثر کو کوئی کس طرح دکھا سکتا ہے، جو دِل اور صرف دل پر ثبت ہوتے ہیں۔

ایک شاعر، ایک خاص تڑپ اور مخصوص ہیجان میں ایک شعر کہتا ہے۔ جو سُننے والے کو بھی بے چین کر دیتا ہے۔ لیکن شاعر اور سامع اس کیفیتِ اثر کو تمثیلاً یا تشبیہاً الفاظ میں، ادا نہیں کر سکتے۔

ایک شوخ و شاداب پھول دیکھ کر جس طرح نگاہوں کے ذریعہ سے ایک مسرت آمیز احساس پیدا ہوتا ہے۔ ٹھیک اُسی طرح، اچھے کلام کے اثرات، قوت سامعہ دل میں اُتار دیتی ہے!

لذّت، کا نشاط محسوس ہوتا ہے۔ مگر متعین نہیں، الم کی کلفت تکلیف

دیتی ہے۔ مگر غیر مفہوم رہتی ہے۔ یہ حالت عام ہے۔ پھر بھلا کلام و شعر کے اثر کی ماہیت کون سمجھ سکتا اور کون سمجھا سکتا ہے؟ روح کا معمہ ہی کب حل ہوا ہے۔ کہ امیالِ روحانی کی گرہ کشائی کی جائے!

کسی شعر کی ساری لفظی و معنوی خوبیاں بیان کر دو۔ اور غور کرو کہ اس بیان میں اُن خوبیوں کا پورا احساس بھی ادا ہوا یا نہیں، وہ احساس جو اندرونی طور پر محسوس کیا گیا تھا۔

مصوری و نقاشی دیکھی اور نقل کی جا سکتی ہے۔ مگر شاعری باوجود سمجھنے کے سمجھائی نہیں جا سکتی۔ الفاظ اور معنی کے تعینات نے چونکہ اس کو شجرۂ ادب میں شامل کر دیا ہے۔ اس لئے فصاحت و بلاغت کا سوال پیشِ نظر رہتا ہے۔ مگر حقیقت یہ ہے۔ کہ فصاحت و بلاغت خود شاعری کی پیدا کردہ خصوصیتیں ہیں۔ وہ اِن سب سے اعلیٰ اور بے نیاز ہے!!

شاعر کو محض ادیب سمجھنا بڑا ہی ظلم ہے۔ ادیب تو ہر نثر نگار ہو سکتا ہے۔ اس کی اصلی حیثیت کو صرف وہ لوگ سمجھ سکتے ہیں۔ جو نفسِ شاعری کی منزلتِ رفیع کو سمجھ چکے ہیں۔ یا ایک حد تک وہ لوگ سمجھ سکتے ہیں۔ جو علوم و معارف کو باعتبارِ غایات تقسیم کر کے اُن میں مدارج شرف کی کوئی حدِ فاصل قائم کرنے کی اہلیت رکھتے ہیں۔

ہر ذی شعور کے نزدیک اجمالاً تمام علوم و فنون پر شرف و فضیلت

کا اطلاق ہو سکتا ہے۔ لیکن اُسی طرح یہ بھی تسلیم کرنا پڑے گا۔ کہ بعض علوم کو بعض علوم اور بعض فنون کو بعض فنون پر تفوقِ شرف حاصل ہے۔ اِس کلیہ کو پیشِ نظر رکھ کر جو صاحبِ بصیرت، مراتبِ علوم کی تقسیم کرے گا۔ اُس کو شاعر کے منصبِ فضل کا رُتبہ بھی معلوم ہو جائے گا۔ یہ تو ظاہر ہے، کہ یہ مدارج شرف، علوم کے غایات و مقاصد کے اعتبار سے تسلیم کئے جائیں گے۔ جو علم انسان کے مطالب حیات سے زیادہ معمور ہو گا۔ وہ اُن علوم سے زیادہ اشرف ہو گا۔ جن میں ایسی صلاحیتیں کم ہوں گی۔

قطع نظر اُن رجحانات و امیال، اُن معتقدات اور تصورات کے جن کا علاقہ انسان کی محض حیات روحانی سے ہے۔ اگر تعصب سے کام نہ لیا جائے۔ تو شاعری ہماری ساری حیات مدنی پر بھی چھائی ہوئی نظر آجائے گی۔ اُس حیات مدنی پہ جس کے مظاہر و شہود کو مادی نقطۂ نظر سے بلکش تسلیم کیا جاتا ہے۔ حالانکہ اس مدنی حیات میں عالم روحانی نامعلوم طور پر اپنا قدرتی کام اُسی طرح انجام دے رہا ہے۔ جس طرح اس کو حقیقت میں انجام دینا چاہیئے۔

کیا دُنیا کا تمدن محض کیمیا اور برقیات کی قدر پر اکتفا کریگا۔ کیونکہ زندگی کی ضروریات کا علاقہ اِن علوم سے زیادہ وابستہ ہو گیا ہے؟ اور کیا وہ کمال کی کمالِ محض اور علم کی علم محض ہونے کی حیثیت سے کوئی کفالت نہیں کر سکتا؟ نہیں بلکہ یوں کہو کہ مدنیت ایک ہمہ گیر حقیقت اور جامعِ کمالات کا احاطہ کرنا چاہتی ہے۔ اُن مضامین کے علاوہ جو آج تک شاعری

کے حدود میں داخل ہو سکے ہیں۔ اور جن میں وجدانیات اور روحانی ذہنیات کا عنصر غالب ہے۔ اگر صرف اس بات کا لحاظ رکھا جائے۔ کہ معمولی سی معمولی بات دائرہ شعر میں پہنچ کر محض شاعری کے اسلوب خاص اور طرزِ اظہار کی وجہ سے کسقدر قوی الاثر ہو جاتی ہے۔ اور یہی ایک خصوصیت ارتقاے زبان کے لئے جو مدنیت کے اصول بنیادی میں سے ہے۔ کسقدر مفید ہے۔ تو ماننا پڑے گا۔ کہ شاعری مدنیت کا نہایت اہم عنصر ہے!

یہ اور اسی قسم کی مختلف اہمیتیں گنائی جاسکتی ہیں۔ جن کا تعلق شاعری کے محض بیرونی سطحی اور ظواہرِ امور سے ہے۔ لیکن اگر نگاہوں کو وسعت دی جائے۔ اور مادی کثافتوں پر ٹھیرا نہ دی جائیں۔ بلکہ حجابات کو شفاف کرتی ہوئی عالم روحانی تک پہنچائی جائیں۔ پھر تو شاعری کا فضل و شرف آفتاب کی طرح ہر دیکھنے والے کو نظر آسکتا ہے!

شعراء نے مذہب و اخلاق اور فلسفہ کے بڑے بڑے مسائل کو فروغ دیا ہے۔ لیکن اُن کا سب سے بڑا کمال اُس وقت ظاہر ہوتا ہے، جب جذبات کی تصویریں کھینچنے اور کیفیات و محسوسات کی ترجمانی کرنے میں کافی قدرت ظاہر کرتے ہیں۔ اُس وقت محض اُن کی لفظی ترکیبیں منطقی مسلمات اور استدلال پر حکومت کرتی ہیں۔ اور اُنکی تخئیل فلسفہ کے منتہائے نظر پر ایک ٹھوکر لگا کر غیر معلوم الرفعیت فضا کی طرف پرواز کرنی شروع کر دیتی ہے۔

منطق ایک خاص قسم کی عقلیت ہے۔ جو عقل ہی پر غلبہ حاصل کرنا چاہتی ہے۔ اور وجدان ایک قدرتی واقعیت ہے۔ جو وہم و صنعت کے فریبوں کو مٹاتا ہے منطق عقل کے لئے ذلت ہے۔ اور وجدان عقل کے لئے مجلّی۔

فلسفہ اشیاء کی حقیقت کا متجسس ہے۔ اور وجدان حقائق پر محیط ہے۔ پھر فلسفہ جس کی تلاش میں گم ہے وہ وجدانی دنیا ہے۔ اور وجدانی دُنیا کا ہی دوسرا نام شاعری ہے۔ اس لئے شاعر جو اپنے فکر کی قوت احساس کی ذکاوت اور خیال کی رفعت کے باعث وجدانیات ہی کی ترجمانی کرتا رہتا ہے۔ ہر منطقی اور ہر فلسفی سے افضل و اشرف ہے!

ایک فلسفی کی نگاہ کے سامنے جب کوئی چیز آتی ہے۔ تو وہ بالکل اجنبی اور جاہل ہوتا ہے۔ اور ایک شاعر کے سامنے جب کوئی چیز آتی ہے۔ تو وہ معلوم شدہ اور بے نقاب آتی ہے۔ فلسفی ڈھونڈتا رہتا ہے۔ اور شاعر پہچانتا رہتا ہے! وہ منتشر حقیقتوں میں ربط دے کر ایک حقیقت الحقائق مان لیتا ہے۔ اور یہ حقیقت الحقائق کے اُس آفتاب کو اپنے پہلو میں دیکھتا ہے۔ جس کی شعاعوں کو حقائق عالم سے تعبیر کیا جانا چاہیئے! اس کا منتہائے نظر ایک نقطۂ تاریک و مجہول ہے۔ اور اس کا مطمح نگاہ یکسر نور!!

ہر علم کا موضوع ہوتا ہے۔ شاعری کا موضوع استقصاءِ حسن و عشق ہے۔ حسن موجودات کے ایک ایک ذرہ سے جھانک کر صاعقہ افگنی کر رہا ہے۔ اور عشق کی خانماں سوزی کے شعلے فضا میں بھڑک رہے ہیں۔ یہ شاعری کے مسلمات ہیں۔ جیسے ہر علم کے بعض مسلمات ہوا کرتے ہیں۔ شاعری فضا میں پھیلی ہوئی ہے۔ ہوا کے جھونکے اُس کے تعطر سے لبریز ہیں۔ بادلوں سے برستی اور سبزہ کے ساتھ روئیدہ ہوتی ہے۔ وہ حُسن سے اٹھکھیلیاں کرتی اور محبت بھرے دلوں سے کھیلتی ہے۔ ساری دُنیا اُس کا نشیمن ہے۔ اور شعراء کی قوتِ فکر اُس کا مرکب! "موسیقی" اور "ادب" اُس کے ملبوس ہیں۔ اور وہ اکثر انہیں نقابوں میں جلوہ نما ہو جایا کرتی ہے! وہ جس کو چاہے ہومر بنا دے۔ اور جس کو چاہے شیکسپیئر امراء القیس ہو یا ابونواس، کالی داس ہو یا حافظؔ شیراز، جس پر اُس کا پرتوِ نور پڑ گیا۔ سحر بیانی کا خداوند ہو گیا۔ وہ تقسیم اقوام والسنہ اور جغرافیہ سے بے پروا ہے۔ ہندوستان میں بھی عرفی و نظیری کے بعد اُس نے میر تقی میر سے گزر کر مرزا اسد اللہ خاں غالبؔ کو اپنے ظہور کے لئے چُنا۔ اور اُردو کو نوازا۔

پھر غالبؔ نے بھی اس کی ایسی صحیح اور پُر جوش ترجمانی کی، کہ تمام دُنیا میں کم از کم اپنی صدی کی دوسری آوازوں کو افسردہ کر دیا۔ گو ساری دُنیا کو موقع نہ ملا ہو۔ کہ غالبؔ کی آواز سُنتے یہ دُنیا کا قصور ہے۔ غالبؔ کا نہیں اُس کے خیالات تو کرۂ ارض کے تمام دفاتر

ادب کے لئے سرمایۂ نازش ہو سکتے ہیں۔

مرزا اسد اللہ خاں غالبؔ، وہی غالبؔ جس نے اب سے تقریباً ایک صدی پیشتر اُردو شاعری میں اپنی ندرتِ تخیل و مضامین، اپنی جدت اسلوب و ادا، اپنی نزہت تشبیہات و استعارات، اور شوکتِ تراکیب و الفاظ سے، ایک ایسا باب کھول دیا جس میں گویا ایک نئی دُنیا نظر آنے لگی۔ یہ ارتقاء شعر کی ایسی کڑی تھی، جو اس وقت تک آخری سمجھی جارہی ہے۔

ایسے کلام کی اشاعت کا قدرتی نتیجہ اس طرح ظاہر ہُوا۔ کہ اہلِ نقد نے، تنقیدی نگاہیں ڈالیں۔ سطح آشنا آنکھیں مطالب کی گہرائیوں تک کام نہ کرسکیں۔ اُنھوں نے جدت کو، مجہول، مضمون آفرینی کو، کوہ کندن و کاہ برآوردن تراکیب بلیغ کو، گورکھ دھندا، شوکت الفاظ کو اغلاق کہہ کر پکارا، لیکن امتداد مجلئی اذہان ہے۔ چنانچہ ایک مدت کے بعد ایک بڑا طبقہ ایسا پیدا ہوگیا۔ جس نے تعمق نکر سے کام لیا۔ اور دُنیائے اُردو اس کلام کی تحسین و داد کے آوازوں سے معمور ہوگئی۔ اور آج اس تحسین میں کافی بلند آہنگی پیدا ہوچکی ہے۔ اور خیال ہے کہ اُردو کا ذوقِ شعر جس قدر بلند ہوتا جائے گا۔ غالبؔ کی شاعری کے محاسن زیادہ نمایاں اور محسوس ہوتے جائیں گے۔ اس وقت بھی عام طور پر اس کو غیر معمولی

شاعر سمجھا جاتا ہے۔ لیکن اس خصوصیت کا عام سبب محض اعتراف کمال ہی نہیں ہے، بلکہ اس میں بیشتر حصہ صرف اس اعتراف کا ہے۔ کہ وہ بہت مشکل نگار تھا۔ اور چونکہ خصوصیت کا یہ اعتبار اعترافِ کمال کے ساتھ خلط سا ہوگیا ہے۔ اس لئے یہ کہنا پڑتا ہے، کہ اُس کی فوقیت محض کو عام طور پر تسلیم کئے جانے کے لئے ابھی کچھ اور وقت درکار ہے۔

اسی مشکل نگاری کے یقین کا نتیجہ یہ ہُوا۔ کہ لوگوں نے اُس کے کلام کی شرحیں تالیف کیں، اور اکثر یہ بھی دیکھنے میں آیا ہے کہ اس کے ہر شعر پر، خواہ وہ اشکال لفظی اور عقود معنوی سے پاک ہی کیوں نہ ہو، تاویلی نظریں ڈالی جاتی ہیں۔ اور طرح طرح کی معنی آفرینیاں کی جاتی ہیں۔ لیکن اگر غور سے دیکھا جائے۔ تو غالب کے سارے مروّجہ دیوان میں مشکل سے پندرہ بیس ہی شعر ایسے ملیں گے۔ جن کو مشکل کہا جا سکتا ہے۔ اور اُس کے دیوان کے بیشتر حِصّہ کو طلسم اشکال قرار دے دینا بڑا ہی ظلم ہے۔

غالب کے کلام کو مشکل قرار دِیئے جانے کا ذمہ دار غالب کا کلام نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ اُس میں مشکل کو دخل ہی نہیں ہے۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ غالب کے دَور کی عام اُردو اُس اعتلائے خیال اس رفعت فکر، اُس وسعت مطالب، اس کمالِ مطابقتِ تشبیہات، اُس بلاغتِ استعارات، اور اُس خاص اسلوب ادا و شیوا بیانی

سے نابلد تھی۔ جن کو پہلے پہل غالبؔ نے بکمال قدرت شاعرانہ اُردو میں روشناس کرایا۔ اور اس اجنبیت سے اگر "مشکل نگاری" کی غلط فہمی ابتدا ہی میں پیدا نہ ہوئی ہوتی، تو اب سے بہت پہلے وہ اعتراف صحیح پیدا ہو چکا تھا۔ جس کا ابھی اور چند سال انتظار کرنا چاہئے، اور یہ وہی اعتراف عام ہوگا۔ جو غالبؔ کو بلا استثنا تمام شعراء اُردو سے فایق تسلیم کرا دے گا!

بعض لوگ کہتے ہیں کہ غالب کو اُردو زبان پر قدرت نہ تھی، حالانکہ اُردوئے مُعلّیٰ اُس کا مجموعۂ مکاتیب اور خود دیوان کا سہلِ ممتنع غزلوں کا ذخیرہ، قدرت زبان کا ایک ایسا ثبوت ہے۔ جسکے دیکھنے کے بعد اس قسم کا کوئی شبہ بھی رکھنا، محض ضد و جہالت ہوگا۔ وہ زبان جو غالبؔ نہایت فصیحانہ قوت سے اپنے خطوط اور بعض غزلوں میں استعمال کر گیا ہے۔ نہ تو مولوی محمد حسین آزاد کو نصیب ہوئی، نہ مولوی حاؔلی کو اور نہ سر سید مرحوم کو۔ جن کو آج کل کے لوگ ائمہ زبان کی طرح مانتے ہیں۔

کوئی شاعر شاعرانہ مضامین کو اُس وقت تک ادا کرنے کا اہل نہیں ہو سکتا۔ جب تک کہ وہ محیطِ اعظم عشق میں ڈوب کر شعر نہ کہے۔ جس طرح ایک ممثل کسی تمثیل کو اچھی طرح ادا کرنے میں کامیاب نہیں ہو سکتا۔ تاوقتیکہ وہ اُن احوال تمثیل کو اپنے اوپر طاری نہ کرے! اس

کے یہ معنے نہیں کہ ہر شاعر کو قیس عامری بھی ہونا چاہیئے۔ بلکہ اُس کے حواس و مدرکات میں ایسی فطری جودت ہونی ضروری ہے کہ وہ مقاماتِ عشق سے اگر خود نہ بھی نہ گزر رہا ہو۔ تاہم وہ اپنی غیر معمولی انفعالیت سے اُنہیں مقامات کے تاثرات سے متکیف و لذّت اندوز ہو سکتا ہو۔ جس طرح پرتو حسن سے کائنات کا ایک ایک ذرّہ معمور ہے۔ اُسی طرح تاثراتِ عشق سے ایک ایک جزء لایتجزّٰے لبریز ہے۔ اختلاف طبائع و تعدد اشیاء کی وجہ سے اگرچہ عشق کے عام احوال و آثار متعین نہیں ہیں۔ مگر انسانی امیال کی چند جزئیات کا خارجی احساس ضرور معلوم و متعین سا ہے۔ اِس لئے کم از کم اُن محسوسات تک شاعر کی رسائی اس کے شاعری کے فروغ کے لئے نہایت لازمی امر ہے۔ اور یہی وہ خصوصیت ہے۔ جس کی موجودگی ہمیں مجبور کرتی ہے۔ کہ ایسے شاعر کو فطری شاعر کا لقب دیں۔

بعض لوگ شعر کی خوبی کا تعین ارسطو اور ابن رشیق کے اقوال سے کرتے ہیں، اور بعض ملٹن اور کارلائل کے جملے دُہراتے ہیں۔ لیکن حقیقت آدیہ ہے۔ کہ شعر کی خوبی نہ کسی مجہول الکیف محاکات میں مضمر ہے نہ غیر مفہوم سادگی میں ہے۔ اور نہ نامعلوم جوش میں پنہاں ہے۔ بلکہ وہ جوہر اور لب لباب ہے۔ اُن تمام لطائف کا جن کو ابتدائے عالم سے لے کر آج تک کی نسلِ انسانی کے

ارتقائے مادی وروحانی نے معلوم وحاصل کیا ہے۔

اسی لئے ایک کامل شاعر جن جن مطالب کو ادا کرتا ہے۔ وہ یکسر لطافت ہوتے ہیں۔ اور اسی وجہ سے سامع کے لئے مؤثر ثابت ہُوا کرتے ہیں۔ چنانچہ شاعر بھی ہمہ گیر حسن وعشق سے متکیف ہوکر ہمہ دان اور ہمہ بیان ہوجاتا ہے۔ اور وہ محاکات تغنی ادب فلسفہ مصوری وغیرہ تمام خزائن لطافت کا مالک ہو جاتا ہے۔ پھر اہل نظر انہیں لطائف میں شاعر کا کمال دیکھتے اور انہیں مطالب کی قوتِ اظہار میں اُس کا معیار فضل ڈھونڈتے ہیں۔

غرضکہ دُنیا میں اس وقت تک جغرافیائی نسبتوں سے جس قدر ذخائر شعر موجود ہیں۔ اُن اشعار میں انسانی ذہنیات مرتقیہ کا نمایاں یا غیر نمایاں جوہر ضرور پایا جاتا ہے۔ اور ہر زبان وملک کی شاعری میں مختلف علومِ عالیہ اور فنونِ لطیفہ کے عنصر، خود در طریقہ پر ترکیب پائے ہوئے ملتے ہیں۔ وجدانیات وجذبات کی شاعری سارے جہان میں اپنا ایک ہی جزو مشترک رکھتی ہے۔ یعنی "عشق اور تحسین" لیکن اُن کے مراتب ومدارج میں فرق واختلاف سا معلوم ہوتا ہے تاہم یہ فرق واختلاف اس قدر اہم نہیں ہے۔ کہ اُس کی بنا پر اہم خاص خاص حدود قائم کر کے کوئی معیار بنائیں۔ جس سے اندازہ ہو سکے۔ کہ کس ملک کے کس شاعر کو امتیاز وتفوق حاصل ہے۔ لیکن

شاعری میں وہ خیالات و محسوسات جو علوم و فنون کی وساطت سے خارجی طور پر شریک ہو گئے ہیں۔ صرف وہی ایسے اجزاء ہیں، جنکے ذریعہ سے ہم کسی ملک یا کسی شاعر کی شاعری میں حد و امتیاز بنا لیتے ہیں۔ کیونکہ وجدانیات ترتیب و تنظیم سے ارفع و اعلےٰ حقایق ہیں۔ درآں حالیکہ علوم و فنون کی بُنیاد ہی ترتیب و تنظیم پر ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جب ہم کسی اُردو کے شاعر کی شاعرانہ کاوشوں کو سمجھنا چاہتے ہیں۔ تو ضروری ہو جاتا ہے۔ کہ اُس کے تمام ماحول اور ماحول کے تمام ماخذ کو پیشِ نظر کر لیں۔

چنانچہ ہندوستان اور ہندوستان کے اُردو زبان کے شاعر کو سمجھنے کے لئے ناگزیر ہے۔ کہ سارے ایشیا کے اذواق و محسوسات پر نظر رہے۔

اس اعتبار سے کہ اُردو زبان کا مولد و مسکن ہندوستان ہے۔ اس میں ہندوستان کے تمام لطائفِ علوم و فنون کا ہونا مسلم ہے۔ اور چونکہ اُردو زبان نے عربی اور فارسی کے حاملوں کی آغوش میں پرورش و تربیت حاصل کی ہے۔ اس لئے اُس میں عربی و فارسی کمالات کا عنصر ہونا یقینی امر ہے۔

عربی شاعری سے جو جذبات اُردو شاعری میں زیادہ تر منتقل ہو سکتے تھے، اُن کا علاقہ علمائے اخلاق کی تقسیم "احوالِ نفس" کے اعتبار سے انسان کی قوت غضبیہ سے ہے۔ یعنی بہادری و شجاعت انتقام

وآزادی، حرب وایثار وغیرہ مخصوص جذبات ہیں۔ جن کو عربی شاعری کا نمایاں عنصرِ ناز سمجھا جاسکتا ہے۔ لیکن عربی سے زیادہ اُردو شاعری فارسی شاعری کی زیر بارِ منت ہے۔ جس نے مضامین بوقلموں کا ماخذ پیش کردیا۔ اور اس طرح شعرائے اُردو کو طبعی و جغرافیائی مناظر فطرت، عشق و محبت، فلسفہ و تصوف اور اخلاقی مضامین کی ایک گلستان زار شاہ راہ میسر آگئی اور اسی سے اُنھوں نے گذرنا شروع کیا۔

عرب کی شاعری کے معترفین شاید اس ترجیح کو گوارا نہ فرمائیں لیکن اس میں شک ہی کیا ہے کہ عربی کی ساری علمی و فنی ترقیاں ظہورِ اسلام کے بعد کی ہیں۔ اور ان ترقیوں کے حاملین بیشتر بلکہ کلیتًا کہا جائے تو بیجا نہ ہوگا۔ کہ عجمی تھے۔ جن کے اذہان اُنہیں کے متمدن ملک کے تربیت یافتہ تھے۔

فطرت کے خالص جذبات و امیال سارے جہان میں یکساں ہیں لیکن اذہان مرتقیہ میں جو لطائف و دقائق البطور اضافاتِ جذبات کے پیدا ہوتے ہیں۔ اُن کا جولان گاہ کوئی نیم مہذب یا کم ترقی کردہ ذہن نہیں بن سکتا۔ اور یہ تفوق ایران کو نہ صرف عرب ہی پر حاصل ہے۔ بلکہ سارے ایشیا پر بلا کسی استثناء کے حاصل ہے۔

سنسکرت جس کی قدامت کو اپنی تہذیب و ترقی پر آج بھی بڑا ناز ہے۔ فارسی کے مقابل نہیں آسکتی۔ کیونکہ اُس کا بعد زمانی ہی اس بات کی دلیل ہے۔ کہ فارسی کو قرون ترقی سے قرب و اتصال میں تفوق

ہے۔ رہا اسالیبِ بیان قوت و شوکت الفاظ تشبیہات و استعارات وغیرہ کا مسئلہ تو اس کا تعلق تنقید ادبیات کے ضمن میں علم الالسنہ سے پایا جاتا ہے۔ نفس شاعری اور مضامین شعر سے اس کو کوئی تعلق نہیں۔ غرضیکہ اردو شاعری میں عربی فارسی اور اپنے وطنی مآخذ سے منتقل ہو کر جو مضامین شامل ہوئے۔ وہ عشق و محبت تحسین، فلسفہ و تصوف، اخلاق و مناظر نگاری وغیرہ کہے جا سکتے ہیں۔ اور ان مضامین کے ذیل میں اور بہت سے جزئیات ہیں۔ جن کا استقصاء طوالت سے خالی نہیں۔

انہیں مضامین کے اعتبار سے ہم اردو کے ہر شاعر کی شاعری پر نظر ڈال سکتے ہیں۔ اور اس کا معیار شاعری معلوم و متعین کر سکتے ہیں۔

غالب کے یہاں یہ تمام مضامین اپنی تمام جزئیات کے ساتھ موجود ہیں۔ جن کی چند مثالیں پیش کی جائیں گی۔

غالبؔ سے پہلے میرؔ سوداؔ اور خواجہ میر دردؔ اردو شاعری کے تین نامور اساتذہ گذرے ہیں۔ لیکن غالب کا مرتبہ باعتبار جامعیتِ مضامین کے ان تینوں سے بلند تر ہے۔

میرؔ کے یہاں مضامین اور مضامین کی رفعت محدود ہے۔ ان کی شاعری کی خصوصیت امتیازی سادگیٔ الفاظ اور عام درد آمیز اندازِ بیان

میں جلوہ گر ہوتی ہے اور بس۔

سودا کے یہاں بجز قدرت سخن طرازی کے کوئی خاص بات نہیں۔ رہے خواجہ میر درد تو اُن کے اسلوب ادا میں (خفیف سی شوخی (جو میر کے یہاں مفقود ہے) کے ساتھ متصوفانہ خیالات کا اظہار بھی پایا جاتا ہے۔

اب معاصرینِ غالب پر نظر ڈالو، تو اُن میں صرف مومن اور ذوق قابلِ ذکر ہیں۔ جن میں سے مومن کی خصوصیت شعر محض رنگین نوائی ہے۔ اور ذوق کی خصوصیت محض محاورہ نگاری۔ یہ تمام خصوصیتیں جب غالب کے مضامین عالیہ کے سامنے آتی ہیں، تو خصوصیتیں نہیں رہتیں!

غالب کے بعد اُردو شاعری کے حقیقی رنگ کا عہد عروج داغ اور امیر پر ختم ہو جاتا ہے۔ اور اِن دونوں کے امتیازات شعر صرف یہ ہیں۔ کہ امیر کا کلام کوئی عیب نہیں رکھتا، اور داغ صاف گو اور بلے محاورہ نگار ہیں۔ گویا غالب کو اس آخری عہد تک، بمدارج بلندی حاصل ہے۔ اور وہ میر سے لے کر داغ و امیر تک کی تاریخ شعر میں ایک نمایاں تر حیثیت پر متمکن ہے۔

داغ و امیر کا دور ابھی ختم نہ ہوا تھا۔ کہ مغربی خیالات کی رَو نے متاشرین تحبا۔ بہ کو مجبور کر دیا۔ کہ تمام قدیم موضوعات کی طرح، شاعری کے نظریات کی بھی از سرِ نو ترتیب و تنظیم کی جائے اور اس تحریک نے میر و سودا، غالب و مومن۔ داغ و امیر کا جھگڑا ہی مٹا دیا۔ اور مشرقی و مغربی تنازع کا شگوفہ چھوڑ کر، مغربیت سے بیخودانہ گرویدگی پیدا کر لی۔ اور اُردو شاعری کے تبادلئ عنوان سے لطف اندوز ہونے پر مصر ہو گئے۔

یہاں تک تو ہم کو بھی اعتراف ہے۔ کہ اس عہدِ انقلاب ذوق نے ادبیات اُردو میں ایک ضروری اور قابل قدر صنف کلام کا اضافہ کر دیا۔ لیکن جو لوگ محض اسی ایک صنفِ سخن کو پورا جہان شاعری مانتے ہیں۔ ہم کو اُن کے خیال سے مطلق اتفاق نہیں۔ منظوماتِ ملی، وطنی، یا سیاسی وغیرہ میں ہی شاعری کو محدود سمجھ لینا کوتاہ نظری اور تنگ خیالی ہے۔ انقلاب ذوق کی نصف صدی نے آج تک صرف دو سنجیدہ قومی شاعر پیدا کئے ہیں۔ حالی اور اقبال اگر شاعری کا مرتبہ نثر سے بلند تر اور زیادہ موثر ہوتا ہے۔ تو حالی اور اقبال کی شاعری کے اصلاحی اثرات نہایت نمایاں ہونے چاہئیں۔ لیکن کیا ایک صاحبِ نظر بھی، اِن کے اشعار کے اثرات کو ابوالکلام آزاد کے افسوں تحریر و تقریر پر ترجیح دے سکتا ہے۔

حالی کے مسدس نے کبھی رُلایا ضرور ہے۔ اقبال کے اشعار نے

ہنگامہ سماع، لذت کش جوش ضرور کیا ہے۔ لیکن ابوالکلام کی انشاء نے تو جماعتوں کے متعقدات سیاسی و مذہبی میں تزلزل پیدا کرکے یک قلم بدل دیا۔ اور رنگ دیا۔ پھر کہاں ہے وہ خصوصیت جو شعر کو ہر نثر سے برتر رکھتی ہے؟ نتیجہ یہی نکلتا ہے۔ کہ "دریا نہیں کار ہنر ساقی۔" یعنی شعر کی اصناف میں، قومی، وطنی، اور سیاسی منظومات کو دخل کرنا تو ناگزیر ہے۔ مگر شاعری کو اسی حد تک برقرار جاننا غلط ہے۔

رابندر ناتھ ٹیگور آج مشرق و مغرب کا مسلمہ شاعر مانا جاتا ہے کیا اُس کی شاعری قومیت اور سیاست کی تبلیغ سے متعلق ہے؟ بظاہر تو یہ معلوم ہوتا ہے۔ کہ اگر اُس کی شاعری میں سے ایک جذبۂ شوق تعبد حذف کر دیا جائے۔ تو مجذوب کی بڑ کے سوا کوئی دوسری تعریف اُس پر صادق نہیں آسکتی۔ لیکن وہی ایک جذبۂ شوق ہے۔ جس نے باوجود انتشار و بے ربطی کے سامعین کی توجہات کو مسحور کر دیا ہے۔ اور یہ شاعری کا ایک ادنےٰ کرشمہ ہے۔

غرضکہ شاعری میں معیار قائم کرنے کے لئے معمولی معمولی جزئیات اور ہنگامی ضروریات پر اصرار کرنا بے محل ہے۔ شاعری تو وجدانیات اور لطائف علوم و فنون سے تعبیر ہے۔ اور شاعر اپنے اذواق و لطائف

علوم کو، علوم متعارفہ کی طرح دنیا کے سامنے پیش کرتا رہتا ہے۔ چنانچہ لطائف علوم و فنون کی صورت میں ہم سطور بالا میں اُن مضامین کا مختصراً حوالہ دے چکے ہیں۔ جو اُردو شاعری میں فارسی وغیرہ سے منتقل ہو کر آئے ہیں۔ اور معرض بیان میں آتے رہتے ہیں۔ لہذا اب دیکھنا چاہئے۔ کہ غالب اِن مطالب کو کس طرح ادا کرتا ہے۔

مخلوق اپنے خالق کے اور مصنوع اپنے صانع کے وجود و صنعت کی دلیل ہوتی ہے۔ غالب اپنے دیوان کی ابتدا اسی مضمون سے کرتا ہے اور کہتا ہے۔ ؎

نقش فریادی ہے کس کی شوخیٔ تحریر کا
کاغذی ہے پیرہن ہر پیکر تصویر کا

اسی خیال میں مشاہدۂ مظاہر سے ایک استعجابی کیفیت پیدا ہوتی ہے۔ اور جستجو میں اضطراب پیدا ہو جاتا ہے۔ ؎

جب کہ تجھ بن کوئی نہیں موجود — پھر یہ ہنگامہ اے خدا کیا ہے
یہ پری چہرہ لوگ کیسے ہیں — غمزہ و عشوہ و ادا کیا ہے
شکنِ زلفِ عنبریں کیوں ہے — نگہِ چشمِ سرمہ سا کیا ہے
سبزہ و گل کہاں سے آئے ہیں — ابر کیا چیز ہے ہوا کیا ہے

اگرچہ احوال و منازل سلوک قید کلام سے آزاد ہیں۔ تاہم علم تصوف

کے مسائل چونکہ خاص خاص احوال ہی پر قیاس کر کے ترتیب دیئے گئے ہیں۔ اس لئے اُن میں مطابقت احوال کا کافی عنصر موجود ہے متصوفین کا معرکتہ الآراء مسئلہ "توحیدِ وجودی" ہے۔ نقاش، ذرّہ ذرّہ میں تناسب ڈھونڈھتا ہے۔ شاعر ہر چیز میں حسن دیکھنا چاہتا ہے۔ وحدت الوجود کا اعتقاد اُس کی یہ تشنگی بجھا دیتا ہے۔ اور مجاز و حقیقت کے دو جداگانہ حدیں اُس کی راہ میں رُکاوٹ پیدا نہیں کر سکتیں۔ اب اُس کی نگاہیں زیادہ کامیاب زیادہ شاداب اور بے حجاب ہو جاتی ہیں۔ اس لئے وہ اِس مسئلہ کا معتقد ہو کر خود کو شاعرانہ سکون کی فردوس میں پاتا ہے۔ اور اپنی آرزو کے مطابق ہر افق سے ایک ہی شوخی، ہر گوشہ سے ایک ہی رعنائی ہر حجاب سے ایک ہی دلکشی کو مسکراتے اور آنکھیں لڑاتے ہوئے دیکھتا ہے۔ اور پکارتا ہے ؎

ہے تجلی تری سامانِ وجود ذرہ بے پرتوِ خورشید نہیں

نشوونما ہے اصل سے غالبؔ فروع کو خاموشی ہی سے نکلے ہے جو بات چاہیئے

ہے رنگِ لالہ و گل و نسریں جدا جدا ہر رنگ میں بہار کا اثبات چاہیئے
یعنی بحسب گردشِ پیمانۂ صفات عارف ہمیشہ مستِ مئے ذات چاہیئے

دل سے اُٹھا لطفِ جلوہ ہائے معانی　　غیرِ گل آئینۂ بہار نہیں ہے

مظاہر کائنات کو ماسوا یقین کرنا نگاہوں کی کوتاہی ہے۔ ورنہ ؎

ہے مشتمل نمودِ صور پر وجودِ بحر　　یاں کیا دھرا ہے قطرہ و موج و حباب میں

کثرت آرائی وحدت ہے پرستارئ وہم　　کر دیا کافر ان اصنامِ خیالی نے مجھے

توحید کا کمال یہ ہے کہ سوائے وحدت کے ہر وجود معدوم ہو جائے۔ کسی موحد کو اگر توحید کے ساتھ ساتھ اپنے وجود کا بھی احساس باقی ہے۔ تو اُس کے اعتقاد میں ہنوز خامی ہے :۔

ہر چند سبکدست ہوئے بت شکنی میں　　ہم ہیں تو ابھی راہ میں ہیں سنگِ گراں اور

موجودات کائنات اشکال وہمی ہیں۔ ان میں گم ہو جانا حقیقت شناسی سے بعید کر دیتا ہے :۔

جز نام نہیں صورتِ عالم مجھے منظور　　جز وہم نہیں ہستئ اشیاء مرے آگے

حجاباتِ مظاہر خود جلوے کا پتہ دیتے ہیں :۔

محرم نہیں ہے تو ہی نواہائے راز کا　　یاں ورنہ جو حجاب ہے پردہ ہے ساز کا

ایک وہ "انانیت" ہوتی ہے جو راہ میں "سنگِ گراں" ہوتی ہے۔ کیونکہ اس کی بنیاد احساسِ ماسوا، پر ہے۔ دوسری وہ "انانیت" ہے جو عینیت پر منحصر ہوتی ہے۔ اس انانیت سے غفلت، گم گشتگی ہے۔ اور مَنْ عرف نفسہ فقد عرف ربہ میں معرفت نفس سے اسی انانیت کی طرف اشارہ فرمایا گیا ہے۔ اور اسی انانیت کا غلبہ منصور سے انا الحق کہلادیتا ہے۔ تاہم اتنا ضرور سمجھ لینا چاہئے کہ:۔

اتنا ہی مجھ کو اپنی حقیقت سے بعد ہے
جتنا کہ وہم غیر سے ہوں پیچ و تاب میں

لیکن توحید میں کمالِ کمال، اخلاص سے پیدا ہوتا ہے۔ اسلئے یہی سمجھنا چاہئے کہ:۔

ہر چند ہر ایک شے میں تو ہے　　پر تجھ سی تو کوئی شے نہیں ہے

معرفتِ نفس سے معرفت رب حاصل ہونا تو مسلم تھا ہی غالب نے اسی کے ساتھ ایک صحیح جدتِ فکر سے، ایک دوسرا پہلو معرفتِ رب کا بیان کیا ہے۔ اور اس میں کوئی شک نہیں کہ فنائے نفس سے بھی وہی معرفت حاصل ہوتی ہے۔ اور غفلت بھی مبادی فنا میں سے ہے:۔

اپنی ہستی ہی سے ہو جو کچھ ہو　　آگہی گر نہیں، غفلت ہی سہی

برکلے جو عالم خارجی کا وجود داخل نفس میں دیکھتا ہے۔ وہ شاید اپنے فلسفہ کو اتنا ملخص اور مستدل بیان کرنے پر قابو نہ رکھتا ہوگا غالب اپنی حقیقت آگاہی کو اتنی قوت سے بیان کرسکتا ہے :۔

باوجودِ یکجہاں ہنگامہ پیدائی نہیں
ہیں چراغانِ شبستانِ دلِ پروانہ ہم

ایک شعر میں اپنی انانیت کے فنا کو کن الفاظ میں ادا کرتا ہے :۔

ہم وہاں ہیں جہاں سے ہم کو بھی　　کچھ ہماری خبر نہیں آتی

جس طرح توحید میں کامل اخلاص کی ضرورت ہے۔ اسی طرح عبادات میں اخلاص کا زبردست معیار ہے۔ حافظِ شیرازؒ نے ایک شعر میں اس خیال کو اس طرح ادا کیا ہے :۔

حافظ وظیفۂ تو دُعا گفتن است وبس
دربندِ ایں مباش کہ نشنید یا شنید

غالب اسی خیال کو اس طرح ادا کرتا ہے :۔

کیا زہد کو مانوں کہ نہ ہو گرچہ ریائی　　پاداشِ عمل کی طمعِ خام بہت ہے

اور

طاعت میں تا رہے نہ مے و انگبیں کی لاگ
دوزخ میں ڈال دو کوئی لے کر بہشت کو

آفتاب کی طرف کون دیکھ سکتا ہے۔ جمال کی شدت آنکھوں کے لئے حجاب ہو جاتی ہے۔ اسی طرح جلوۂ حبیب کے دیدار میں برق نظارہ سوز ہی ناکامیِ دید کا سبب بن جاتی ہے۔ یہی مضمون ہے جو اس طرح ادا ہُوا:۔

ناکامیِ نگاہ ہے برقِ نظارہ سوز
تو وہ نہیں کہ تجھ کو تماشا کرے کوئی

اور

نظارہ کیا حریف ہو اس برقِ حسن کا
جوشِ بہار جلوہ کو جس کے نقاب ہے

حیات انسانی کی ساری مسرتوں کی بنیاد آرزو پر اور آرزوؤں کا انحصار امید پر ہے۔ اور مایوسی کا ایک سانس بھی ہلاکتِ نامرادی سے کم نہیں:۔

نفس نہ انجمن آرزو سے باہر کھینچ
اگر شراب نہیں انتظارِ ساغر کھینچ

اور آدمی کا مصروفِ کوشش ہی رہنا اُس کی مصیبتوں کو کم کرتا ہے۔ خواہ وہ سرگرمیِ مساعی بے صرفہ ہی کیوں نہ ہو:-

بس ہجومِ نا امیدی خاک میں مِل جائے گی
یہ جو اِک لذّت ہماری سعیِ بے حاصل میں ہے

ہمت اور سعیِ تحصیل ہی میں دُنیا کی چہل پہل کا راز مضمر ہے:-

ہنگامۂ زبونیِ ہمت ہے انفعال
حاصل نہ کیجیے دہر سے عبرت ہی کیوں نہ ہو

اب ذرا ذیل کی غزلوں پر غور کیجیے۔ جن کا ایک ایک مطلع حوالہ کے طور پر لکھا جاتا ہے:-

ہوس کو ہے نشاطِ کار کیا کیا — نہ ہو مرنا تو جینے کا مزا کیا

عرضِ نیازِ عشق کے قابل نہیں رہا
جس دل پہ ناز تھا مجھے وہ دِل نہیں رہا

ذکر اُس پری وش کا اور پھر بیاں اپنا
ہو گیا رقیب آخر تھا جو رازداں اپنا

ہے بسکہ ہر اک اُن کے اشارہ میں نشاں اور
کرتے ہیں محبّت تو گزرتا ہے گماں اور

دل ہی تو ہے نہ سنگ و خشت درد سے بھر نہ آئے کیوں
روئیں گے ہم ہزار بار کوئی ہمیں ستائے کیوں

کسی کو دے کے دل کوئی نواسنجِ فغاں کیوں ہو
نہ ہو جب دل ہی سینہ میں تو پھر منہ میں زباں کیوں ہو

دیکھنا قسمت کہ آپ اپنے پہ رشک آجائے ہے
میں اُسے دیکھوں بھلا، کب مجھ سے دیکھا جائے ہے

سادگی پر اُس کی مرجانے کی حسرت دل میں ہے
بس نہیں چلتا کہ پھر خنجر کفِ قاتل میں ہے

حسنِ مہ گرچہ بہ ہنگامِ کمال اچھّا ہے
اس سے میرا مہِ خورشید جمال اچھّا ہے

ہر ایک بات پہ کہتے ہو تم کہ تو کیا ہے

تمہیں کہو کہ یہ اندازِ گفتگو کیا ہے

نکتہ چیں ہے غمِ دل اُس کو سنائے نہ بنے
کیا بنے بات جہاں بات بنائے نہ بنے

بازیچۂ اطفال ہے دُنیا مرے آگے
ہوتا ہے شب و روز تماشا مرے آگے

کہوں جو حال تو کہتے ہو مُدعا کہئے
تُمہیں کہو کہ جو تم یوں کہو تو کیا کہئے

ہزاروں خواہشیں ایسی کہ ہر خواہش پہ دم نکلے
بہت نکلے مرے ارمان لیکن پھر بھی کم نکلے

مُدت ہوئی ہے یار کو مہماں کئے ہوئے
جوشِ قدح سے بزم چراغاں کئے ہوئے

زہرِ غم کر چکا تھا میرا کام   تجھ سے کس نے کہا کہ ہو بدنام

تحسینِ حسن کے مضامین تشبیہوں، اور تخیلات سے غالب کا کلام اپنی نظیر آپ ہی ہو سکتا ہے - وہ جذباتِ عشق کو ایسی بلند آہنگی سے ادا کرتا ہے، کہ جس کو شاعری کے لئے سرمایۂ ناز سمجھنا چاہیئے - اور کہیں کہیں ایسا پختہ کارانہ ذوق نمایاں ہوتا ہے، جو مشکل سے کسی شاعر کے یہاں مل سکتا ہے - یعنی:-

عجز و نیاز سے تو نہ آیا وہ راہ پر!
دامن کو اُس کے آج حریفانہ کھینچیئے

اور

اس لب سے مل ہی جائیگا بوسہ کبھی تو ہاں
شوقِ فضول و جرأتِ رندانہ چاہیئے

بے ثباتیِ عیش کے مضامین شعراء نے اکثر لکھے ہیں - مگر دُنیا کی شاعری میں اس قطعہ کا بھی کوئی جواب ہے:-

اے تازہ واردانِ بساطِ ہوائے دِل
زنہار اگر تمہیں ہوسِ نائے و نوش ہے
دیکھو مجھے جو دیدۂ عبرت نگاہ ہو
میری سنو جو گوشِ حقیقت نیوش ہے
ساقی بجلوہ دشمنِ ایمان و آگہی
مطرب بہ نغمہ رہزنِ تمکین و ہوش ہے

یا شب کو دیکھتے تھے کہ ہر گوشۂ بساط
دامانِ باغبان و کفِ گل فروش ہے
لطفِ خرامِ ساقی و ذوقِ صدائے چنگ
یہ جنتِ نگاہ وہ فردوسِ گوش ہے
یا صبح دم جو دیکھیے آکر تو بزم میں
نے وہ سرور و شور نہ جوش و خروش ہے
داغِ فراقِ صحبتِ شب کی جلی ہوئی
اِک شمع رہ گئی ہے سو وہ بھی خموش ہے

مَیں نے سطور بالا میں استقضائے اشعار میں بجد اختصار سے کام لیا ہے۔ کیونکہ غالب کی شاعری کے جس تفوق کو میں بیان کرنا چاہتا ہوں۔ وہ شرح کے ہر صفحہ میں موجود ہے۔ حاصل کلام یہ ہے کہ غالب کا کلام سامنے ہے۔ دُنیا کے مشہور شعراء کے کلام کو مقابلہ میں لائیے۔ اور دیکھئے، کہ غالب کہاں ہے؟

ہندوستان کی نیچرل، یا جدید، یا قومی، یا سیاسی شاعری کے طوفان سے تعرض نہیں۔ آج کل ہمارے پیشتر افراد اپنے اذواقِ امیال کی بھیک بھی مغرب سے مانگتے ہیں۔ اسی تقلید سے کام لیجئے اور عمرِ خیام اور فردوسی جن کی شاعری کا سکہ تمام مغرب میں رواں ہے، اُن کی شاعری کا غالب کی شاعری سے مقابلہ کیجئے، تو زمین و آسمان

کا فرق نظر آئے گا۔ فردوسی محض رزم نگار یا زیادہ سے زیادہ واقعات نگار تھا۔ اور اُس کے کمال کا راز صرف اُس کی زبان کی شوکت میں پنہاں ہے۔ عمر خیام کی شاعری دو خیالات پر منحصر ہے یعنی تحصیلِ عیش اور بے ثباتیِ عالم انہیں دو مضمونوں کو اُس نے طرح طرح سے بتنوع تشبیہات و استعارات دُہرا دُہرا کر ذخیرۂ شعر جمع کر دیا ہے۔ لیکن غالب کے یہاں خیالات، جذبات، مضامین عالیہ وغیرہ کا ایک بحرِ بیکران ہے، جس کی موجیں دُنیا و مافیہا کو حلقہ کئے ہوئے ہیں۔ اور:۔

ہیں اور بھی دُنیا میں سخنور بہت اچھے
کہتے ہیں کہ غالب کا ہے اندازِ بیاں اور

فقیر
سُہا

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نقش فریادی ہے کس کی شوخیِ تحریر کا	۱	کاغذی ہے پیرہن ہر پیکرِ تصویر کا
کاوِ کاوِ سخت جانی ہائے تنہائی نہ پوچھ	۲	صبح کرنا شام کا لانا ہے جوئے شیر کا
جذبۂ بے اختیارِ شوق دیکھا چاہیئے	۳	سینۂ شمشیر سے باہر ہے دمِ شمشیر کا
آگہی دامِ شنیدن جسقدر چاہے بچھائے	۴	مدعا عنقا ہے اپنے عالمِ تقریر کا

۵ بسکہ ہوں غالب اسیری میں آتش زیر پا
موئے آتش دیدہ ہے حلقہ مری زنجیر کا

(۱) "نقش" "تحریر" "تصویر" "فریادی" پکارنے والا، گلہ کرنے والا، زبانِ حال، دلیل، ثبوت، مظہر، "شوخیِ تحریر" رنگینیِ تحریر، صنعت تحریر، کمالِ مصوری، "کاغذی پیرہن" بمناسبت فریادی، فریادیوں کا لباس لباسِ عجز، یا ملبوسِ فنا، نمودِ بے بود، ہستیِ بے ثبات، ظہورِ فانی "پیکرِ تصویر" تصویر کی ہیئت کذائی، نقش و تحریر کی وہ خاص کششیں اور رسمیں جن سے صورتِ تصویر متشکل ہوتی، قالب، خاکہ، قیود ابعاد نقش، تحریر اور تصویر بالعموم کاغذ پر بنائے جاتے ہیں، نقش و نگار سے کاغذ کی سادگی میں شوخی و رنگینی پیدا ہو جاتی ہے۔ رنگینی و شوخی، مصور و محرر کی ذہنی رنگینی و شوخی کی خارجی پرتو ہوتی ہیں

گویا تصویر بزبانِ حال تحریر اور بگویائے ظہورِ کمال، مصور کا ذکر کرتی
ہے یعنی نقش بلباس کاغذی کس کی بیدادِ تحریر کا فریادی ہے؟
یا تصویر اپنی سادگی (کاغذی پیرہن) میں کس کی رنگینی ظاہر
کرتی ہے؟ یا تصویر اپنی سادگی، بے ثباتی، اور کاغذی ہستی پر
کس سے دادِ طلب ہے؟ یا آدمی (نقش) باوجود حیاتِ مستعار
(کاغذی پیرہن) کس کی صنعت و اعجازِ خلاقی (شوخیٔ تحریر) کا
ثبوت (فریادی) ہے؟ یا آدمی، اپنے مصائب گرد و پیش
(کاغذی پیرہن) پر کس کاتبِ تقدیر (شوخ تحریر) سے شاکی
(فریادی) ہے؟ یا آدمی باوجود اپنی نمودِ بے بود (کاغذی پیرہن)
کے کس کرشمۂ ایجاد (شوخیٔ تحریر) پر دلالت کرتا اور ثبوت لاتا
(فریادی) ہے یا یہ جسمِ فنا پیوستہ، یہ ہیولائے ضعیف البنیان
یہ قالبِ خاکی یہ کالبدِ عنصری (تصویر بہ پیرہن کاغذی) کس کے
دستِ رنگین کی صنعت طرازی (شوخیٔ تحریر کا) شاہد و
مصنوع ہے۔ یا یہ مظہر (نقش) یا یہ ظہورِ فانیۂ انسانیہ
(کاغذی پیرہن) کس کے جمالِ حیات (شوخیٔ تحریر) سے
دست و گریباں (فریادی) ہے؟ اس قفس (پیرہن کاغذی)
میں جو عندلیبِ نالاں (نقش) ہے وہ کس گل (شوخیٔ تحریر) کے
شکوہ و شکایات (فریاد) کرتی ہے؟ شعر میں جو استفہام
ہے وہ اشارہ ہے، جواب صریح کی جانب، اور اس قسم کے
تمام سوالات جن کا جواب ایک ہی، بدیہی اور بلند ہی ہوتا ہے
حسنِ کلام میں داخل ہیں۔ اور اگر غور کیا جائے تو استناد کا یہ شعر

مولانا رومیؒ کی "بشنو از نے" والی، پوری حکایت کا مرادف ہے اور قطع نظر اُس حکیمانہ و متصوفانہ مفاہمت کے اپنے شاعرانہ انداز میں تمام حکایت "نے" کی جامعیت رکھتا ہے جن لوگوں نے قصد کی وحشت یا کم غوری سے کام لیا ہے وہ اس شعر کو مہمل قرار دیتے ہیں۔

(۲) "کاوِ کاوِ" کاوش و تلاش، تکرار لفظی نے تلاش و کوشش پیہم کا مفہوم پیدا کیا ہے۔ "جوئے شیر" دودھ کی نہر، تلمیح قصۂ فرہاد۔ فرہاد "کوہ کنی" سے معروف اور "کوہ کن" سے ملقب ہے اور تلمیح نے "کاوِ کاوِ" "سخت جانی" "شب تار یک تنہائی" "پہاڑ کے کاٹنے" "جوئے شیر" (جس میں سپیدۂ سحر یا خطِ ابیض سحر سے تشبیہ ہے) وغیرہ میں شاعرانہ رعایتیں پیدا کر دی ہیں۔ یعنی ہم اپنی کیا کاوشیں بیان کریں کہ شب ہجر و تنہائی کی صبح اس مشکل سے ہوتی ہے گویا صبح کرنا شام کا لانا ہے جوئے شیر کا!

(۳) شوقِ شہادت کی پیشکش اور تحیر بھی قابل دید ہے، کہ تلوار خود بڑھ بڑھ کر ہماری جانب آتی ہے۔

(۴) "آگہی" "عقل، سمجھ، جستجو" "دام" "جال" عنقا کی رعایت سے استعمال ہوا ہے "شنیدن" "سننا۔ دام شنیدن، بچھانا، غور کرکے سننا، سمجھنے کی بے حد کوشش کرنا۔ "عنقا" پرند ہے جس کا وجود اذہان میں فرض کر لیا گیا ہے۔ اور خارج میں کوئی وجود نہیں، معدوم "عالم" "دُنیا، حالت" عنقا

کی رعایت سے، زیادہ استعمال ہوا ہے۔ "تقریر" "گفتگو" "مدعا"
مطلب۔ یعنی ہماری گفتگو میں مطلب ہی نہیں، کوئی کتنی
ہی سمجھنے کی کوشش کرے، سمجھ نہیں سکتا، یا ہم جس عالمِ حال
کی باتیں کرتے ہیں اُن کو اہلِ ظاہر و قال، اپنی ان عقلوں سے ۴
سمجھ ہی نہیں سکتے!

(۵) "اسیری" گرفتاری، پابہ زنجیر ہونا۔ "آتش زیرپا" بیقرار یا
بے چینی سے قدم نہ تھمنا۔ "موئے آتش دیدہ" آگ پر تپا ہوا
بال ایک مبالغہ ہے یعنی کمزور بیحد۔ "حلقۂ زنجیر" زنجیر کی کڑی،
کڑی اور موئے آتشدیدہ میں تشبیہ ہے۔ "آتش زیرپا" اور
آتش دیدہ رعایات لفظی ہیں۔ مطلب ہے باوجود اسیر و پابہ
زنجیر ہونے کے، میری بیتابی یا وحشت خرامی کا یہ زور ہے
کہ زنجیر کی کڑیاں ایسی کمزور ہو کر ٹوٹ جاتی ہیں، جس طرح
موئے آتشدیدہ!

۱	جز قیس اور کوئی نہ آیا بروئے کار	صحرا مگر بہ تنگئ چشمِ حسود تھا
۲	آشفتگی نے نقشِ سویدا کیا درست	ظاہر ہوا، کہ داغ کا سرمایہ دود تھا
۳	تھا خواب میں خیال کو تجھ سے معاملہ	جب آنکھ کھل گئی نہ زیاں تھا نہ سود تھا
۴	لیتا ہوں مکتبِ غمِ دل میں سبق ہنوز	لیکن یہی، کہ رفت گیا، اور بود تھا
۵	ڈھانپا کفن نے داغِ عیوبِ برہنگی	میں، ورنہ ہر لباس میں ننگِ وجود تھا
۶	تیشے بغیر مر نہ سکا کوہکن، اسد	سرگشتۂ خمارِ رسوم و قیود تھا

(۱) "بروئے کار نہ آیا" مقابل نہ ہوا۔ یا عشق نہ کیا۔ "چشمِ حسود"

حاسدوں کی نظر، جو کسی کو دیکھ ہی نہ سکے۔ بادی النظر میں شعر کے معنے صاف ہیں کہ سوائے قیس کے کوئی مردِ میدانِ عشق نہ ہو سکا، شاید صحرا (صحرائے عشق) نگاہِ حسود کی طرح تنگ تھا، لیکن یہ معنی واقعیت کے اعتبار سے صحیح نہیں ہیں، بلکہ مصرعۂ اوّل میں استفہام انکاری ہے، اور صحرا سے مراد وادیٔ نجد ہے۔ مطلب یہ ہے کہ کیا سوائے قیس کے کسی کو عشق ہی نہیں ہوا؟ (غلط ہے)، (ہاں) وادیٔ نجد چشم حسود کی طرح تنگ سہی (کہ وہاں کوئی دوسرا عاشق نہ ہوا)

(۲) "آشفتگی" پریشانی، الجھن۔ "نقش سویدا" نقطۂ قلب کے نقوش۔ یہ تو ظاہر ہے، کہ نالہ و آہ، پریشانی کے آثار میں سے ہیں۔ شعراء آہ کے ساتھ دودِ آہ لکھا کرتے ہیں مطلب یہ ہے کہ پریشانی کی آہوں سے نقطۂ قلب (سویدا) کا نشان گہرا ہو گیا اور یہ ظاہر ہو گیا کہ داغ کی ہستی "دود" پر قائم ہے!

(۳) بظاہر تو شعر صاف ہے۔ لیکن "خواب" سے مراد، خوابِ ہستی ہے، اور خیال بمعنی وہم۔ "جب آنکھ کھل گئی" یعنی جب یہ خوابِ زندگی ختم ہوا، یا جب "فنا فی الذات" ہو گئے۔ "سود و زیاں" معاملہ کے تلازمات میں سے ہیں۔ "نہ زیاں تھا نہ سود تھا" یعنی جیسے تھے ویسے ہی رہے۔ شاعر نے معاملہ کے تلازمات میں "من و تو" کا مفہوم ادا کیا ہے، معنے یہ ہیں، کہ "من و تو" کا انحصار خوابِ ہستی کے اوہام پر تھا، جب فنا فی الذات ہو گئے، تو جیسے تھے ویسے ہی رہے (الآن کما کان)!

(۴) "مکتب" "سبق" "رفت و بود" (گویا ابتدائی درس) سب عبارات
لفظی ہیں، مطلب یہ ہے کہ میں ابھی تک دل ہی کا ماتم کر رہا ہوں
کہ کبھی میرے پاس بھی دل تھا، اور (ہائے) کہیں جاتا رہا
(گویا مدارج عشق کی ابتدا یہ ہے)

(۵) کفن نے، انسانیت کے دامن پر جو عیب میرے وجود سے
تھے ان پر پردہ ڈال دیا، ورنہ میں اپنی ہستی کے تمام پیکروں میں
"ہستیٔ مطلق" کے لئے باعث ننگ و عار تھا، یا ظہور ذات کی جو
عریانی تنزلات باعتبار میرے تھی، میری موت نے اس ننگ
نمود کو مٹا دیا، کیونکہ میں بجائے خود ہر عالم و حیثیت میں "وجود مطلق"
کے لئے عار و ناموزوں تھا!

(۶) "تیشہ" بیلچہ۔ کوہکن، فرہاد "سرگشتۂ خمار" سرشار مستی نشاط
سُکر سے فاتر العقل۔ "رسوم و قیود" غیر فطری پابندیاں اور فرائض
آدمیوں کے اختراع و اختیار کئے ہوئے وہ دستور جن کو
اگر ترک کر دیا جائے تو کوئی نقصان نہ ہو اور جن کی بجا آوری
بے سود و بے نتیجہ ہو۔ مطلب یہ ہے کہ فرہاد کی عقل میں بھی رسوم
و قیود کا فتور تھا، کہ اپنی ہلاکت کے لئے، تیشہ کا التزام کیا،
حالانکہ عشاق کی ہلاکت کے لئے کسی آلۂ جارحہ کی ضرورت
نہیں، بلکہ ایک آہ حسرت و یاس، ایک نالۂ جگر گداز اور ایک
غمزۂ چشم کافی ہے!

کہتے ہو نہ دیں گے ہم دل اگر پڑا پایا	۱	دل کہاں کہ گم کیجے ہم نے مدعا پایا
عشق سے طبیعت نے زیست کا مزا پایا	۲	درد کی دوا پائی درد بے دوا پایا

دوستدارِ دشمن ہے اعتمادِ دل معلوم	۳	آہ بے اثر دیکھی، نالہ نارسا پایا	
سادگی و پرکاری، بیخودی و ہشیاری	۴	حسن کو تغافل میں جرأت آزما پایا	
غنچہ پھر لگا کھلنے، آج ہم نے اپنا دل	۵	خوں کیا ہوا دیکھا، گم کیا ہوا پایا	
حالِ دل نہیں معلوم، لیکن اس قدر یعنی	۶	ہم نے بارہا ڈھونڈا، تم نے بارہا پایا	
۷	شورِ پندِ ناصح نے زخم پر نمک چھڑکا آپ سے کوئی پوچھے تم نے کیا مزا پایا		

(۱) یعنی تم جو خود بخود کہہ رہے ہو کہ "دل اگر پڑا پایا تو ہم نہ دیں گے" اس تمہارے کہنے سے ہم سمجھ گئے کہ یا تو دل تمہارے پاس موجود ہے اور یا دل لے لینے کی خواہش ہے، جس کو اس طرح ظاہر کیا جا رہا ہے۔

(۲) صوفیاء اور شعراء بعض اوقات زندگی کو سلسلۂ درد سمجھتے ہیں اور یہ بھی مسلم ہے کہ عشق سے زندگی خوشگوار ہو جاتی ہے۔ حالانکہ عشق بھی ایک قسم کا درد اور الم لاعلاج ہے۔ شعر میں اس مضمون کو اس طرح ادا کیا ہے، کہ عشق سے طبیعت کو زندگی میں لطف حاصل ہونے لگا، گویا، یہ "دردِ بے دوا" (عشق) دردِ زندگی کے لئے دوا ہو گیا ہے۔

(۳) مطلب ہے کہ دل پر بھروسہ فضول ہے۔ آہ بے اثر ہے اور نالہ نارسا، اس سے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ (دل) کمبخت رقیب کا دوست ہو گیا ہے۔

(۴) مطلب یہ ہے کہ وہ تغافل کر کے ہمارے صبر و ضبط کو آزمانا چاہتے ہیں، اور اس طرح اُن کی چالاکی کس قدر بھولے پن پر مبنی ہے

کیونکہ ہم باوجودِ بیخودی اتنا تو سمجھ ہی رہے ہیں کہ اس تغافل سے ہماری آزمایش منظور ہے۔ یا یہ مطلب ہے کہ وہ تغافل اس لئے کر رہے ہیں کہ ہماری جرأت عشق کو آزمائیں؛ اور ہم بیخودی میں بھی اتنی عقل رکھتے ہیں کہ اس پُرکاری کو جسے وہ نہایت سادگی کے ساتھ پیش کر رہے ہیں سمجھ لیں (چنانچہ آپ جرأت عشق دکھائے ہی دیتے ہیں اور بڑھ کر ان کا دامن تھام لیں گے اور پوچھیں گے کہ آخر عشاق سے یہ بے پروائی کیوں فرمائی جا رہی ہے)

(۵) "غنچہ کھلنا" گویا شگوفہ کھلنا یا شگوفہ کھلانا یا شگوفہ چھوڑنا، نرالی بات کرنا، یا فتنہ پیدا کرنا، محاورہ ہے۔ بقول شاعر

کبھی بن سنور کے جو آ گئے تو بہارِ حسن دکھا گئے + وہ نیا شگوفہ کھلا گئے

مرے دل پہ داغ لگا گئے۔ "خون کیا ہوا" مبتلائے عشق اور کشتۂ حسن ہونا مراد ہے۔ مطلب ہے کہ آج پھر وہی فتنہ بیدار ہوا اور ہمارا دل جاتا رہا۔

(۶) یعنی؛ دل کا (اور کچھ) حال (تو) معلوم نہیں، مگر (اتنا جانتا ہوں کہ) میں نے جب ڈھونڈا تو تمہارے پاس نکلا۔

۱	دل مرا سوزِ نہاں سے بے محابا جل گیا	آتشِ خاموش کے مانند گویا جل گیا
۲	دل میں ذوقِ وصل و یادِ یار تک باقی نہیں	آگ اس گھر میں لگی ایسی کہ جو تھا جل گیا
۳	میں عدم سے بھی پرے ہوں ورنہ غافل بارہا	میری آہِ آتشیں سے بالِ عنقا جل گیا
۴	عرض کیجے جوہرِ اندیشہ کی گرمی کہاں	کچھ خیال آیا تھا وحشت کا، کہ صحرا جل گیا
۵	دل نہیں، تجھکو دکھاتا ورنہ داغوں کی بہار	اس چراغاں کا کروں کیا، کارفرما جل گیا

۶	میں ہوں اور افسردگی کی آرزو غالبؔ کہ دل دیکھ کر طرزِ تپاکِ اہلِ دنیا جل گیا	

(۱) "سوزِ نہاں" کی رعایت سے "آتشِ خاموش" لاتے ہیں۔ اور "سوزِ نہاں" کو "آتشِ خاموش" سے تعبیر کرتے ہیں۔ "بے محابا" کھلم کھلا۔ بلا پس و پیش۔ "نہاں" "بے محابا" "خاموش" اور "گویا" تمام الفاظ میں رعایتیں ہیں۔ مطلب صاف ہے۔

(۲) "آگ" سے آتشِ عشق مراد ہے، اور اس گھر کا اشارہ دل کی طرف ہے۔ اس شعر میں عشق کے اس مقام کی طرف اشارہ ہے جب اُمید و یاس وصل و ہجر، یادِ محبوب، غرضکہ کسی جذبہ کا احساس باقی نہیں رہتا، اور یہ وہ مقام حیرت و عالم فراموشی ہے کہ اسی کے بعد انا المحبوب یا انا الحق کی کیفیت طاری ہوتی ہے۔ شعر کا مطلب صرف یہ ہے کہ اب نہ تو ذوقِ وصل باقی ہے نہ یادِ دوست۔ اس گھر میں عشق کی آگ ایسی لگی، کہ سب کچھ جل گیا۔

(۳) "عنقا" ایک معدوم پرند کا مفروضہ نام ہے۔ یہاں "عدم" سے متصوفانہ عقیدے کے موافق، "مقامِ فنا" مراد ہے جہاں سالک کی ذاتیت اور نفسیت باقی نہیں رہتی اور خودی و انانیت کو مٹا کر "بقا باللہ" کے حدود میں داخل ہوتا ہے چنانچہ شاعر اس شعر میں اس خیال کو ادا کرتا ہے کہ میں عدم یعنی فنا سے گذر چکا ہوں اور بقا کے مراتب پر پہنچ گیا ہوں دوسرا مصرع ایک شاعرانہ دلیل اور ثبوت ہے کہ جب میں مقامِ فنا میں

تھا تو میری آہ آتشین سے ہمیشہ بالِ عنقا جلتا رہا ہے اور اب اُس سے گذر گیا۔ کیونکہ اب آہ آتشیں بالِ عنقا کو نہیں جلاتی۔ شعر پر اگر نظر غائر ڈالی جائے تو مفہوم زیادہ بلیغ ہو جاتا ہے، یعنے صوفیائے کرام اور شعرائے متصوف ہستی اور موجودہ حیات کو موہوم و کالعدم یقین کرتے ہیں، اِس لئے معدوم کی ہر بات معدوم ہونی چاہیئے، گویا اُن کی آہ کی تاثیر بھی معدوم اور شئے معدوم پہ ہونی چاہیئے، اب مطلب یہ ہوگا کہ میں اب عدم سے گذر چکا ہوں، یعنی جب میں عدم میں تھا تو میری آہِ آتشین سے بالِ عنقا جلتا تھا اور بالِ عنقا جلنا بالفاظ دیگر یہ کہ آہ آتشین میں کوئی تاثیر ہی نہ تھی، جس کے یہ معنے ہوئے کہ جب میری آہ آتشین سے بالِ عنقا جلتا تھا تو میں خود ہی معدوم تھا اور اب تو میں اُس سے پرے ہوں، اور وجود و ہستی و بقا اور اثر غیر فانی رکھتا ہوں یا شعر کا مطلب یہ ہے کہ پہلے میری آہ کا اثر یہ تھا کہ اس سے بالِ عنقا جلتا تھا اور اب تو وہ بالِ عنقا بھی نہیں جلتا، گویا پہلے اگر تاثیر اتنی تھی تو اب وہ بھی نہ رہی اور میری بے اثری بے ثباتی اور نیستی اس حد تک پہنچ گئی کہ عدم سے بھی گئی گذری ہو گئی۔

(۴) "عرض کیجے" پیش کیجے۔ "جوہر اندیشہ" جوہر زائد استعمال ہوا ہے "اندیشہ" خیال و فکر۔ شعر میں مبالغہ عادی سے کام لیا گیا ہے.... یعنی میں اپنی گرمیٔ اندیشہ کو کہاں لیجاؤں

جس کے سوز کا یہ عالم ہے کہ وحشت کا خیال آتے ہی صحرا جل گیا۔

(۵) دل کے داغوں کی تشبیہ چراغاں سے دی گئی۔ "کار فرمائے چراغاں" دل سے استعارہ کیا ہے۔ شعر کا انداز ادا خوب ہے، کہ دل کے جل جانے کا ذکر داغوں کی بہار دکھانے کے ضمن میں کر دیا ہے۔

(۶) یعنی میں جو ہمیشہ زندہ دل رہتا تھا، اب اہل زمانہ کی سرد مہریوں سے تنگ آ کر افسردہ دلی کا آرزومند ہوں تاکہ کسی سے ملنے کے قابل ہی نہ رہوں۔

شوق ہر رنگ رقیبِ سر و ساماں نکلا	۱	قیس تصویر کے پردہ میں بھی عریاں نکلا
زخم نے داد نہ دی تنگیِ دل کی یارب	۲	تیر بھی سینۂ بسمل سے پر افشاں نکلا
بوئے گل، نالۂ دل، دودِ چراغِ محفل	۳	جو تری بزم سے نکلا سو پریشاں نکلا
دلِ حسرت زدہ تھا مائدۂ لذتِ درد	۴	کام یاروں کا بقدرِ لب و دنداں نکلا
تھی نو آموزِ فنا، ہمتِ دشوار پسند	۵	سخت مشکل ہے کہ یہ کام بھی آساں نکلا

۶
دل میں پھر گریہ نے اک شور اٹھایا غالب
آہ جو قطرہ نہ نکلا تھا، سو طوفاں نکلا

(۱) "شوق" عشق۔ "ہر رنگ" ہر طرح اور رنگ کے معنے شوق بھی ہوتے ہیں۔ یہاں لفظ رنگ، تصویر کی رعایت سے بھی استعمال ہوا ہے۔ "رقیب" حریف، دشمن۔ مطلب یہ ہے کہ عشق، ہر حال میں آرائش، تکلفات، اور ساز و سامان کا دشمن ہے، تصویر اگرچہ نقش و رنگ سے بنتی ہے لیکن قیس —

تصویر میں بھی جامہ دریدہ اور عُریاں رہتا ہے، اور تصویر کی صنعت اس کے لئے باعث زینت نہیں ہوتی۔ سچ ہے عشاق پر سوائے عشق کی بیرنگی کے کوئی اور رنگ نہیں چڑھتا۔

(۲) "دادندی" تلافی و ہمدردی نہ کی۔ "پرافشاں" سراسیمہ پھڑ پھڑاتا ہوا۔ یعنی پہلے دل تنگ تھا، خیال یہ ہوتا تھا کہ تیر کے زخم سے کشادگی پیدا ہوگی، لیکن تیر خود، دل سے سراسیمہ ہو کر نکلا، اور زخم سے بھی دل کی تنگی نہ گئی۔

(۳) بندش، اہتمام اور خیال کے اعتبار سے شعر عجیب و غریب اور مشہور ہے۔ بوئے گل، نالۂ دل اور دودِ چراغ، تمام شاعرانہ اشیاء جمع کی گئی ہیں، پھر، بُو، نالہ، اور دود، پریشان خاصیت چیزیں ہیں اور ان کا علاقہ محفل و بزم سے ظاہر ہے۔ شعر کا ایک مطلب تو یہ ہے کہ محبوب سے خطاب کر کے شاعر کہتا ہے، کہ تیرے ستم کا یہ حال ہے کہ جو تیری بزم سے نکلتا ہے وہ پریشان ہو کر نکلتا ہے۔ دوسرا مطلب یہ ہے کہ تیری بزم سے نکلنے کی وجہ سے مُبتلا ئے پریشانی ہوتا ہے۔

(۴) "مائدہ" خوانِ نعمت "بقدرِ لب و دنداں" معمولی، سرسری عارضی۔ لوگ عشاق کی ہنسی اُڑایا کرتے ہیں، ان کی حسرتوں کی تلافی نہیں کرتے بلکہ مضحکے وغیرہ سے خود لطف اٹھاتے ہیں اسی خیال کو اس طرح ادا کیا گیا ہے، کہ میرا دل حسرت زدہ

یاروں کے لئے درد کی محض لذتوں کا خوان نعمت بن گیا، کاش وہ خود، حسرت، درد اور محبت پیدا کرتے تو اُن کو حقیقی سیری میسّر ہوتی، اس طرح تو معمولی، سرسری اور عارضی لطف اُٹھا لیا۔

(۵) "نو آموز" بتدی۔ ابتدا اور شروع میں، طالب کو عام طور پر دقتیں معلوم ہوتی ہیں۔ شاعر کہتا ہے، کہ میری حالت عام نو آموزوں کی سی نہ تھی کہ مَیں پہلے پہل، کوئی دشواری محسوس کرتا، کیونکہ میری ہمت ہی دشوار پسند تھی اور جب میں نے مقام فنا کو طے کرنا شروع کیا، تو مجھے دشواری یہ پیش آئی کہ فنا سے گذرنا مجھے آسان معلوم ہوا، اور طبیعت کی مشکل پسندی اور زیادہ مشکلوں کی جستجو کرنے لگی۔

(۶) یعنی، دل میں رونے کا ایک طوفان سا ہے، اور یہ طوفان اشک کے اُن قطروں نے اُٹھا رکھا ہے جن کو ہم نے ضبط کر کے روکا تھا۔

شکی یاں مر گیا جو نہ باب نبرد تھا	۱	عشق نبرد پیشہ، طلبگار مرد تھا
تھا زندگی میں مرگ کا کھٹکا لگا ہوا	۲	مرنے سے پیشتر بھی مرا رنگ زرد تھا
تالیف نسخہ ہائے وفا کر رہا تھا میں	۳	مجموعۂ خیال ابھی فرد فرد تھا
دل تا جگر کہ ساحل دریائے خوں ہے اب	۴	اس رہگزر میں جلوۂ گل آگے گرد تھا
جاتی ہے کوئی کشمکش اندوہ عشق کی	۵	دل بھی اگر گیا تو وہی دل کا درد تھا
احباب چارہ سازی وحشت نہ کر سکے	۶	زنداں میں بھی خیال بیاباں نورد تھا
۷	یہ لاش بے کفن اسد خستہ جاں کی ہے	

حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا

(۱) یعنی عشق کے لئے بڑی جرأت چاہیئے۔ اگر عشق میں آدمی مردانہ وار نہ ہو تو ہر مشکل و مصیبت کا خوف، عشق کو باطل کر دے۔

(۲) رنگ، آثارِ حیات میں سے ہے۔ زردی بھی رنگ کی ایک قسم ہے۔ جو مردنی سے مشابہ ہوتی ہے۔ اور مردنی کی زردی رنگ نہیں بلکہ بدرنگی ہے۔ خوف سے بھی رنگ زرد ہو جاتا ہے مطلب ہے کہ مجھ پر زندگی میں بھی موت کے خوف سے مردنی چھائی رہتی ہے!

(۳) "فرد فرد" ایک ایک۔ علاحدہ علاحدہ۔ مُراد ابتدا سے ہے "مجموعۂ خیال" سے عشق مقصود ہے۔ مطلب یہ ہے، کہ میں ابتدا سے عشق ہی سے وفا پرست تھا! ——— یا۔ وفا سے عشق مُراد ہے، اور مجموعۂ خیال سے تمام خیالات یعنی ابتدا ہی سے میرے خیالات میں عشق کا میلان تھا! ——— یا "مجموعۂ خیال" سے، عاشق کا نقطۂ خیال یعنی نظر یعنی معشوق مُراد ہے، اور "فرد فرد" سے بیگانگی و نا آشنائی، تو شعر کے معنی یہ ہونگے، کہ میں اُس وقت بھی وفا شیوہ تھا جب کہ اُس کو میرے عشق کی خبر تک نہ تھی!

(۴) یعنی، دل سے جگر تک، ایک ساحلِ دریائے خون ہے کبھی یہ مقام ایسی بہار کا تھا، کہ پھولوں کی آب و تاب گویا یہاں کی گرد تھی۔ شگفتہ خاطری اور افسردہ دلی کا تذکرہ ہے۔

(۵) "اندوہ" غم یعنی غمِ عشق کا سلسلہ ختم نہیں ہوتا، دل اگر نہ رہے، تو دل کے جانے کا غم ضرور ہوگا، اور یہ یادِ غمِ عشق کو تازہ کرتی رہے گی!

شمارِ سبحہ مرغوبِ بتِ مشکل پسند آیا	۱	تماشائے بیک کف بردنِ صد دل پسند آیا
بفیضِ بے دلی نومیدیِ جاوید آساں ہے	۲	کشائش کو ہمارا عقدۂ مشکل پسند آیا
ہوائے سیرِ گل، آئینۂ بے مہریِ قاتل	۳	کہ اندازِ بخوں غلطیدنِ بسمل پسند آیا
۴	جراحت تحفہ الماس ارمغاں داغِ جگر ہدیہ مبارکباد اسدؔ غمخوارِ جانِ دردمند آیا	

(۱) "شمارِ سبحہ" تسبیح پڑھنا (تسبیح یہاں ہم نے عام محاورہ کے موافق استعمال کر دیا ہے ورنہ تسبیح تو خود شمارِ سبحہ کو کہتے ہیں) "مرغوب آیا" اچھا معلوم ہوا۔ "بیک کف بردنِ صد دل" ایک ہی ہاتھ میں سو دل اُڑا لینے۔ سبحہ چونکہ عموماً سو دانہ کی ہوتی ہے، اس لئے "صد دل" استعمال کیا ہے "بتِ معشوق" "مشکل پسند" سے معشوق کا وصف اس لئے ظاہر کیا ہے کہ ایک دم سو دل اُڑا لینے کوئی آسان بات نہیں مطلب یہ ہے کہ بتِ مشکل پسند کو سبحہ خوانی اس لئے پسند آئی، کہ اس سے اس کو "صد دل بیک کف بردن" کا تماشہ نظر آیا!

(۲) "بیدلی" افسردگی "نا امیدیِ جاوید" ہمیشہ کے لئے مایوس ہو جانا "عقدۂ مشکل" دلِ افسردہ سے استعارہ ہے "کشائش" سے خود فعلِ کشائش مقصود ہے۔ مطلب یہ ہے کہ بے دلی کے فیض سے، مایوسیِ دوام "میسّر ہے۔ کیونکہ خود

کشائش کو میرے عقدہ کا مشکل ہونا، یعنی ناقابل حل ہونا پسند ہے!

(۳) "ہوائے سیرگل" سیر باغ کی خواہش "آئینہ بے مہری" نمودِ ستم گاری یعنی جس فعل میں، جفا کی جھلک ہو "بسمل" زخمی عشق سے استعارہ ہے "بخون غلطیدن" خون میں لوٹنا۔ خون۔ اور رنگ گل میں مشابہت ہے گویا پھول بھی باعتبار رنگ کے بخون غلطیدہ ہیں۔ مطلب ہے کہ اُن کی خواہش سیرگل، اُن کی بے مہری کی دلیل ہے، کہ ان پھولوں کا رنگ پسند ہے جو خون بسمل کی طرح ہوتا ہے۔

(۴) "جراحت" زخم "الماس" شمشیر آب دار۔ تحفہ، ارمغان ہدیہ، مرادف الفاظ ہیں "غمخوار جان دردمند" محبوب ستم پیشہ کی آمد پر خود کو طنزاً مبارکباد دی ہے۔

دہر میں نقش وفا وجہ تسلی نہ ہوا	۱	ہے یہ وہ لفظ کہ شرمندۂ معنی نہ ہوا
سبزۂ خط سے ترا کاکل سرکش نہ دبا	۲	یہ زمرد بھی حریف دم افعی نہ ہوا
میں نے چاہا تھا کہ اندوہ جفا سے چھوٹوں	۳	وہ ستمگر مرے مرنے پہ بھی راضی نہ ہوا
دل گذرگاہ خیال مے و ساغر ہی سہی	۴	گر نفس جادۂ سر منزل تقوی نہ ہوا
ہوں ترے وعدہ نہ کرنے میں بھی راضی کہ کبھی	۵	گوش منت کش گلبانگ تسلی نہ ہوا
۶	مر گیا صدمۂ یک جنبش لب سے غالب ناتوانی سے حریف دم عیسی نہ ہوا	

(۱) "نقش" "لفظ" "معنی" سب رعایات ہیں۔ مطلب ہے کہ زمانہ میں وفاداری کی کوئی پرسش نہیں، اور یہ لفظ بے مصرف

ہونے کے سبب بے معنی اور مہمل سا ہے۔ یا۔ وفاداری کبھی منت کش اثر نہ ہوئی!

(۲) "سبزۂ خط" کاکل زلف۔ سرکش وصف ہے زمرد و افعی تشبیہات ہیں۔ دُوسرے مصرعہ میں زمرد، سبزۂ خط سے اور افعی کاکل سرکش سے استعارہ ہے۔ خاصہ یہ ہے، کہ زمرد کے پر تو سے، افعی اندھا ہو جاتا ہے۔ مُراد ہے کہ سبزۂ خط سے زلف کا رنگ ماند نہ ہوا۔ یعنی سبزہ آغازی پر بھی اُن کی معشوقیت کا وہی عالم رہا!

(۳) "اندوہ جفا" غم ستم۔ مطلب ہے کہ مَیں نے تو چاہا تھا کہ وہ جان ہی لے لیں تو آئے دن کی ستم کشی سے نجات مل جائے لیکن وہ اس پر بھی راضی نہ ہوئے، کیونکہ وہاں روز کا شغل ہے، ایک ہی دن میں کیوں قصّہ پاک کریں!

(۴) "گذرگاہ" رستہ۔ جادہ۔ "نفس" سانس۔ مطلب ہے کہ زندگی پرہیزگاری کے مشاغل میں مصروف نہ سہی، دل میں مئے و ساغر کا خیال ہی سہی، کچھ سہی، "آگہی گر نہیں غفلت ہی سہی"!

(۵) "گوش" کان۔ "منت کش" احسان مند۔ "گلبانگ" ۔ مُژدہ خوش خبری۔ "یک جنبش لب" ہونٹوں کی ایک حرکت۔ "ناتوانی" کمزوری۔ "حریف" مقابل۔ "دم عیسیٰ" حضرت عیسیٰ کا یہ معجزہ مشہور ہے، کہ آپ مُردوں کو جلا دیتے تھے، شعرا ہمیشہ اس تلمیح کو اپنے مضامین کا ماخذ بناتے ہیں۔ مطلب ہے کہ مریض

عشق کے ضعف کا یہ عالم تھا کہ جنبشِ لب سے صدمۂ روح فرسا
پہنچا، اور کام تمام ہوگیا، دم کرنے کی نوبت بھی نہ آئی
(یعنی کچھ پڑھ کر پھونکنے کی نوبت بھی نہ آئی)

ستائش گر ہے زاہد اس قدر جس باغِ رضواں کا
وہ اک گلدستہ ہے ہم بیخودوں کے طاقِ نسیاں کا (۱)

بیاں کیا کیجیے بیدادِ کاوش ہائے مژگاں کا
کہ ہر اک قطرۂ خوں دانہ ہے تسبیحِ مرجاں کا (۲)

نہ آئی سطوتِ قاتل بھی مانع میرے نالوں کو
کیا دانتوں میں جو تنکا ہوا ریشہ نیستاں کا (۳)

دکھاؤں گا تماشہ، دی اگر فرصت زمانہ نے
مرا ہر داغِ دل اک تخم ہے سروِ چراغاں کا (۴)

کیا آئینہ خانہ کا وہ نقشہ تیرے جلوے نے
کرے جو پرتوِ خورشید عالم شبنمستاں کا (۵)

مری تعمیر میں مضمر ہے اک صورت خرابی کی
ہیولیٰ برقِ خرمن کا ہے خونِ گرم دہقاں کا (۶)

اُگا ہے گھر میں ہر سو سبزہ ویرانی تماشا کر
مدار اب کھودنے پر گھاس کے ہے میرے درباں کا (۷)

خموشی میں نہاں خوں گشتہ لاکھوں آرزوئیں ہیں
چراغِ مُردہ ہوں میں بے زباں گورِ غریباں کا (۸)

ہنوز اک پرتوِ نقشِ خیالِ یار باقی ہے
دلِ افسردہ گویا حُجرہ ہے یوسف کے زنداں کا (۹)

بغل میں غیر کی آج آپ سوتے ہیں کہیں ورنہ (۱۰)
سبب کیا خواب میں آ کر تبسم ہائے پنہاں کا

نہیں معلوم کس کس کا لہو پانی ہوا ہوگا (۱۱)
قیامت ہے سرشک آلودہ ہونا تیری مژگاں کا

نظر میں ہے ہماری جادۂ راہ فنا غالب (۱۲)
کہ یہ شیرازہ ہے عالم کے اجزائے پریشاں کا

(۱) "ستائش گر" مداح۔ "باغ رضواں" جنت "طاق نسیاں" اُردو میں "طاق پر رکھنا" یا "بالائے طاق" محاورۃً ترک کر دینے یا بُھلا دینے کے معنے میں مستعمل ہیں۔ یہاں "طاق نسیاں" تاکید اور مبالغہ کے لئے لاتے ہیں۔ پھر باغ کا تحقیراً گلدستہ بنا دیا ہے۔ "بیخود" دیوانۂ عشق۔ مطلب ہے کہ زاہد جس جنت کی اس قدر تعریف کرتا ہے، وہ ہم بیخودوں کے طاق فراموشی کا ایک گلدستہ ہے۔ یا ہم جس بہارستان حسن و عشق میں ہیں وہاں جنّت کو کون پُوچھتا ہے!

(۲) "کاوشہا" "کاوش" کی جمع ہے۔ "کاوش" چھیدنا قطرۂ خون کی دانۂ مرجاں سے تشبیہ ہے۔ گویا قطرات خون دانے ہیں اور "مژگاں" رشتہ، جن سے ایک تسبیح تیار ہو گئی ہے۔

(۳) "سطوت" رُعب "نیستان" وہ زمین جہاں نَے پیدا ہوتی ہے "دانتوں میں تنکا لینا" اظہار عجز و خوشامد۔ "ریشۂ نیستاں" سے مراد نَے ہے۔ مطلب ہے کہ معشوق کے رُعب کا اثر میرے نالوں پر کچھ نہ ہوا، بلکہ میں نے مرعوبیت میں اظہار عجز کے لئے

جو تنکا دانتوں میں لیا، وہ میرے نالوں کے لئے گویائی کا
کام دینے لگا!

(۴) "سرو چراغاں" چراغوں کے ایسے طریق نصب و آویزش
کو کہتے ہیں جو روشن کر دینے پر درخت کی شکل میں نظر آئیں
لفظِ تخم، سرو کے تلازمہ سے استعمال کیا ہے اور تخم و داغ
میں مشابہت ہوتی ہے۔ "نالہ" کو شعراء "شرربار" کہا کرتے
ہیں۔ اس لئے ہر شرر ایک چراغ ہے۔ "داغ" غم و الم سے
پیدا ہوتا ہے، اور پھر داغ خود نالوں کا سبب ہوا کرتا ہے!
قلب انسانی کی شکل بھی سرو کی سی ہوتی ہے، مطلب یہ ہے کہ
تو نے اگر مہلت دی تو اسی دل میں سرو چراغاں کا تماشا
دکھا دوں گا، میرے داغ دل کو داغ نہ سمجھو بلکہ وہ سرو چراغاں کا
تخم ہے۔

(۵) "شبنمستان" جہاں بہت سے قطرات شبنم ٹھہر گئے ہوں۔
مطلب یہ ہے کہ تیرے پرتوِ جمال نے آئینہ خانہ میں وہ عالم
پیدا کر دیا، جو آفتاب کے عکس سے شبنمستان میں ہوتا ہے
جس طرح پرتوِ خورشید سے شبنم کا ایک ایک قطرہ چمک اٹھتا
اور ہر قطرہ شعاعوں سے معمور ہو جاتا ہے، اسی طرح تیرے
پرتو سے آئینہ خانہ جگمگا اٹھا یا سارے آئینوں کی صفا اور
چمک ماند پڑ گئی۔

(۶) "تعمیر و تخریب" فلسفہ کی اصطلاحیں ہیں، جن کے معنے، کون
فساد، بننا بنانا، بگڑنا، بگاڑنا، یا فنا و بقا ہیں۔ "مضمر" پوشیدہ

پنہاں "ہیولیٰ" بھی فلسفہ کا مصطلحہ لفظ ہے بمعنی، مادّہ یا جسمانیت کے ہیں "خرمن" (کھیتی) اور "دہقان" (مزارع) رعایات ہیں اصل میں یہاں "دہقان" حرارت غریزی سے اور "خرمن" حیات جسمانی سے استعارہ ہے۔ حرارت غریزی ایک حرارت ہے، جو اطبا کی دانست میں باعث بقائے حیات ہے۔ خون کا مزاج بھی گرم بیان کیا جاتا ہے، یا خون کا ایک حصہ صالح تحلیل ہو کر حرارت بنتا ہے۔ یہی حرارت معاون حرارت غریزی یا خود حرارت غریزی ہے گویا خون کا فنا (تحلیل) ہونا ایک ایسی حرارت کا باعث ہوتا ہے جس پر بقائے حیات کا انحصار ہے۔ پھر حرارت غریزی جو جسم میں قوۃ القویٰ کی حیثیت رکھتی ہے۔ دوسری تمام قوتوں کے تغذیہ وغیرہ کے لئے خون کو تحلیل کرتی اور بدل ما یتحلل بناتی ہے، یعنے خود اس کی ہستی کا مدار بھی تحلیل خون پر ہے، پھر وہ خود بھی خون کو تحلیل کرتی رہتی ہے، غرضکہ وہ خود نتیجۂ تحلیل اور سبب تحلیل ہے، اس طرح دو تحلیلوں، یا دوگونہ فناؤں کے درمیان ایک عمل یا ایک ہستی ہے، جو مدار حیات جسمانی ہے اور یہی تعمیر میں تخریب، یا تعمیر جسم میں خرابی کی صورت ہے! یہ ایک طبی استدلال ہے جس کو فلسفہ کی اصطلاحوں، اور شاعری کے استعاروں میں، انسان کی ہستی بے ثبات کی تمثیل کے لئے بیان کیا گیا ہے!!

(۷) دربان کا کام یہ ہوتا ہے کہ غیر لوگوں کو گھر میں آنے سے

دوسرے یہ کہ عشاق جو بیکس ہوتے ہیں اُن کے یہاں غیر تو غیر اپنے بھی نہیں آتے۔ جو سبزہ خود رو ہوتا اور جگہ جگہ اُگ آتا ہے اُس کو شعرا سبزۂ بیگانہ کہتے ہیں۔ شعر میں دو قرینے ہیں ایک یہ کہ میرے گھر کوئی غیر و بیگانہ تو آتا نہیں البتہ سبزۂ بیگانہ اُگا ہوا ہے۔ اسی کے کھودنے میں دربان مصروف ہو گیا ہے۔ دوسرے یہ کہ میرے گھر کی ویرانی کا یہ عالم ہے کہ ہر جگہ گھاس اُگی ہوئی ہے اور بیکسی کی یہ حالت ہے کہ کوئی آتا ہے نہ جاتا ہے۔ پس دربان سوائے اس کے کہ گھاس کھودے اور کوئی کام ہی نہیں!

(۸) زبان کی تشبیہ چراغ یا شمع کی لو سے دی جاتی ہے۔ بجھے ہوئے چراغ کو چراغ مردہ یا شمع کشتہ، یا چراغ خاموش یا شمع خاموش، کہا جاتا ہے۔ اسی طرح خاموش و بے زبانی کی تشبیہ چراغ مردہ یا شمع کشتہ یا شمع خاموش سے دیتے ہیں۔ "خون گشتہ آرزو" اُس آرزو یا تمنا کو کہتے ہیں جو پوری نہ ہوئی ہو اور دل کی دل ہی میں رہ گئی ہو اسی رعایت سے دل کو، یا پیکر عاشق کو گور غریباں سے تعبیر کرتے ہیں مطلب ہے کہ میری خاموشی میں لاکھوں آرزوؤں کا خون پوشیدہ ہے اور خود مجھ بے زبان کا وجود ایسا ہے جیسے گورستان کا بجھا ہوا چراغ۔

(۹) "دل افسردہ" کی تشبیہ حجرۂ زنداں سے نہایت اچھی تشبیہ ہے قید خانہ کا حجرہ بھی تاریک اور بند سا ہوتا ہے اور افسردگی کا

خاصہ یہی ہے کہ طبیعت منقبض ہو، اُلجھن ہو شگفتگی نہ ہو، اور اُمید کی کوئی جھلک نہ پائی جائے، بلکہ مایوسی کی تاریکی ہو، لیکن اس شعر میں اتنا اضافہ ہے کہ دل افسردہ میں معشوق کا کچھ کچھ تصوّر رہتا ہے اور معشوق کا سرسری تصوّر بھی مایوسی کی ظلمت کے لئے مجازی روشنی کا سبب ہے کیونکہ معشوق خورشید جمال اور ماہ طلعت ہے اس لئے اُس کا تصوّر اور خیال بھی تاریکی کو باطل کرنے والا ہے، پس دل افسردہ تو ہے، لیکن کچھ کچھ نقش خیال یار باقی ہے اس لئے چہرۂ زنداں تو ہے لیکن یوسف علیہ السلام کا، چہرۂ زنداں ہے۔

(۱۰) "تبسم ہائے پنہاں" حجاب آمیز مُسکراہٹ۔ یا شرما شرما کر چُپکے چُپکے ہنسنا۔

(۱۱) "مژگانِ سرشک آلود" پلکیں، جو آنسوؤں سے تر ہوں مطلب ہے کہ خدا جانے تیری پلکوں کو آنسوؤں میں ڈوبا ہوا دیکھ کر کس کس کا لہو پانی ہوا ہوگا، یا کس کس کی جان جاتی رہی ہوگی، کیونکہ تیرا رونا بھلا کس سے اور کس جگہ سے دیکھا جا سکتا ہے؟ ۔۔۔۔ یا ۔۔۔۔ نہ معلوم کیسے کیسے بے گناہوں اور حرماں نصیبوں کی ظالمانہ اور بے دریغ قربانی اور خون فشانی ہوئی ہوگی کہ بالآخر ظالم تیری آنکھوں میں بھی آنسو آہی گئے!!

(۱۲) "نظر میں ہے ہماری" ہماری دانست یا ہمارے خیال میں ہے، یا ہم خوب سمجھتے ہیں۔" اجزائے پریشاں" کتاب کے بے سِلے

ورق یا صفحہ۔ "عالم کے اجزائے پریشان" کائنات و موجودات یا کثیر التعداد نوعیتوں سے استعارہ ہے۔ "شیرازہ" سلائی یا جزو بندی۔ "جادہ" خط راہ۔ جادہ، سلائی، یا تاگے میں شباہت ہے مطلب یہ ہے کہ ہم جانتے ہیں، کہ دنیا کے اجزائے ممکنات (یا اشیاء اور موجودات منتشرہ و متعددہ) کے لئے، جادۂ راہ فنا، مثل شیرازہ کے ہے، یعنی سب اسی راستے سے گذرتے اور اسی خط پر جمع ہوجاتے ہیں! ——

فی الحقیقت، فنا کسی نامعلوم عالم کا دروازہ ہے، کہ ہر موجود و مرئی، محسوس و غیر مرئی شے کو بالآخر اُس میں داخل ہونا پڑتا ہے، اور سب کا داخلہ ناگزیر و یکساں اور اسی دروازہ اور ایک ہی عالم میں ہوتا ہے، پھر وہ عالم بھی کچھ ایسا کان نمک ہے، کہ سب، ایک سے، اور ایک، اور وہیں کے ہو رہتے ہیں!!

نہ ہوگا یک بیاباں ماندگی سے ذوق کم میرا
حباب موجۂ رفتار ہے نقش قدم میرا (۱)

محبت تھی چمن سے لیکن اب یہ بے دماغی ہے
کہ موج بوئے گل سے ناک میں آتا ہے دم میرا (۲)

سراپا رہن عشق و ناگزیر الفت ہستی
عبادت برق کی کرتا ہوں اور افسوس حاصل کا (۳)

بقدر ظرف ہے ساقی خمار تشنہ کامی بھی
جو تو دریائے مے ہے تو میں خمیازہ ہوں ساحل کا (۴)

(۱) "ماندگی" تھکن۔ ماندگی، دشت پیمائی، کا نتیجہ ہوتی ہے۔
اس لئے "یک بیابان ماندگی" سے ایک پیمانۂ صحرا نوردی بنالیا
ہے۔ گویا اتنی ماندگی، جو ایک بیابان کی صحرا نوردی سے
پیدا ہو "موجہ" موج۔ "حباب" تموج آب سے بے ساختہ
پیدا ہوتے ہیں اور روانیٔ آب کے لئے مانع و حارج نہیں ہوتے،
گویا روانی کے لئے وہ کسی شمار و قطار ہی میں نہیں۔ اس شعر میں
اپنی رفتار کو روانیٔ آب سے، اور نقش قدم کو حباب سے
مشابہ کہا ہے۔ مطلب ہے کہ میرے ذوق و شوق کے مقابلہ میں
ایک صحرا کی دشت پیمائی سے جو ماندگی ہو وہ ناقابل لحاظ
ہے۔ اتنی تھکن سے میرا ذوق صحرا نوردی کم نہیں ہوتا۔ گویا
میرے نقش پا حباب رفتار ہیں، جو کسی شمار میں نہیں، اور
میرے چلنے میں حارج و مانع نہیں!
(۲) یعنی مایوسی و افسردگی خاطر اس درجہ ہیں، کہ وہ چیزیں
جو کبھی مرغوب اور باعث راحت تھیں اب باعث نفرت
و کلفت ہیں!
(۳) "سراپا رہن عشق" ہمہ تن پابند و گرفتار عشق "ناگزیر"
مجبور "ہستی" زندگی۔ "حاصل" خرمن، پیداوار۔ مصرعۂ ثانی میں
عشق کو برق سے اور دنیاوی زندگی کو حاصل سے تعبیر کیا ہے۔
عشق کا اقتضاء، ترک مشاغل دنیوی ہے، اور ترک مشاغل
زندگی کے لئے، گویا ہلاکت ہے، کیونکہ "زندگی" سلسلۂ تحریکات
و مصروفیت کا نام ہے۔ مطلب ہے، کہ میں ہمہ تن گرفتار عشق بھی ہوں۔

اور زندگی کی خرابی کا بھی غم ہے، گویا اطاعت برق، اور غمِ حاصل کی کشمکش میں مبتلا ہوں!

(۹) "بقدرِ ظرف ہے" - باندازہ حوصلہ ہے، اور اس کا تعلق فیض و بخشش ساقی سے ہے۔ "خمار" نشہ کا اتار، اور طلب "خمیازہ" انگڑائی، نشہ کے اتار یا طلب کے وقت انگڑائیاں آیا کرتی ہیں "ساحل" (دریا کا کنارہ) "ساحل و خمیازہ" میں مشابہت ہے، مطلب ہے کہ میری خواہش مے نوشی، یا تشنگی شراب اسی نسبت سے ہے جتنا کہ ساقی کے فیض و بخشش کا ظرف و حوصلہ، یعنی اگر ساقی، باعتبار عطا و لطف کے دریا ہے تو میں باعتبار عطا و لطف اور تشنگی کے ساحل ہوں یعنی اس دریا کو گھیرے ہوئے ہوں، کم نہیں۔

محرم نہیں ہے تو ہی نوا ہائے راز کا	۱	یاں ورنہ جو حجاب ہے پردہ ہے ساز کا
رنگِ شکستہ صبحِ بہارِ نظارہ ہے	۲	یہ وقت ہے شگفتنِ گل ہائے ناز کا
تو اور سوئے غیر نظر ہائے تیز تیز	۳	میں اور دکھ تری مژہ ہائے دراز کا
صرفہ ہے ضبطِ آہ میں میرا وگرنہ میں	۴	طعمہ ہوں ایک ہی نفسِ جاں گداز کا
ہیں بسکہ جوشِ بادہ سے شیشے اچھل رہے	۵	ہر گوشۂ بساط ہے سر شیشہ باز کا
کاوش کا دل کرے ہے تقاضا کہ ہے ہنوز	۶	ناخن پہ قرض اس گرہِ نیم باز کا
۷		تاراجِ کاوشِ غمِ ہجراں ہوا اسدؔ سینہ کہ تھا دفینہ گہر ہائے راز کا

(۱) "محرم" واقف - آشنا۔ "نوا ہائے راز" صدا ہائے غیب۔ "حجاب" پردہ "ساز" باجہ۔ لگاوٹ "نوا" کی رعایت سے

سنا ز استعمال ہوا ہے، اور محرم و حجاب وغیرہ سب تلازما ہیں۔
"نواہائے راز" جمالِ غیب، یا جلوۂ معنی، یا حسنِ شاہدِ حقیقی سے کنایہ ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اے انسان تو غفلت شعار ہے تو ہی نظارۂ حقیقت سے محروم و نا آشنا ہے، ورنہ یہ موجودات و شواہد، جو جمالِ حقیقت کے لئے حجاب بن گئے ہیں خود دعوتِ نظارۂ غیب دے رہے ہیں۔ یا۔ کائنات کا ایک ایک ذرہ تابِ آفتابِ معنی سے معمور اور انوارِ حقیقت کے لئے وجہ عریانی ہے لیکن تیری ہی آنکھوں پر پردے پڑے ہوئے ہیں!

(۲) لطفِ دیدار، ایک کیفیت ہے۔ بہار کے موسم میں بھی لطف حاصل ہوتا ہے اور محبوب کے پھول سے چہرے کو دیکھنے سے بھی لطف پیدا ہوتا ہے، اس لئے لطف آفرینی میں چہرۂ گلابی اور موسمِ بہار دونوں ہم اثر ہیں۔ اس لئے شاعر نے اس کیفیت کو جو دیدار سے پیدا ہوتی ہے یہاں موسمِ بہار سے تعبیر کیا ہے۔ اور لفظ موسم ہی کی رعایت سے "وقت" اور "صبح" وغیرہ الفاظ استعمال کئے ہیں۔ پھر عاشق جو "بہار نظارہ" کی کیفیت بھی اُٹھاتا ہے اُس کے "رنگِ شکستہ" (اُڑا ہوا رنگ) کا استعارہ بہار کی مناسبت سے "سپیدۂ سحر" سے کیا ہے۔ اس طرح عاشق کے لطفِ دیدار اور رنگ شکستہ دونوں سے مل کر "صبح بہار نظارہ" بن گئی ہے۔ یہ وقت ہے کا اشارہ محض صبح (رنگ شکستہ) کی جانب ہے۔ اور

"شگفتن گلہائے ناز" (ناز و انداز کی گلکاریاں یا معشوق کے انداز و ناز کی گل فشانیاں) "بہار نظارہ" سے متعلق ہے، اس شعر میں دیدار محبوب کی راحت اور ناز و کرشموں کے وہ متضاد اثرات بیان کئے گئے ہیں، جن سے عاشق ایک ہی وقت میں، راحت یاب و مسرور بھی ہوتا ہے اور بے چین و مضطرب بھی، ان ہی دو متضاد حالتوں کو صبح (رنگ اُڑ جانا) اور "بہار نظارہ" (لطف دیدار) کی ترکیب میں ظاہر کیا ہے یعنی شکستن رنگ عاشق اور لطف دیدار، وقت شگفتن گلہائے ناز معشوق ہے!!

(۳) "نظر ہائے تیز تیز" جلد جلد پڑنے والی نگاہیں۔ یا تجسس آلوت نظریں "مژہ ہائے دراز" مژگاں کی خوبی درازی بھی ہے۔ جس دل میں محبت کی اہلیت نہ ہو، وہ پتھر ہے، اور شعرا دل رقیب کو ایسا ہی تسلیم کرتے ہیں۔ مطلب ہے کہ تو بار بار غیر کی طرف دیکھتا ہے اور مجھے یہ تکلیف ہوتی ہے کہ تیری مژگاں کو پتھر میں چھدنے سے دُکھ پہنچتا ہوگا۔ کیوں کہ ان مژگانِ نازک کے لئے تو نرم سا دل چاہئے، کہ آسانی سے گھر کرلیں۔ اور وہ ہمارا دل ہے جو نرم تر ین ہے۔

(۴) "صرفہ" فائدہ۔ "طعمہ" لقمہ۔ یا خوراک۔ مطلب ہے، کہ ضبط آہ ہی میرے لئے زیادہ جو وافر ایش اضطراب) مفید ہے ورنہ میرا کام تو ایک ہی آہ روح فرسا میں تمام ہو جاتے!

(۵) "شیشہ بازی"، ایک قسم کی بازی گری ہے، کہ شیشے سر پر

رکھ کر بازی گر کرتب کرتا ہے۔ گوشۂ محفل پر جوشِ بادہ سے شیشے اُچھلنے کی تشبیہ سر شیشہ بازی سے دی ہے!

(۶) تنگیٔ دل، یا افسردگیٔ خاطر، کاوش و کوشش بیجد کا تقاضہ کرتی ہے، گویا ناخنِ تدبیر پر اُس گرہ نیم باز (دل سے استعارہ ہے) کا قرض ہے!

(۷) یعنی وہ سینہ جو اسرارِ عشق، یا حقایق مخفی کے موتیوں سے لبریز اور خزانہ بنا ہوا تھا، غمِ جُدائی سے برباد ہو گیا۔

بزمِ شہنشاہ میں اشعار کا دفتر کھلا	۱	رکھیو یارب یہ درِ گنجینۂ گوہر کھلا
شب ہوئی پھر انجمِ رخشندہ کا منظر کھلا	۲	اس تکلف سے کہ گویا بتکدے کا در کھلا
گرچہ ہوں دیوانہ پر کیوں دوست کا کھاؤں فریب	۳	آستیں میں دشنہ پنہاں ہاتھ میں نشتر کھلا
گو نہ سمجھوں اُسکی باتیں گو نہ پاؤں اُسکا بھید	۴	پر یہ کیا کم ہے کہ مجھ سے وہ پری پیکر کھلا
ہے خیالِ حُسن میں حسنِ عمل کا سا خیال	۵	خُلد کا اک در ہے میری گور کے اندر کھلا
کیوں اندھیری ہے شبِ غم ہے بلاؤں کا نزول	۶	آج اُدھر ہی کو رہے گا دیدۂ اختر کھلا
کیا رہوں غربت میں خوش جب ہو حوادث کا یہ حال	۷	نامہ لاتا ہے وطن سے نامہ بر اکثر کھلا
	۸	اُسکی اُمت میں ہوں میں میرے رہیں کیوں کام بند واسطے جس شہ کے غالب گنبدِ بے در کھلا

(۱) "گنجینۂ گوہر" منبع کمالات سے استعارہ ہے۔

(۲) "انجمِ رخشندہ" چمکدار ستارے "منظر" سماں۔ "انجمِ رخشندہ کا منظر کُھلنا" تارے نکل آنا۔ بُت خانہ میں چراغاں کا منظر ہوتا ہے اور یہاں چراغانِ بُت خانہ سے منظرِ انجم کی تشبیہ مقصود ہے "تکلف" سے زیب و زینت اور شان مُراد ہے!

(۳) دیوانگی کا ایک علاج عام فصد کھولنا ہے۔ نشتر سے فصد کھولتے ہیں، اور دشنہ (خنجر) سے قتل کرتے ہیں۔ صدق و خلوص شکے تو یہ معنی ہیں کہ جان کر جان دے دی یا لے لی جائے اور منافقت کا فریب اہلِ صدق کو گوارا نہیں یہی مطلب ہے کہ اُس کے ہاتھ میں بظاہر تو نشتر ہے کہ میری دیوانگی کا علاج ہو، لیکن آستین میں خنجر چھپا ہوا ہے کہ اس بہانہ سے اس کو قتل ہی کردیں، تو میں فریب خوردگی سے کیوں جان دوں!

(۴) "پری پیکر" حسن مجسم۔

(۵) حسن، یا معشوق کا تصوّر، کیسا دلفریب، اور فردوس منظر ہے کہ قبر میں اُس کے تصوّر سے یہ معلوم ہو رہا ہے کہ گویا باغِ بہشت کا دروازہ کھل گیا ہے (مذہبی عقیدہ ہے کہ نیک عمل لوگوں کی قبر میں جنّت کی کھڑکی کھول دی جاتی ہے)

(۶) مصیبتوں کا نزول ہے، شبِ غم و ہجر کیوں اتنی تاریک ہے کیا آج ستارے بھی نہ نکلیں گے؟ اور یا ستاروں کی روشنی بالائی جانب ہی رہے گی، زمین کی طرف رُخ نہ ہوگا؟ (یا اُدھر کا اشارہ معشوق کی طرف ہے)

(۷) "حوادث" عُرفِ عام میں آفاتِ ارضی و سماوی کو کہتے ہیں۔ کُھلا ہوا خط بُری خبروں کا نشان خیال کیا جاتا ہے۔

(۸) "گنبدِ بے در" آسمان۔ "گنبدِ بے در کا در کُھلنا" واقعۂ معراج سے استعارہ ہے۔

شب کہ برقِ سوزِ دل سے زہرۂ ابر آب تھا
شعلۂ جوالہ ہر اک حلقۂ گرداب تھا

شب کہ ذوقِ گفتگو سے تیرے دل بیتاب تھا
شوخیٔ وحشت سے افسانہ فسونِ خواب تھا

واں کرم کو عذرِ بارش تھا عناں گیرِ خرام
گریہ سے یاں پنبۂ بالش کفِ سیلاب تھا

واں خود آرائی کو تھا موتی پرونے کا خیال
یاں ہجومِ اشک میں تارِ نگہ نایاب تھا

جلوۂ گل نے کیا تھا واں چراغاں آبِ جو
یاں رواں مژگانِ چشمِ تر سے خونِ ناب تھا

یاں سرِ پرشور بےخوابی سے تھا دیوار جو
واں وہ فرقِ ناز محوِ بالشِ کمخواب تھا

یاں نفس کرتا تھا روشن شمعِ بزمِ بےخودی
جلوۂ گل واں بساطِ صحبتِ احباب تھا

فرش سے تا عرش واں طوفاں تھا موجِ رنگ کا
یاں زمیں سے آسماں تک سوختن کا باب تھا

ناگہاں اس رنگ سے خونابہ ٹپکانے لگا
دل کہ ذوقِ کاوشِ ناخن سے لذت یاب تھا

غزل نمبر ۲

نالۂ دل میں شب اندازِ اثر نایاب تھا
تھا سپندِ بزمِ وصلِ غیر گو بیتاب تھا

مقدمِ سیلاب سے دل کیا نشاط آہنگ ہے
خانۂ عاشق مگر سازِ صدائے آب تھا

نازشِ ایامِ خاکستر نشینی کیا کہوں
پہلوئے اندیشہ وقفِ بسترِ سنجاب تھا

کچھ نہ کی اپنے جنونِ نارسا نے ورنہ یاں
ذرہ ذرہ روکشِ خورشیدِ عالمتاب تھا

آج کیوں پروا نہیں اپنے اسیروں کی تجھے
کل تلک تیرا بھی دل مہر و وفا کا باب تھا

یاد کر وہ دن کہ ہر اک حلقہ تیرے دام کا
انتظارِ صید میں اک دیدۂ بے خواب تھا

میں نے روکا رات غالبؔ کو وگرنہ دیکھتے
اُس کے سیلِ گریہ میں گردوں کفِ سیلاب تھا

واں ہجومِ نغمہ ہائے سازِ عشرت تھا اسدؔ
ناخنِ غم یاں سرِ تارِ نفس مضراب تھا

"برق" بجلی۔"سوزِ دل" "تپشِ قلب۔" "زہرہ" پتا۔"زہرہ آب ہونا" پست ہمت ہوجانا۔ خوف زدہ ہونا۔"شعلہ جوالہ" شعلہ لرزاں "گرداب" بھنور "واں کرم کو" یعنی کرم فرمانے، یا تشریف لانے میں۔"عناں گیرِ خرام" مانعِ خرام۔"پنبۂ بالش" تکیہ کی روئی "کفِ سیلاب" جھاگ۔"واں خود آرائی کو" یعنی اُن کے دلولۂ زینت اور سنگار کی اُمنگ کو۔"ہجومِ اشک" آنسوؤں کا تانتا "نایاب" ناپید۔"جلوۂ گل" پھولوں کی آب و تاب۔"آب جو"

نہر کا پانی۔ "خونتابہ" خونیں آنسو "سر پُرشور" دوراں زدہ، یا بے چین سر۔ "دیوارجو" دیوار ڈھونڈھنے والا "فرقِ ناز" "سرِ پُرغرور" معشوق کا سر۔ "محو بالش کمخواب" کمخواب کے تکیہ پر استراحت فرما۔ "نفس" سانس۔ یہاں آہِ آتشیں مراد ہے۔ "بساط جلوۂ گل" فرشِ گل۔ "فرش سے تا عرش" زمین سے عرشِ معلّٰے تک "طوفان" جوش و شدّہ۔ "موجِ رنگ" ولولۂ عیش و نشاط۔ "سوختن" جلنا۔ "اس رنگ" اس طرح۔ اشارہ دُوسری غزل کی جانب ہے۔ "کاوشِ ناخن" خراشِ ناخن "لذت یاب" لذّت کش (دوسری غزل کے لفظی معنی)

"سپند" کالا دانہ جو نظرِ بد کے لئے جلاتے ہیں۔ "مقدم" آنا "سیلاب" طوفانِ آب۔ "نشاط آہنگ" نغمہ سنجِ مسرّت۔ "نازش" فخر "خاکستر نشینی" ترکِ اسباب کرکے، خاک نشین ہوجانا۔ "اندیشہ" سوچ۔ فکر۔ "وقف محو" مصروف۔ "بسترِ سنجاب" قیمتی کپڑے کا یعنی معشوق کا بستر۔ "جنونِ نارسا" عشقِ محروم، یا عشقِ پنہاں۔ "روکش" مقابل۔ "دیدۂ بیخواب" وہ آنکھ جسے نیند میسّر نہ ہو، اور کھلی رہے، مُراد چشمِ عاشق سے ہے۔ "حلقۂ دام" جال کے حلقے۔ آنکھ اور حلقوں میں مشابہت ہے۔ حلقۂ دام کی عاشق کی آنکھ سے تشبیہ دیکر وجہ بیخوابی انتظار صید قائم کی ہے۔

پہلی غزل یا قطعہ کے مطالب

رات کی بارش کیا تھی، گویا برق سوزِ دل سے، خود ابر پگھل

پگھل کر، پانی ہوکر برس رہا تھا، بہنوز گردش لرزش شعلہ معلوم ہوتی تھی، اُن کو تشریف لانے میں بارش کا عذر تھا اور یہاں رونے کا ایسا طوفان تھا کہ تکیہ کی روئی کف سیلاب تھی۔ اُن کے بناؤ سنگار کی اُمنگ، بال بال موتی پرونے کے خیال میں تھی، یہاں آنسوؤں کا ایسا تار بندھا تھا کہ نگاہ پہ پانی پھر گیا تھا اور کچھ نظر ہی نہ آتا تھا۔ وہاں پھولوں کے رنگین اور تاباں عکس سے، آب جو میں چراغاں کا سماں نظر آتا تھا، یہاں دیدۂ گریاں سے اشک خون رنگ، جاری تھے۔ ہمارا سر بے خوابی سے دیوار جو تھا کہ پھوڑ ہی ڈالیں تو چین سے۔ اُن کے سرِ نازنین کمخواب کے تکیہ پر مصروفِ استراحت تھا۔ یہاں آہ شرربار گویا اس بزمِ بے خودی و بے تابی کی شمع تھی، وہاں جلسۂ احباب کے لئے پھولوں کا فرش، مسند تھا، وہاں زمین و آسمان عیش و نشاط و لونوں سے لبریز تھے، یہاں، بہر صورت جلنا تھا، آخر کار دل جو خراشش ناخن سے یعنی زخم تازہ رکھنے سے، لذت کش تھا، اس طرح اشک ہائے خونیں گرانے لگا!

دوسری غزل کے مطالب

باوجود بیتابی، رات، نالہ دل میں اثر ہی نہ تھا، اور گو دل جل رہا تھا اور رفا لیا اس کا جلنا بزمِ وصل غیر کے لئے سپند کا سا جلنا تھا۔ یعنی میرا دل، آمد طوفان سے بھی نغمہ سنج عشرت

ہے، گویا عشاق کے گھر صدائے آب سے ساز ہو جاتے ہیں (کیونکہ طبیعت عشق، اسباب ویرانی اور سرو سامان بربادی سے مانوس ہے)

"نازش" فخر۔ "ایام" دن۔ "خاکستر نشینی" سرِ راہ بیٹھ جانا۔ "پہلو" بستر کی رعایت ہے۔ "اندیشہ" خیال۔ "سنجاب" ریشم ان دونوں کی خاک نشینی اور بے سرو سامانی کے فخر و لطف کو کیا بیان کروں۔ جب کہ اُس خاک نشینی میں تصور بستر محبوب رہتا تھا۔

ہمارے ہی عشق محروم سے کچھ نہ ہو سکا۔ یا ہماری ہی رسائی اُن تک نہ ہوئی ورنہ میدان عشق کا تو ذرہ ذرہ آفتاب کی مثال تھا۔

کل تک تو آپ کا دل بھی مصدرِ مہر و وفا تھا۔ آج یہ کیا ہے کہ اپنے گرفتاران اُلفت کی خبر نہیں۔

"دیدۂ بیخواب"؟ اور "حلقۂ دام" میں تشبیہ ہے۔ استغراقیہ دیدۂ بے خواب کی رعایت ہے۔ یعنی وہ دن یاد کیجئے کہ آپ اپنی خود نمائی کی پرستش کے لئے تلاش عشاق میں بیقرار رہا کرتے تھے۔

"سیل گریہ" میں گردوں کف سیلاب تھا، اظہار و فورِ گریہ کے لئے مبالغۃً گردوں (آسمان) کو اپنے سیل گریہ کا کف سیلاب لکھا ہے۔

اب میں ہوں اور ماتمِ یک شہرِ آرزو	۲	توڑا جو تو نے آئینۂ تمثال دار تھا
گلیوں میں میری نعش کو کھینچے پھرو کہ میں	۳	جاں دادۂ ہوائے سرِ رہگزار تھا
موجِ سرابِ دشتِ وفا کا نہ پوچھ حال	۴	ہر ذرہ مثلِ جوہرِ تیغ آبدار تھا
۵	کم جانتے تھے ہم بھی غمِ عشق کو پر اب دیکھا تو کم ہوئے پہ غمِ روزگار تھا	

(۱) "ودیعت" امانت۔ مجھے آنسوؤں کی راہ خونِ جگر کا ایک ایک قطرہ اس طرح نکالنا پڑا گویا وہ خونِ جگر مژگانِ یار کی امانت تھی اور میں حساب دے رہا تھا۔

(۲) "آئینۂ تمثال دار" دل سے استعارہ ہے، جس میں ہزاروں ارمانوں کی کششیں، بے تعداد تمناؤں کے نقوش اور زمانہ بھر کی حسرتوں کی رنگ آمیزیاں ہوتی ہیں۔ اور جس کو بالفاظِ دیگر "یک شہرِ آرزو" کہنا چاہیئے۔ یعنی میں شہرِ آرزو کی بربادی کا ماتم کر رہا ہوں، کیونکہ جس دل کو تو نے مایوس و شکستہ کر دیا۔ اُس کی آبادئ آرزوہائے گوناگون، ایک بارونق شہر سے کم نہ تھی۔

(۳) تاکہ یوں ہی حسرت نکل جائے۔

(۴) "سراب" ریگِ رواں۔ جو آبِ رواں سے مشابہ ہوتی ہے۔ جوہرِ تیغ کا وصف آب اور آبدار سے کیا کرتے ہیں۔ آبدار اور سراب میں ایک تشبیہ اور رعایت پیدا ہو گئی ہے۔ "موج" اور "تیغ" میں بھی تشبیہ ہے۔ وفا کے معنی اگر عشق و محبت لئے جائیں تو مطلب ہوگا کہ صحرائے محبت کا سراب موہوم

اُمیدوں اور نہ بر آنے والی حسرتوں کا مجموعہ ہے (جن سے وہمی اور تصوری راحت تو ہوتی ہے لیکن عملی اور شہودی نہیں) اور اگر وفا سے مقصود محبوب کا اظہار وفاداری ہے تو شعر کے یہ معنی ہوں گے کہ ان کا اظہار وفاداری تشنہ کامانِ محبت کے لئے ایک موج سراب ہے جس میں تشنگی عشق کے لئے تو کوئی قطرۂ وفا نہیں لیکن جس کی آب و تاب ضرور مثلِ جوہرِ تیغ ہے۔

(۵) غمِ عشق کو ہم کم جانا کرتے تھے۔ لیکن جب وہ غم کم ہوا تو اُسکی جگہ افکارِ زمانہ نے لے لی۔

بس کہ دشوار ہے ہر کام کا آساں ہونا	۱	آدمی کو بھی میسر نہیں انساں ہونا
گریہ چاہے ہے خرابی مرے کاشانے کی	۲	در و دیوار سے ٹپکے ہے بیاباں ہونا
وائے دیوانگیِ شوق کہ ہر دم مجھکو	۳	آپ جانا اُدھر اور آپ ہی حیراں ہونا
جلوہ از بسکہ تقاضائے نگہ کرتا ہے	۴	جوہرِ آئینہ بھی چاہے ہے مژگاں ہونا
عشرتِ قتلگہِ اہلِ تمنا مت پوچھ	۵	عیدِ نظارہ ہے شمشیر کا عریاں ہونا
لے گئے خاک میں ہم داغِ تمنائے نشاط	۶	تو ہو اور آپ بہ صد رنگ گلستاں ہونا
عشرتِ پارۂ دل زخمِ تمنا کھانا	۷	لذتِ ریشِ جگر غرقِ نمکداں ہونا
کی مرے قتل کے بعد اُس نے جفا سے توبہ	۸	ہائے اُس زود پشیماں کا پشیماں ہونا
۹	حیف اُس چار گرہ کپڑے کی قسمت غالبؔ جس کی قسمت میں ہو عاشق کا گریباں ہونا	

(۱) آدمی باوجود آدمی ہونے کے اخلاقِ حسنہ (جو معیارِ انسانیت ہیں) کی جامعیت میں کوتاہ دست ہے۔ اور جبکہ وہ باوجود تقاضائے

خلقی تکمیل انسانیت سے قاصر ہے تو پھر دوسرے کاموں کا دشوار ہونا تو بدرجۂ اولیٰ قابل تسلیم ہے یعنی اس کیلئے دوسری کیا چیز آسان ہو سکتی ہے جب کہ آدمی ہونے پر آدمیت سے محروم ہے۔ اس حقیقت کو ایسے سادہ لفظوں میں کوئی بیان نہ کر سکا۔

(۲) "ٹپکنا" اور "برسنا" محاورۂ اردو میں ظاہر ہونا، یا بزبان حال کہنا کے معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔ "کاشانہ" گھر یعنی ویران ہونا میرے گھر کی بربادی چاہتا ہے کہ در و دیوار پر ویرانہ پن چھایا ہوا ہے۔

(۳) "وائے" لفظِ افسوس "ادھر" کا اشارہ محبوب کے گھر کی جانب ہے۔ مطلب ہے کہ افسوس ہے جنونِ شوق پر کہ اس کے تقاضے سے بار بار محبوب کے سامنے جاتا ہوں اور ہر بار کرشمۂ حسن دیکھ کر خود فراموش اور بے خبر ہو جاتا ہوں۔ یعنی عالمِ حیرت میں نہ شوقِ نظارہ پورا ہوتا ہے اور نہ عرضِ حال کے ہوش و حواس باقی رہتے ہیں۔

(۴) "جلوہ تقاضائے نگہ کرتا ہے" یا خوبی تحسین چاہتی ہے یا نمود و نمایش دیدار طلب ہیں۔ "جوہرِ آئینہ" وہ خطوط و نقوش جو صیقل میں ہوتے ہیں۔ "مژگاں ہونا" سے یہاں چشم شوق بننا مراد ہے۔ جوہرِ آئینہ اور مژگاں میں تشبیہ ہے۔ اور اسی تشبیہی رعایت کی وجہ سے آنکھ کے بجائے مژگاں بطور استعمال الجزء بالکل کیا ہے۔ آئینہ خود بینی و خود آرائی کے لئے دیکھا جاتا

ہے۔ خود بینی و خود آرائی سے خود پسندی اور خود نمائی بالالتزام پیدا ہوتے ہیں اور جلوہ یا آرائش و نمود کا اقتضا یا نتیجۂ لازمی یا اثرِ طبعی دیدار و نظارہ ہے اس لئے شاعر نے مبالغہ کے ساتھ اس کو جوہر آئینہ بھی چاہے ہے "مژگاں ہونا" سے تعبیر کیا ہے۔ مطلب ہے کہ گویا خود آئینہ نگاہِ شوق بننا چاہتا ہے۔

(۵) "عشرت" خوشی۔ "قتل گہ" مقتل۔ "اہل تمنا" عشاق "مت پوچھ" یعنی کیا پوچھتے ہو یا کیا بیان کریں۔ "نظارہ" دید "عید" مسرت۔ شمشیر و ہلال میں مشابہت ہے۔ ہلال کی رعایت سے عید استعمال کیا گیا ہے۔ "شمشیر کا عریاں ہونا" نیام سے نکلنا۔ یعنی مقتل میں عشاق کی خوشی کا حال کیا بیان کریں۔ اُن کو شمشیر عریاں کا دیکھنا گویا نظارہ ہلال عید ہوتا ہے۔ اگر قتل گہ اہلِ تمنا سے میدان عشق یا عالم عاشقی مراد لیا جائے تو مطلب ہوگا کہ عالم عشق کی خوشی اور عشرت کیا بیان کریں جہاں جان دینا یا قربان ہونا عید کی شادمانی کے برابر ہے یعنی دُنیائے محبت کی خوشیاں ہی نرالی ہیں جو عوام الناس کی خوشیوں سے بالکل متضاد ہوتی ہیں۔ یہاں تو جان دینا یا جان جانا سب سے بڑا دُشوار اور پُرالم سانحہ ہوتا ہے۔ اور وہاں یہ مرحلہ پیش آنا سب سے بڑی عید اور شادمانی ہے۔

(۶) "داغ لے جانا" رنج ناکامی و محرومی اُٹھانا۔ "تمنائے نشاط"

آرزوئے عیش تو ہو" ایک تنہا طب دعائیہ ہے۔ یعنی خدا کرے کہ تو "بصد رنگ" ہر طرح سے۔ رنگ و گل اور داغ میں تشبیہات ہیں۔ اردو میں بے حد مسرور اور خوش ہونے کے معنی میں باغ باغ ہونا اور دعاؤں میں پھلنا پھولنا وغیرہ استعمال کرتے ہیں۔ غالباً استاد نے اسی اعتبار سے "گلستاں" ہونا لکھا ہے۔ مطلب ہے کہ ہماری آرزو تو مرتے دم تک پوری نہ ہوئی خیر۔ تم خدا کرے ہمیشہ اور ہر طرح شادماں رہو۔

(۷) "عشرت" سرور و راحت۔ "پارۂ دل" دل کا ہر ٹکڑا (کیوں کہ عاشق کا دل پارہ پارہ مسلم) "زخم تمنا کھانا" زخم ناکامی کھانا۔ الم محرومی اٹھانا۔ "ریش جگر" ہر شگافِ جگر یا ہر زخم جگر۔ یا ایک ایک ریشۂ جگر۔ شعر میں صرف اظہار درد طلبی ہے۔

(۸) عجیب ترکیب سے یہ مضمون ادا ہوا ہے۔ "زود پشیماں"۔ اس شعر میں معجزۂ ادب ہے، جس کا مفہوم بیان نہیں کیا جا سکتا مگر ترقیٔ ذوق اور غور سے ہر شخص سمجھ سکتا ہے۔

(۹) عاشق کا گریباں ہمیشہ حوالۂ دستِ جنوں اور معرضِ کشاکش میں رہتا اور تار تار ہوا کرتا ہے۔ شاعر نے کس خوبی سے اس چار گرہ کپڑے کی قسمت پر افسوس کرتے ہوئے ہزاروں جنون خیز مصیبتوں میں مبتلا ہونے کو ظاہر کیا ہے۔

شب خمارِ شوق ساقی رُستخیز اندازہ تھا
تا محیطِ بادہ صورت خانۂ خمیازہ تھا (۱)

یکقدم وحشت سے درسِ دفترِ امکاں کھلا
جادہ اجزائے دو عالم دشت کا شیرازہ تھا (۲)

مانعِ وحشت خرامیہائے لیلےٰ کون ہے
خانۂ مجنونِ صحرا گرد بے دروازہ تھا (۳)

پُوچھ مت رُسوائی اندازِ استغنائے حُسن
دست مرہونِ حنا رخسار رہنِ غازہ تھا (۴)

نالۂ دل نے دیئے اوراقِ لختِ دل بباد
یادگارِ نالہ اک دیوانِ بے شیرازہ تھا (۵)

(۱) "خمارِ شوق" مستی اشتیاق مُراد ہے۔ "رُستخیز اندازہ" قیامت مثال (محاورہ ہے جو مبالغۃً استعمال ہوتا ہے) "محیط" لغوی معنے گھیرے ہوئے کے ہیں۔ یہاں خط جام سے مُراد ہے۔ "محیط" اور خمیازہ (انگڑائی) میں تشبیہ ہے مطلب کہ رات جلوۂ ساقی کے دیدار کا اشتیاق قیامت کا تھا کہ محیطِ بادہ بھی ایک خمیازۂ خمارِ شوق معلوم ہوتا تھا۔

(۲) "یکقدم وحشت" وحشت کا ایک قدم یا صحرائے وحشت میں بقدرِ یک قدم۔ "درس" سبق۔ "دفتر" بمعنی کتاب برعایت درس۔ "امکان" عالمِ امکان یا کائنات و موجودات۔ "درسِ دفترِ امکان کھلا" یعنے حقیقتِ عالم انکشاف ہوا۔ "جادہ" راہ۔ "اجزا" برعایت دفتر و شیرازہ استعمال ہوا ہے۔ "دو عالم

دشت" میں ترکیب مقلوب ہے۔ مقصود دشت دو عالم یا میدان و وسعتِ دو عالم۔ "دو عالم" سے مراد عالمِ اطلاق و عالمِ امکان یا عالمِ ظاہر اور عالمِ باطن و غیب یا عالمِ مجاز و عالمِ حقیقت ہے۔ مطلب ہے کہ پہلے ہی قدمِ وحشت میں عالمِ امکان کی حقیقت معلوم ہو گئی۔ گویا جنونِ عشقِ مجاز نے حقیقت تک پہنچا دیا۔ یعنی وحشتِ عشق دونوں جہانوں کے درمیان برزخ تھی۔ یا عالمِ امکان سے مراد عالمِ وجود ہے اور دو عالم کا اشارہ عالمِ وجود اور عالمِ عدم یعنی بقا اور فنا کی جانب ہے۔ مطلب یہ ہوگا کہ جادۂ عشق ایک رابطہ ہے بقا و فنا کے درمیان۔

(۳) "مانع" روکنے والا۔ "وحشت خرامیہا" دیوانہ وار آمد و رفت "صحرا گرد"۔ دشت نورد۔ "خانۂ بے دروازہ" سے مراد ویرانہ و صحرا ہے۔ یعنی نامعلوم لیلےٰ کے لئے کیا امر مانع تھا کہ عشقِ مجنوں سے متاثر ہو کر بے تابانہ مجنوں تک نہ پہنچ سکی۔ حالانکہ مجنوں کا گھر تو جنگل تھا۔ جہاں نہ در نہ دربان۔

(۴) "رسوائی"۔ ہوا خیزی۔ یہاں بے اختیاری و مجبوری مراد ہے "استغنا" بے نیازی۔ عدم حاجت مندی "حسن" خوبی و خوبصورتی "مرہون حنا" پابند حنا۔ یا مہندی لگانے کے شوق میں پابند و مبتلا "رہن غازہ" وقف غازہ۔ غازہ ایک قسم کا سفوف ہوتا ہے جو چہرہ کو خوش رنگ بنانے کیلئے لگاتے ہیں۔ مطلب ہے کیا پوچھتے ہو کہ حسن باوصف بے پروائی

وسادگی آرائش وزیبائش پر مائل تھا۔ اور درآں حالیکہ اُس کی معشوقیت عشاق سے بے نیاز تھی لیکن اُس کی آرائش کے میلان نے خودنمائی اختیار کرکے اہلِ دید کے دیدار کی رُسوائی کو گوارا کرلیا تھا۔ یا حُسن سے مُراد حُسنِ شاہدِ حقیقی یا جمالِ الٰہی ہے۔ اور انداز استغنا کا اشارہ صفتِ تنزیہہ کی جانب ہے۔ اور حنا و غازہ سے شہود۔ نمود و خلق تعبیر ہیں اور رُسوائی کے معنے ظہور۔ جلوہ ریزی وتشہیرِ عام کے ہیں۔ اب شعر کا مطلب یہ ہوگا کہ کیا کہیں حسنِ مطلق کے اطلاق و تنزیہت کی نمود و خلق کے تقیدات وتنزلات سے کیسی کچھ تشہیر ہوتی۔

(۵) "بباد داد" کا ترجمہ اُستاد نے دستے برباد کیا ہے یعنی ہوا میں اُڑا دیئے یا برباد کردیئے "دیوانِ بے شیرازہ" اور اوراق میں رعایت لفظی ہے۔ مطلب ہے کہ نالہ نے دل کو ٹکڑے ٹکڑے کرکے برباد کردیا۔ اور نالہ کے یادگار صرف پارہ ہائے دل تھے۔

دوست غم خواری میں میری سعی فرمائیں گے کیا
زخم کے بھرنے تلک ناخن نہ بڑھ آئیں گے کیا (۱)

بے نیازی حد سے گذری بندہ پرور کب تلک
ہم کہیں گے حالِ دل اور آپ فرمائیں گے کیا! (۲)

حضرت ناصح گر آئیں دیدۂ و دل فرشِ راہ
کوئی مجھ کو یہ تو سمجھا دو کہ سمجھائیں گے کیا؟ (۳)

(۴) آج واں تیغ و کفن باندھے ہوئے جاتا ہوں میں

عذر میرے قتل کرنے میں وہ اب لائیں گے کیا

گر کیا ناصح نے ہم کو قید اچھا یوں سہی
یہ جنونِ عشق کے انداز چھٹ جائیں گے کیا؟ (۵)

خانہ زادِ زلف ہیں زنجیر سے بھاگیں گے کیوں؟
ہیں گرفتارِ وفا زنداں سے گھبرائیں گے کیا؟ (۶)

ہے اب اس معمورہ میں قحطِ غمِ الفت اسدؔ
ہم نے یہ مانا کہ دلّی میں رہے کھائیں گے کیا؟ (۷)

(۱) "سعی" چارہ جوئی و علاج مراد ہے یعنی دوست غمخواری و ہمدردی سے میرا کیا علاج و مداوا کرسکتے ہیں (اگر میرے زخموں پر مرہم بھی لگائیں اور ناخن بھی کاٹ دیں) تو کیا زخموں کے اندمال تک پھر ناخن بڑھ نہ جائیں گے (اور کیا پھر میں خراشِ ناخن کی لذت کشی سے زخموں کو تازہ نہ کرلونگا) یعنی میرے مصائب کا دفعیہ ناممکن ہے میری ایذا طلبی آلام کو تازہ کرتی رہتی ہے۔

(۲) "بے نیازی" بے پروائی و بے خبری۔ تغافل۔ یعنی حضور اس بے نیازی کی بھی کوئی حد ہے کہ ہم حالِ دل بیان کرتے رہتے ہیں اور آپ سُن سُن کر اور سمجھ کر انجان بنتے ہوئے "کیا" فرماتے رہتے ہیں گویا اس طرح استفسار و استفہام ہوتا ہے کہ کچھ سنا ہی نہیں۔

(۳) "دیدہ و دل فرشِ راہ" ایک محاورہ ہے عزت کے ساتھ

استقبال کرنے کے مفہوم میں۔ مطلب ہے کہ حضرت ناصح اگر آنا چاہتے ہیں تو خوشی سے آئیں لیکن اُن کے آنے سے ہوتا ہی کیا ہے۔ کیونکہ میرا جنونِ عشق تو افہام و تفہیم کی صلاحیتوں سے گذر چکا ہے۔

(۵) "ناصح" نصیحت کرنے والا۔ یا چارہ جو۔ قید دیوانوں کیلئے علاج خیال کی جاتی ہے۔ یعنی اگر ناصح نے ہمیں پا بہ زنجیر کسی چہار دیواری میں مقید بھی کر دیا تو اس سے ہوتا ہی کیا ہے بھلا یہ جنونِ عشق کے انداز کہیں چھٹ سکتے ہیں۔ اور قید و بند سے ممکن ہے کہ جنوں خرامی اور دشت نوردی رُک جائے لیکن جنوں خیالی کس طرح جا سکتی ہے۔

(۶) "خانہ زاد" غلام۔ بندۂ یادِ خیال زلف یعنی ہم کہ بندگانِ خیالِ زلف ہیں زنجیر سے کیا گریزاں ہو سکتے ہیں اور پابندِ وفا ہو کر قید خانہ سے کیا گھبرا سکتے ہیں بلکہ یہ قیود ظاہری تو ہمارے دلی قیود کے مشابہ ہیں۔

(۷) "معمورہ" دُنیا۔ یعنی اس کائنات میں اُلفت پیشہ لوگ رہے ہی نہیں اور ہم غمِ اُلفت کے خوگر ہیں اگر دلی میں رہے تو کس طرح گذرے گی۔

یہ نہ تھی ہماری قسمت کہ وصالِ یار ہوتا
اگر اور جیتے رہتے یہی انتظار ہوتا (۱)

ترے وعدہ پر جئے ہم تو یہ جان جھوٹ جانا
کہ خوشی سے مر نہ جاتے اگر اعتبار ہوتا (۲)

تری نازکی سے جانا کہ بندھا تھا عہد بودا
کبھی تو نہ توڑ سکتا اگر استوار ہوتا (۳)

کوئی میرے دل سے پوچھے ترے تیر نیم کش کو
یہ خلش کہاں سے ہوتی جو جگر کے پار ہوتا (۴)

یہ کہاں کی دوستی ہے کہ بنے ہیں دوست ناصح
کوئی چارہ ساز ہوتا کوئی غمگسار ہوتا (۵)

رگِ سنگ سے ٹپکتا وہ لہو کہ پھر نہ تھمتا
جسے غم سمجھ رہے ہو یہ اگر شرار ہوتا (۶)

غم اگرچہ جاں گسل ہے پہ کہاں بچیں کہ دل ہے
غمِ عشق گر نہ ہوتا غمِ روزگار ہوتا (۷)

کہوں کس سے میں کہ کیا ہے شبِ غم بری بلا ہے
مجھے کیا برا تھا مرنا اگر ایک بار ہوتا (۸)

ہوئے ہم جو مر کے رسوا ہوئے کیوں نہ غرقِ دریا
نہ کبھی جنازہ اٹھتا نہ کہیں مزار ہوتا (۹)

اسے کون دیکھ سکتا کہ یگانہ ہے وہ یکتا
جو دوئی کی بو بھی ہوتی تو کہیں دوچار ہوتا (۱۰)

یہ مسائلِ تصوف یہ ترا بیان غالب
تجھے ہم ولی سمجھتے جو نہ بادہ خوار ہوتا (۱۱)

---

(۱) اس غزل کے آخری دو شعر میں غالب نے تصوف کے مضامین لکھے ہیں۔ ہمارے خیال میں مطلع بھی متصوفانہ رنگ میں ہے

"وصال" صوفیائے کرام کے عقائد میں فنا فی الذات ہونے کو کہتے ہیں۔ "جینا" گویا اپنی ہستی بحیثیت اپنے قائم رکھنا ہے اور یہ انانیت وصل و فنا فی الذات کے تناقض و منافی ہے۔ مطلب ہے۔ کہ ہماری قسمت میں وصالِ یار نہ ہوتا اگر ہم زندہ بھی رہتے تو انتظار کے سوا اور کوئی مرتبہ حاصل نہ ہوتا۔

(۲) تمہارے وعدہ پر اگر ہم جیتے رہے تو یہ سمجھو کہ ہم نے تمہارے وعدہ کو جھوٹ سمجھا کیونکہ اگر وعدہ پہ اعتبار آجاتا تو مارے خوشی کے جان نہ نکل جاتی۔

(۳) تمہاری نزاکت سے تمہارے پیمان کی کمزوری ثابت ہوتی ہے کیونکہ نازک آدمی کسی مضبوط چیز کو توڑ نہیں سکتا۔ استاد نے اس شعر میں پیماں شکنی سے لفظی فائدہ اٹھا کر نزاکت پر استدلال کیا ہے)

(۴) یعنی تیرِ نیمکش کی خلش کے مزہ کو کوئی میرے دل سے پوچھے ہر دم کی خلش سے گویا ہر خلش ایک تیر کا لطف دیتی ہے اگر تیر جگر کے پار ہو جاتا تو مزہ کا سلسلہ کیسے باقی رہ سکتا تھا۔

(۵) جناب ناصح کی دوستی بھی بھلا کوئی سود مند بات ہے جو بجائے چارہ سازی و غمگساری کے "شور پند ناصح نے زخم پر نمک چھڑکا" کے مصداق ہے۔ کاش بجائے ان کے کوئی سچا غمگسار ہوتا اور چارہ گری کرتا۔ یا۔ دوستوں کی یہ کیسی دوستی

ہے کہ تا صبح بن بیٹھے ہیں ان کو تو یہ چاہیے تھا کہ میرے
درد محبت کی کوئی دوا بتاتے۔

(۶) "رگِ سنگ" پتھر کی رگیں یا لکیریں۔ پتھر جب کسی چیز سے
رگڑا یا ٹکرایا جاتا ہے تو آتشیں چنگاریاں نکلتی ہیں اسی پہ
قیاس کیا گیا ہے کہ پتھر میں آگ پنہاں ہوتی ہے شعراء کے
یہاں غم بھی ایک حقیقتِ سوزِ پنہاں ہے جس کا نتیجہ
اشک ہائے خونی ہوا کرتے ہیں۔ شرار اور قطرات خون میں تشبیہ
ہے۔ اور سوزِ غم اور آتشِ سنگ ہم ہیئت ہیں مطلب یہ ہے کہ
یہ سوزِ غم جو ہمارے دل میں پنہاں ہے پتھر میں اگر بجائے
آگ کے ہوتا تو ہر ذرۂ سنگ سے اس قدر خون بہتا کہ
روکے نہ رکتا۔ لیکن یہ ہمارا ہی جگر ہے کہ باوجود قوی اکحس
اور غیر جامد ہونے کے ہم اس غم کے متحمل ہیں۔

(۷) "جاں گسل" جاں فرسا۔ "کہ دل ہے" کے فقرہ سے یقین ظاہر
ہوتا ہے۔ گویا کہ دل کے لئے آلام و افکار لازمی اور ضروری
ہیں۔ غمِ عشق مفہوم ہے۔ مطلب یہ ہے کہ غمِ عشق جانفرسا
ہی سہی لیکن دل کے لئے تو بہر حال کسی نہ کسی غم کا ہونا
ضروری تھا۔ پس اگر یہ غمِ عشق نہ ہوتا تو غمِ روزگار
ہوتا۔ اس لئے یہی بہتر ہوا کہ دنیا بھر کے جھگڑوں سے
چھٹے ایک مصیبت عشق ہی رہی۔

(۸) میں کس طرح اور کس سے کہوں کہ شبِ غم یا شبِ ہجر
بہت ہی بڑی مصیبت ہے۔ ایک مرتبہ اگر موت آجاتی تو میں

اس کو بہت ہی مغتنم جانتا لیکن شبِ غم ایسی بڑی بلا ہے کہ موت آتی ہی رہتی ہے اور نہیں آتی۔ گویا ہر لحظہ ایک مرگ نو میدی سے سابقہ رہتا ہے۔ اربابِ دنیا موت کو سب سے بڑی مصیبت جانتے ہیں لیکن شاعر موت پر شبِ غم کو ترجیح دیتا ہے۔

(۱۰) "یگانہ" اس شعر میں شاعر نے متصوفانہ طریقہ پر یگانگی و یکتائی سے خداوند تعالیٰ کی ذات غیب الاحدیت کی طرف اشارہ کیا ہے۔ غیب الاحدیت وہ یگانگی و یکتائی ہے جو کسی اشارۂ حسی کو قبول نہ کرے۔ کسی چیز کے سمجھنے کے لئے ایسی نسبتیں ہونا ضروری ہیں جو یا مطابق ہوں یا متضاد اور اس ذات کے لئے نہ کوئی نسبت مطابق ہے نہ متضاد کیونکہ وہ وہی ہے کہ لَیْسَ کَمِثْلِہٖ شَیْءٌ ط پس ایسی ذات کو کون دیکھ سکتا ہے۔ دیکھنے میں تو وہی چیزیں آسکتی ہیں جو ابعادِ ثلاثہ زمان و مکان اور اشارات میں مقید ہوں۔

ہوس کو ہے نشاطِ کار کیا کیا	۱	نہ ہو مرنا تو جینے کا مزا کیا؟
تجاہل پیشگی سے مدعا کیا	۲	کہاں تک اے سراپا ناز کیا کیا!
نوازشہائے بیجا دیکھتا ہوں	۳	شکایتہائے رنگیں کا گلا کیا؟
نگاہِ بے محابا چاہتا ہوں	۴	تغافلہائے تمکیں آزما کیا؟
فروغِ شعلۂ خس یک نفس ہے	۵	ہوس کو پاسِ ناموسِ وفا کیا؟
نفس موجِ محیطِ بیخودی ہے	۶	تغافلہائے ساقی کا گلا کیا؟

دماغِ عطر پیراہن نہیں ہے	۷	غمِ آوارگیہائے صبا کیا؟
دلِ ہر قطرہ ہے سازِ انا البحر	۸	ہم اُس کے ہیں ہمارا پُوچھنا کیا؟
محابا کیا ہے، میں ضامن اِدھر دیکھ	۹	شہیدانِ نگہ کا خوں بہا کیا؟
سُن اے غارتگرِ جنسِ وفا سُن	۱۰	شکستِ قیمتِ دل کی صدا کیا؟
کیا کس نے جگرداری کا دعویٰ	۱۱	شکیبِ خاطرِ عاشق بھلا کیا؟
یہ قاتل وعدۂ صبر آزما کیوں	۱۲	یہ کافر فتنۂ طاقت رُبا کیا؟

۱۳ بلائے جاں ہے غالبؔ اُسکی ہر بات
عبارت کیا اشارت کیا ادا کیا

(۱) "ہوس" خواہش۔ گوناگوں طلبوں کی بے چین کوششیں "نشاطِ کار" ولولۂ کار۔ مسرتِ سعی۔ تحریک۔ یعنی ہوس جو گوناگوں طلبوں کی مضطربانہ سعی میں مسّرت اور مزہ حاصل کرتی رہتی ہے تو حصول مطالب کی سعیِ کار سے مسرور ہونا اور ہزاروں طلبیں رکھنا جن سے زندگی گونہ پُرلطف گزرتی ہے سب کا انحصار مرنے کے خیال پر ہے کیوں کہ بے تعداد خواہشات میں ہر لحظہ اِس لئے عزّت کی جاتی ہے کہ زندگی چند روزہ ہے جو ہو سکتا ہے وہ اسی زندگی میں ہو جائے۔ اور پھر گرمیٔ مطالب ہی سے چونکہ مسّرت حاصل ہوتی رہتی ہے اور یہ مسّرت بالفعل، بالواسطہ اس خیال سے متعلق ہوتی ہے کہ زندگی چند روزہ ہے یعنی مرنا قریب و ضروری ہے۔ پس "سرمایۂ عشرتِ حیات مرنے پر منحصر ہے"۔

(۲) "تجاہل پیشگی" جان کر انجان بننا "سراپا ناز" ہمہ تن نخوت و غرور

یعنی اے جانِ جہاں آپ کا اس تجاہل سے کیا مدعا ہے کہ میری ہر بات پر استفہاماً "کیا کیا" فرمادیا کرتے ہیں (گویا سب کچھ سنتے ہیں اور اُڑا دیتے ہیں) آخر کب تک یہ شوخی ہوتی رہے گی۔

(۳) "نوازشہائے بیجا" غیر متوقع التفات۔ "شکایتہائے رنگیں" شوخیوں کی شکایتیں یا دلچسپ شکایتیں۔ یعنی آپ کے التفات غیر متوقع کی خوشی میں بھلائیں گذشتہ بے مہریوں کی کیا شکایت کروں۔

(۴) "بے محابا" بے حجاب و بے تکلف۔ "تمکیں آزما" خودداری آزمانے والے یعنی میں تو آپ کی نگاہ بے حجاب (جس کا اثر یہ ہونا چاہیئے کہ خود مجھ پر کیفیت بیخودی طاری ہو جائے) کا طالب ہوں مدعیٔ صبر و شکیب نہیں۔ بلکہ طالب فراوانیِ بیخودی ہوں پس آپ کا تغافل بے محل ہے۔

(۵) "فروغ" بمعنی عروج۔ یہاں قیام و ثبات مفہوم ہے۔ "شعلۂ خس" تنکا جلنے سے جو شعلہ پیدا ہو۔ "یک نفس" ایک سانس کا وقفہ۔ ایک لمحہ کی مدت۔ "ناموس" شعار و حرمت راز۔ "وفا" مراداً عشق و محبت۔ "ہوس" غرض۔ خواہش۔ اور یہاں اہل ہوس مراد ہیں یعنی اہل ہوس و خواہش کو استقامتِ عشق سے کیا سروکار۔ اُن کا جوش اور اظہار محبت تو شعلۂ خس کی طرح ہے۔ وہ شعلۂ شمع کی طرح دیرپا نہیں ہوتا لہذا اہل ہوس کو ناموسِ وفا کا لحاظ کب

ہو سکتا ہے۔

(۶) "نفس" سانس۔ "محیط" بحر ذخّار۔ "بے خودی" بے خبری و مدہوشی۔ عدم تعقل و بطلانِ حس۔ سانس کی آمد و رفت اور تموج دریا میں تشبیہ ہے اسی تشبیہ سے شاعر نے انتہائے بیخودی کو تمثیل کیا ہے۔ مطلب ہے کہ یہاں تو ایسی بے خبری اور عالم فراموشی کی کیفیت طاری ہے کہ سانس (جو ایک لازمۂ حیات ہے) موجِ محیط بے خودی سے زیادہ وقعت نہیں رکھتا یعنی مجھ میں متقاضیات۔ حیات کا کوئی شائبہ باقی نہیں اور میری زندگی بھی گویا ایک جزوِ بے خودی ہے۔ ایسی صورت میں بھلا ساقی کے تغافل کا شکوہ کیا ہو سکتا ہے یا اب کس کو ہوش ہے کہ ساقی کی بے التفاتی کا گلہ کرے ہم تو نشاط و سرورِ عشق سے ایسے سرشار ہیں کہ خود ہماری زندگی ایک حرکتِ مستی و بے خبری ہو گئی ہے۔ پھر ساقی سے شکوہ کون کرے اور کیا کرے!

(۷) "دماغ" محاورہ میں بمعنی برداشت یا خواہش یا ضبط۔ "عطرِ پیراہن" خوشبوئے لباس۔ یعنی ہمیں تو خوشبوئے لباس سے شامہ نوازی کی تاب ہی نہیں۔ بادِ صبا کی بیرخی کا کیا غم۔ اب صبا جہاں چاہے اُن کے پیرہن معطر کی خوشبو کو پریشان کرتی پھرے۔

(۸) "ساز" باجہ۔ "نغمہ" صدا۔ "انا البحر" کے لفظی معنی ہیں دریا ہوں لیکن اس کے مفہوم کا لطف منصور کے واقعہ اور اُن کی

انا الحق سرائی کے بالمقابل حاصل ہوتا ہے اور شاعر نے اُسی مفہوم میں استعمال کیا ہے۔ مطلب ہے کہ ہر قطرہ کے دل میں انا الحق کا نغمہ یا جذبہ (کیونکہ وفور جذبات سے بھی بے ساختہ صدائیں نکل جاتی ہیں) موجود ہے اسی طرح ہم اُس "ذات واحد الوجود) کے ہیں ہمارا حال ظاہر ہے۔ یا اللہ اگر ہمارا کیا کہنا ہم تو اُس کے ہیں" دل سے مُراد وہ مضغہ گوشت اور مرکز شریانات نہیں بلکہ صوفیائے کرام کے یہاں مرکز حقیقت کو دل کہتے ہیں اب شعر کا مفہوم زیادہ واضح ہو گیا یعنی ہر ایک قطرے کی حقیقت (دل) ہی نغمۂ انا البحر ہے، اسی طرح ہماری حقیقت بھی انا الحق ہے، لہٰذا ہم کو کیا پوچھتے ہو ہم تو اُس ذات واحد الوجود کے ہیں۔

(۹) "محابا" رکاوٹ۔ پس و پیش۔ یعنی آپ کو عبث پس و پیش ہے میں ضامن (یعنی میرا ذمہ) آپ بلا تکلف میری طرف نظر کیجئے۔ اگر میں قتیل نگاہ ہو بھی جاؤں تو شہیدانِ نگاہ کا تو کچھ خوں بہا ہوتا ہی نہیں۔ اگر تلوار سے قتل کرتے تو قتل کا الزام ہو سکتا تھا اور خوں بہا دینا پڑتا، لیکن نگاہوں کے مقتول نہ الزام دے سکتے ہیں نہ خوں بہا کا موقع۔

(۱۰) "غارتگر جنس وفا" بے وفا، بے مہر یہاں وفا کی بے قدری کرنے والا مراد ہے۔ "شکست قیمت" قیمت شکستن سے ماخوذ ہے جس کے معنی قیمت گھٹانا اور قیمت کم کر دینا ہیں۔

لفظ "شکست" "دل" سے بھی مناسبت رکھتا ہے کیونکہ محاورہ میں "دل شکنی و دل شکستگی" وغیرہ مستعمل ہیں۔ اور لفظ "قیمت" "جنس" کی رعایت کی وجہ سے لاتے ہیں۔ اور لغوی طور پر "شکست" کے ساتھ "صدا" بھی معتبر ہے۔ "غارتگرے جنس وفا" اور "شکستنِ قیمت دل" ہم مفہوم ہیں۔ شکستہ دلانِ عشق ہمیشہ فریاد و نالہ کرتے رہتے ہیں یہی گویا آوازِ شکستِ دل ہے شعر کا مطلب یہ ہے کہ اے ناشناسِ قدرِ وفا، تیری اس بے مہری اور نا قدر شناسی سے دل کے ٹکڑے ہو گئے ہیں ذرا ہماری فریاد سن تو لے۔

(۱) "جگرداری" ضبط۔ تحمل۔ صبر۔ ہمت۔ "شکیب" صبر۔ تسکین یعنی ہمیں دعوئ ضبط ہی نہیں کیونکہ ظاہر ہے کہ عاشقانِ مضطر کی تسکین خاطر ممکن ہی نہیں۔

(۲) "قاتل" معشوق۔ "صبر آزما" امتحان ضبط کا طریقہ یا ایسا طرزِ عمل جو دیر طلبی و دیر آشنائی کا ہو۔ "کافر" قاتل معشوق۔ "طاقت رُبا" شکیب و ہمت شکن۔ "فتنۂ طاقت رُبا" "وعدۂ صبر آزما" کی صفت بھی ہے یعنی امتحان صبر و ضبط کی شرط کے ساتھ جو وعدہ کیا جا رہا ہے وہ اور بھی زیادہ بیقرار و مضطرب کر دینے والا ہے۔ اب تک بیقراری ارمان تھی اب تمنا بر آنے کے وقت کا انتظار بھی ہو گا۔ اور بے چینی بڑھ جائیگی اور یوں ہی یہ وعدۂ صبر آزما فتنۂ طاقت رُبا ہو جائیگا اور اگر "صبر آزما" معشوقوں کے عام وعدوں کی مسلمہ صفت کی

طرح استعمال ہوا ہے۔ تو شعر کا مطلب یہ ہوگا کہ آپ جب جب وعدہ کرتے ہیں اس سے تو بجائے سکون کے اضطراب ہوتا ہے پالیں اس وعدہ سے کیا فائدہ یہ تو وعدہ نہیں بلکہ ایک فتنہ ہے جس سے رہی سہی ہمتِ ضبط بھی جاتی رہتی ہے یا ایسے جھوٹے وعدہ سے فائدہ ہی کیا جو آتشِ شوق میں ایک اشتعال پیدا کر دے۔

(۱۳) "عبارت" و "اشارت" ادا لفظ "ہر بات" کے توضیحات ہیں۔

درخورِ قہر و غضب جب کوئی ہم سا نہ ہوا ۱ پھر غلط کیا ہے کہ ہم سا کوئی پیدا نہ ہوا
بندگی میں بھی وہ آزادہ و خودبیں ہیں کہ ہم ۲ الٹے پھر آئے درِ کعبہ اگر وا نہ ہوا
سب کو مقبول ہے دعویٰ تری یکتائی کا ۳ سامنے کوئی بتِ آئینہ سیما نہ ہوا
کم نہیں نازشِ ہمنامیِ چشمِ خوباں ۴ تیرا بیمار برا کیا ہے گر اچھا نہ ہوا
سینے کا داغ ہے وہ نالہ کہ لب تک گیا ۵ خاک کا رزق ہے وہ قطرہ کہ دریا نہ ہوا
ہر بُنِ مو سے دمِ ذکر نہ ٹپکے خونناب ۶ حمزہ کا قصہ ہوا عشق کا چرچا نہ ہوا
نام کا ہے مرے وہ دُکھ جو کسی کو نہ ملا ۷ کام میں میرے ہے وہ فتنہ کہ برپا نہ ہوا
قطرہ میں دجلہ دکھائی نہ دے اور جزو میں کل ۸ کھیل لڑکوں کا ہوا دیدۂ بینا نہ ہوا

تھی خبر گرم کہ غالب کے اڑیں گے پرزے
۹
دیکھنے ہم بھی گئے تھے پہ تماشا نہ ہوا

(۱) "درخور" سزاوار مستوجب۔ یعنی خواہ مقہور ہونے ہی میں کیوں نہ ہوں اس میں کوئی شک نہیں کہ ہم بے مثل ہیں اور الفاظ "قہر و غضب" کو اگر شاعرانہ اصطلاحات میں تحویل کیا جائے تو

جفا و ستم محبوب کا مفہوم پیدا ہوگا - اور محبوب کا شدّت و خصوصیت کے ساتھ مائل بہ جفا ہونے عاشق ہونا ایک امتیاز خاص ہے مطلب ہے کہ کسی قسم کی خصوصیت کیوں نہ ہو ہم اُس سے خصوصیت خاص رکھتے ہیں - اور یہی ہماری بے مثلی کی دلیل ہے -

(۲) "بندگی" عبادت و پرستش (جس کا اقتضا پابندی و بیچارگی ہوتا ہے) یعنی ہم بندگی میں بھی آزاد منش اور خوددار ہیں - کہ در کعبہ اگر کھلا نہ ہو تو ہم واپس ہی چلے آئیں اور اصل میں یہاں اپنی خودداری کے پردہ میں کعبہ کی عظمت بیان کی ہے کیونکہ وہ کعبہ ہی کیا اور وہ آستانہ کس کام کا جس کا دروازہ کبھی بند ہو جاتے - ہم تو ایسے بڑے آستانہ پر سر جھکاتے ہیں جس کا باب فیض ہمیشہ کھلا رہتا ہے -

(۳) "بت" معشوق "آئینہ سیما" حسن معشوق کی صفت صاف عکس پذیر مصنوع صانع کی اور مخلوق خالق کی دلیل ہے - مخلوق میں خالق کی خالقیت کا پرتو ہوتا ہے اور ہر مخلوق کی ہیئت خلقت عین صفت خالق ہے - شعر میں تخاطب معشوق حقیقی سے ہے جو خالق و صانع حسن مجازی بھی ہے - صفت آئینہ سیما سے مطلب اور زیادہ واضح ہو جاتا ہے یعنی اے جانِ جہاں، دُنیا بھر کے حسینوں کو تیری بے مثلی و فردانیت حسن کا اعتراف ہے (یعنی سب میں تیرا ہی عکس نظر آتا ہے) اور دُنیا کا کوئی حسین تیرا مدمقابل

نہیں ہو سکتا۔ بلکہ سب کے حسن میں صرف تیرا ہی جمال پرتو فگن ہے اور یہی انعکاس تیرے دعوئے یکتائی کی مقبولیت عام ہے۔

(۴) "نازش" فخر۔ متوالی آنکھوں کو لفظ بیمار سے متصف کرتے ہیں۔ شاعر نے بیماریٔ عشق و بیماریٔ حسن کو لفظاً ہم ردیف کرکے ایک بات نکالی ہے۔

(۵) پانی کا قطرہ اگر دریا میں مل جاتے تو دریا ہو جاتا ہے اور اگر خاک پر گرتا ہے تو اپنی ہستی کھو کر صرف ایک سرسری نشان چھوڑ دیتا ہے۔ اُستاد نے نالہ کو بھی اسی مثال سے تمثیل کیا ہے یعنی جو نالے روک لئے جاتے ہیں اور کھینچے نہیں جاتے وہ کوئی اثر پیدا نہیں کرتے سوائے اس کے کہ دل پر داغ ڈال دیں۔

(۶) داستان امیر حمزہ واقعیت نہیں رکھتی اس لئے اُس کے رزم بزم اثر سے خالی ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ عشق ایسی جھوٹی کہانی نہیں کہ اس کے المناک واقعات رُلا نہ دیں۔

(۷) "نام کا میرے ہے" یعنی میری قسمت میں ہے۔ "کام میں میرے ہے" یعنی میرے درپے ہے۔

(۸) "دجلہ" عراق کے ایک دریا کا نام ہے لیکن یہاں اسم نکرہ کی طرح استعمال ہوا ہے۔ مصرعہ اولیٰ میں استفہام انکاری ہے اور اس قسم کا استفہام تاکید اثبات کے لئے استعمال کرتے ہیں۔ ہر قطرہ دریا سے اور جزو اپنے کل سے نسبت رکھتا ہے۔

اس طرح ہر قطرہ دریا کے لئے اور ہر جزو اپنے کل کے لئے مقیاس ہوتا ہے یا ہر قطرہ مظہر دریا اور ہر جزو مظہر کل ہوا کرتا ہے۔ اسی حقیقت پر تاکید کرتے ہوئے شعر میں مسئلہ وحدت الوجود کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ اور اس کی توضیح اس سے پہلے والی غزل کے ایک شعر میں اس طرح ہو چکی (دل ہر قطرہ ہے ساز انا البحر۔ ہم اس کے ہیں ہمارا پوچھنا کیا)

اسد ہم وہ جنوں جولاں گدائے بے سر و پا ہیں (۱)	کہ ہے سرپنجۂ مژگانِ آہو پشت خار اپنا

(۱) یہ شعر رعایات لفظی۔ تشبیہات اور مبالغوں سے شاندار ہو گیا ہے۔ خیال کچھ ادق اور عالی نہیں "جولانی" "آہو" "گدا" "پشت خار" "سرپنجہ" "بے سر و پا" میں لفظی تلازمات و رعایات ہیں "پنجۂ مژگاں" اور خار میں تشبیہ ہے "جنوں جولاں" وحشت خرام دیوانہ وار دوڑنے والا "گدا" فقیر بے خانماں' بے ٹھکانے "پشت خار" ایک خاص قسم کی ایک پایہ کی نشست ہوتی ہے جس کو اکثر فقرا اپنے ساتھ رکھتے ہیں اور چلتے چلتے اگر کہیں دم بھر کو بیٹھنا چاہتے ہیں تو اس کے سہارے بیٹھ جاتے ہیں "بے سر و پا" بے ٹھکانے یعنی چلے جا رہے ہیں اور ٹھیرنے مقام کرنے یا منزل سے بے خبر و بے غرض ہیں۔ دوسرا پورا مصرعہ۔ ایک مبالغہ ہے۔ مطلب یہ ہے کہ ہم گدایانِ عشق بلا قیام و آرام دیوانہ وار ایسے تیز چلے جا رہے ہیں کہ ہرن جو چوکڑیاں بھرتے ہیں ان کی نگاہیں بھی ہماری رفتار تک نہیں پہنچتیں اور ایسے تیز رو جانور کی پلکیں ہمارے لئے

پُشت خار سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتی ہیں گویا اُن کی لگا ہونگی رفتار ہمارے ٹھیرنے کے برابر ہے۔

سپے نذرِ کرم تحفہ ہے شرم نارسائی کا
بخوں غلطیدۂ صد رنگ دعوئے پارسائی کا (۱)

نہ ہو حسنِ تماشا دوست رُسوا بے وفائی کا
بہ مہرِ صد نظر ثابت ہے دعویٰ پارسائی کا (۲)

زکوٰۃ حسن دے اے جلوۂ بینش کہ مہر آسا
چراغِ خانۂ درویش کاسہ ہو گدائی کا (۳)

نہ مارا جان کر بے جرم، قاتل تیری گردن پر
رہا مانندِ خونِ بے گنہ حق آشنائی کا (۴)

تمنائے زباں محوِ سپاسِ بے زبانی ہے
مٹا جس سے تقاضا شکوۂ بے دست و پائی کا (۵)

وہی اک بات ہے جو یاں نفس واں نکہتِ گل ہے
چمن کا جلوہ باعث ہے مری رنگیں نوائی کا (۶)

دہانِ ہر بُتِ پیغارہ جو زنجیرِ رسوائی
عدم تک بیوفا چرچا ہے تیری بے وفائی کا (۷)

نہ دے نامے کو اتنا طول غالبؔ مختصر لکھ دے
کہ حسرت سنج ہوں عرضِ ستمہائے جُدائی کا (۸)

(۱) "سپے" برائے "کرم" رحمتِ الٰہی "شرم" شرمندگی "نارسائی" محرومی ناکامی "بخوں غلطیدہ" مراد تو صرف خون شدہ ہے لیکن "دعوے" کو شئیت دینے اور وجود خارجی کی طرح

بیان کرنے کی وجہ سے بخون غلطیدہ کہا گیا ہے "صدر رنگ" سینکڑوں طرح سے ہزاروں طریقوں سے مطلب ہے کہ میں بارگاہ رحمت الٰہی میں نذر گذراننے کے لئے اُس دعویٰ پرہیزگاری کی شرمندگی لے کر جاتا ہوں جس کا ہزاروں طریقوں سے خون ہوا ہے اور رنگ کے معنی شوق کے بھی آتے ہیں اِس لئے یہاں رنگ و شوق سے مراد رندی و سیہ کاری بھی ہو سکتی ہے۔ اس صورت میں بھی مطلب یہی ہوگا کہ وہ دعوئے پارسائی جس کا سیکڑوں سیہ کاریوں نے خون کر دیا ہے بارگاہِ رحمت میں نذر کرنے کے واسطے لئے جاتا ہوں۔

(۲) "حسن" محبوب "تماشا دوست" تماشا پسند یا خودنما۔ "رسوا" مشہور یا مشہور بہ ذم یا بدنام بہ تعلقات رقیب۔ مہر و نظر میں تشبیہ ہے۔ "صد نظر" سیکڑوں نظریں اور ہزاروں نگاہیں یعنی وہ حسنِ خود نما اپنے عاشق سے بیوفائی کرنے میں رسوا کیوں ہو اُس کی خودنمائی اور عالم آشنائی سے جس قدر نگاہیں اُس پر پڑتی ہیں ہمارے نزدیک تو ہر نظر اُس کے دعوئے پارسائی پر گویا مہر ہوتی ہے۔

(۳) "جلوۂ بینش" مرکزِ عقل و فکر، معشوق حقیقی سے خطاب وسوال ہے۔ "مہر آسا" آفتاب کی طرح۔ "کاسۂ دل" سے استعارہ ہے۔ رکات و درویش رعایات ہیں۔ مطلب ہے کہ اسے نظر گاہِ اہلِ بصیرت! اگر تو اپنا یہ۔ تو نور و جمال فیضانِ آفتاب

کی طرح دل پر نکات حسن سمجھ کر ڈال دئے تو یہ کاسۂ دریوزۂ عشق (دل) ظلمت خانۂ انسانیت کے لئے چراغ انوار قدس ہو کر سارے گھر کو روشن و منور کر دیتے!

(۴) "آشنائی" عشق و محبت - یعنی تو نے ہم کو مجرم الفت (کیونکہ عشاق عدالت حسن میں مجرم ہی گردانے جایا کرتے ہیں) نہ جان کر قتل نہ کیا اور حق دوستی اسی طرح تیری گردن پر رہ گیا جس طرح خون بے گناہ۔

(۵) "سپاس" تعریف - بے دست و پائی "مجبوری - یعنی بے زبانی کے سبب شکوۂ مجبوری کا تقاضا باقی نہ رہا۔ اس لئے گفتگو کی آرزو اس بے زبانی کی ثنا خواں ہے - جس کی وجہ سے شکوۂ بے بسی کا تقاضہ مٹ گیا۔

(۶) "نفس" سانس - روح "نکہت" ہوا ریح ریح اور روح ایک ہی مادہ کے الفاظ اور ہوا اور سانس ایک ہی حقیقت کی دو موجیں ہیں "نکہت گل" پھولوں میں بسی ہوئی ہوا "رنگیں نوائی" شوق سنجی - جس طرح پھولوں میں بس کر ہوا میں ریحانیت و لطافت پیدا ہو جاتی ہے اسی طرح رونق چمن دیکھ کر روح مسرور ہوتی ہے اور روح کی کیفیت سرور سے اشتیاق نوائی پیدا ہونا اور جذبات کی برانگیختگی وغیرہ یقینی امور ہیں پھر علت دونوں کی ایک ہی ہے یعنی ہوا کی لطافت بھی پھولوں سے ماخوذ ہوتی ہے اور روح کی مسرت بھی جلوۂ گل سے - اسی خیال کو اُستاد نے اس شعر میں ادا کیا ہے - کہ بات ایک ہی ہے جس کے

اثرات مختلف ہیں۔

(۷) "دہان" دہن، منہ۔ دہن کی شکل حلقہ نما ہوتی ہے اور زنجیر بھی حلقوں سے بنتی ہے۔ "پیغارہ جوئی" طعنہ زنی حسینوں کے دہن کو شعرا کے یہاں معدوم کہا جاتا ہے اور اصطلاح عوام میں دوسرے جہاں کو عدم یا ملک عدم کہتے ہیں۔ اس شعر میں یہی لفظی رعایت ہے۔ مطلب ہے کہ اے بے وفا تیری بے وفائی کا چرچا اس جہان سے لے کر اس جہان تک ہے کیونکہ سارے حسین تجھ پر طعنہ زنی کرتے ہیں۔ گویا حسینوں کی لب کشائی سے حلقہ دہان کی ایک زنجیر رسوائی بن گئی ہے جس کا سلسلہ عدم سے ملتا ہے۔

(۱)
گر نہ اندوہِ شبِ فرقت بیاں ہو جائے گا
بے تکلف داغِ مہ مہر دہاں ہو جائے گا

(۲)
زہرہ گر ایسا ہی شام ہجر میں ہوتا ہے آب
پرتوِ مہتاب سیلِ خانماں ہو جائے گا

(۳)
دل کو ہم صرفِ وفا سمجھے تھے کیا معلوم تھا
یعنی یہ پہلے ہی نذرِ امتحاں ہو جائے گا

(۴)
سب کے دل میں ہے جگہ تیری جو تو راضی ہوا
مجھ پہ گویا اک زمانہ مہرباں ہو جائے گا

(۵)
گر نگاہِ گرم فرماتی رہی، تعلیم ضبط
شعلہ خس میں جیسے، خوں رگ میں نہاں ہو جائے گا

(۶) باغ میں مجھکو نہ لے جا ورنہ میرے حال پر

ہر گل تر ایک چشمِ خونفشاں ہو جائے گا

فائدہ کیا، سوچ آخر تو بھی دانا ہے اسدؔ
دوستیِ ناداں کی ہے جی کا زیاں ہو جائیگا (۷)

(۱) "اندوہ" رنج و غم۔ اس شبِ فرقت کے اندوہ کی جانب اشارہ ہے جو شبِ ماہ بھی تھی اور اہلِ شوق و شعراء کے یہاں شبِ ماہ محرکاتِ جذبات میں سے ہے مطلب ہے کہ اگر اُس شبِ ہجر کا سوز و غم بیان ہو سکے تو یہ سمجھنا چاہیئے کہ چاند کا داغ مُہرِ دہن ہو گیا ہے۔

(۲) "زہرہ آب ہونا" پتّا پانی ہونا جس کا مطلب ہے خوف و دہشت سے عرق عرق ہونا۔ یہاں شاعر نے لفظ "آب" میں سیل کی رعایت ملحوظ رکھی ہے۔ نیز آب اور پرتو مہتاب میں تشبیہ بھی ہے یعنی شامِ ہجر اگر ایسی بلائے بد ہے کہ زہرہ آب ہوتا ہے تو یقیناً (چاندنی) خانماں عاشق کے لئے سیلاب بن جائیگی۔

(۳) "صرفِ وفا" یعنی جو وفاداری کی تمام مہمات کے لئے کافی ہو۔ مطلب ہے کہ دل کو تو ہم تمام عمر کی عشق بازی کے لئے کافی سمجھتے تھے لیکن یہ نہ معلوم تھا کہ ایک ہی امتحانِ عشق میں جاتا رہے گا۔

(۴) یعنی سارے زمانہ کے دل میں تیری محبت ہے تو اگر مجھ سے خوش ہو جائے تو ہر شخص مجھ پر مہربان ہو جائیگا۔ کیونکہ جب میں تیری رضا کا جزو بن جاؤں گا تو تیرے عام

رضا تو میری بھی رضا جوئی کریں گے۔

(۵) "نگاہ گرم" غصہ کی نظر "شعلہ و گرم" میں مناسبت کی رعایت ہے "خوں و شعلہ" میں تشبیہ ہے "خس" تنکا۔ تنکے میں اشتعال و آتشین مادہ پنہاں ہوتا ہے مطلب ہے کہ اگر آپ کی نظر عتاب یا اشارہ و تاکید ضبط کرتی رہی اور خونابہ فشانی سے روکتی رہی تو یہ خون جو آنکھوں سے بہتا ہے رگوں میں اس طرح پنہاں ہو جائے گا جس طرح تنکے میں شعلہ۔ اور کبھی نہ کبھی جسم کو پھونک دے گا۔

(۶) "چشم و گل" رنگ گل اور خون میں تشبیہات ہیں۔

درد منت کش دوا نہ ہوا	۱	میں نہ اچھا ہوا برا نہ ہوا
جمع کرتے ہو کیوں رقیبوں کو	۲	اک تماشا ہوا گلا نہ ہوا
ہم کہاں قسمت آزمانے جائیں	۳	تو ہی جب خنجر آزما نہ ہوا
کتنے شیریں ہیں تیرے لب کہ رقیب	۴	گالیاں کھا کے بے مزا نہ ہوا
ہے خبر گرم اُن کے آنے کی	۵	آج ہی گھر میں بوریا نہ ہوا
کیا وہ نمرود کی خدائی تھی	۶	بندگی میں مرا بھلا نہ ہوا
جان دی، دی ہوئی اُسی کی تھی	۷	حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا
زخم گر دب گیا لہو نہ تھما	۸	کام گر رُک گیا روا نہ ہوا
رہزنی ہے کہ دل ستانی ہے	۹	لے کے دل دلستاں روانہ ہوا

کچھ تو پڑھئے کہ لوگ کہتے ہیں آج غالبؔ غزل سرا نہ ہوا	۱۰

(۱) "درد" دردِ عشق غمِ عشق "منت کش" احسان پذیر احسان مند

تیں نہ اچھا ہوا" یعنی میں درد الفت سے شفایاب نہ ہوا بُرا نہ ہوا یعنی اچھا ہوا کہ احسانِ دوا نہ اُٹھایا" شعر صاف ہے بیساختہ ہے۔ رواں ہے اور ذوقِ شاعرانہ سے پُر ہے۔

(۲) میرے شکوہ و شکایات کے لئے اغیار کو کیوں جمع کرتے ہو۔ گلہ کوئی تماشا تو ہے نہیں کہ مجمع کے سامنے ہو۔

(۳) "خنجر آزما" تلوار کو آزمانے والا۔ یعنی جان ستاں۔ مطلب ہے کہ پھر ہم اپنی قسمتِ وفا آزمانے کہاں جائیں۔ جب کہ تجھ جیسا قابل خنجر آزمائی میں ہمارا امتحانِ وفا نہیں لیتا۔

(۴) اوصافِ محبوبیت میں سے شیریں لبی بھی ایک مسلم وصف ہے "بے مزہ" بددل۔ برداشتہ خاطر" مزہ اور شیریں" میں رعایت ہے۔ مطلب ہے۔ تیرے لب کس قدر شیریں ہیں۔ کہ گالیوں اور تلخ کلامیوں سے رقیب ذرا بھی افسردہ خاطر نہ ہوا۔

(۵) انتہائے بے سرو سامانی کا اظہار ہے۔ اور عشاق ایسے ہی بے سرو سامان ہوتے بھی ہیں۔

(۶) "نمرود" خدائے باطل۔ یعنی میں باوجود فرمانبرداری اس بت کی بارگاہ سے فیض یاب و متمتع نہ ہوا تو اُس کی خدائی بھی نمرود کی سی خدائی تھی۔

(۷) حق و فرض دو لازم و ملزوم خصوصیتیں ہیں۔ فرض سے حق قائم ہوتا ہے اور حق سے فرض آتا ہے۔ یہاں پہلا لفظ حق سچے کے معنی میں اور دوسرا فرض کے لازمہ میں استعمال

ہؤا ہے۔ مطلب یہ ہے۔ کہ اگر ہم نے خدا کی راہ میں جان بھی دیدی پھر بھی ہم سے پورا فرض ادا نہ ہؤا۔ کیونکہ جان تو انہی کی دی ہوئی شے ہے۔ اور کسی کی امانت واپس کر دینا یقیناً کوئی ذاتی ایثار نہیں ہے۔

(۸) "کام و زخم" کے رُک جانے کا تقابل کر کے لفظی رعایت سے کام لیا ہے یعنی کام رُک جانے سے تو حاجت روائی ہوتی نہیں زخم دبنے سے خون رواں ہو جاتا ہے۔

(۹) "دل ستانی" دل لینا۔ مطلب ہے کہ وہ دل لے کے چپکے سے چلتے ہوئے "تو محبت کوئی رہزنی تو نہیں۔ چاہئے تھا کہ دل لیکر دلداری اور دلدہی سے کام لیتے۔

گلہ ہے شوق کو دل میں بھی تنگیٔ جا کا	۱	گہر میں محو ہوا اضطراب دریا کا		
یہ جانتا ہوں کہ تو اور پاسخ مکتوب	۲	مگر ستم زدہ ہوں ذوق خامہ فرسا کا		
حنائے پائے خزاں ہے بہار اگر ہے یہی	۳	دوام کلفت خاطر ہے عیش دنیا کا		
غم فراق میں تکلیف سیر باغ نہ دو	۴	مجھے دماغ نہیں خندہ ہائے بیجا کا		
ہنوز محرمیٔ حسن کو ترستا ہوں	۵	کرے ہے ہر بن مو کام چشم بینا کا		
دل اس کو پہلے ہی ناز و ادا سے دے بیٹھے	۶	ہمیں دماغ کہاں حسن کے تقاضا کا		
نہ کہہ کہ گریہ بمقدار حسرت دل ہے	۷	مری نگاہ میں ہے جمع و خرچ دریا کا		

۸ فلک کو دیکھ کے کرتا ہوں اُس کو یاد اسدؔ
جفا میں اُس کی ہے انداز کار فرما کا

(۱) "اضطراب دریا" تلاطم و تموج۔ جب قطرہ موتی میں پانی کا تلاطم باقی نہیں ہوتا بلکہ وہ منجمد ہوتا ہے۔ اسی طرح دل میں جو کشش

شوق کے لئے وسعت کافی نہیں (اور شوق کا تقاضا ہے۔ کہ دونوں جہان کو گھیر لے)

(۲) پاسخ "جواب" مکتوب "خط" ذوق خامہ فرسا "تحریر پر مجبور کرنے والا شوق یعنی یہ تو جانتا ہوں کہ تم خط کا جواب کیوں دینے لگا۔ لیکن شوق تحریر کا مجھ پر یہ ستم ہے کہ بغیر توقع جواب مجبوراً خط لکھتا رہتا ہوں۔

(۳) یعنی بہار کا اگر کوئی وجود مان بھی لیا جائے تو عارضی وجود مانا جا سکتا ہے۔ جس طرح رنگ وغیرہ عوارض کو قیام و دوام نہیں بلکہ دوسرے جواہر پر عارض و لاحق ہوتے رہتے ہیں اور مٹ جاتے ہیں۔ بہار کی مثال بھی یہی ہے کہ وہ گویا جوہر جزو ال پر مثل رنگ حنا عارض ہو جانے والی چیز ہے۔ اور یہی حال عیش دنیا کا ہے کہ وہ کبھی کبھی برائے چندے کلفت خاطر پر عارض ہو جاتا ہے۔

(۴) "مجھے دماغ نہیں" مجھ میں تاب و طاقت نہیں۔ "خندہ ہائے بیجا" بے وجہ اور بے وقت کی ہنسی۔ یہاں خندہ گل کی طرف اشارہ ہے۔ یعنی غم فراق سے ہم میں سیر گل کی طاقت نہیں۔

(۵) "محرمی" واقفیت یا قربت "سراپا چشم بینا ہونا" یعنی ہمہ تن چشم شوق تجسس بن جانا مطلب ہے یا دیکھو میں ہمہ تن چشم شوق تجسس ہو گیا ہوں۔ لیکن ہنوز حقیقت حسن کی واقفیت یا قربت یا معرفت میسر نہیں۔

(۶) ہم نے پہلے ہی تقاضہ میں ناز و ادا کو دل دے دیا کیونکہ

یہاں زیادہ تقاضوں کی برداشت نہ تھی۔

(۷) گریہ کا منبع "حسرتِ دل" کو قرار دیا ہے اور اس کی مقدار کی جانب لفظ "دریا" سے اشارہ کیا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ کوئی یہ نہ کہے کہ گریہ سے دل کی حسرت پوری ہوگی۔ کیونکہ تقاضائے حسرت تو گریہ دریا بار کے لئے تھا۔

(۸) "کافر" یا "معشوق ستم پیشہ"۔

قطرۂ مے بسکہ حیرت سے نفس پرور ہوا	۱	خطِ جامِ مے سراسر رشتۂ گوہر ہوا
اعتبارِ عشق کی خانہ خرابی دیکھنا	۲	غیر نے کی آہ، لیکن وہ خفا مجھ پر ہوا

(۱) اس مطلع میں خیال ہے دقیق۔ مگر کوہ کندن و کاہ بر آوردن اپنی لطف زیادہ نہیں۔ قطرہ ٹپکنے میں بے اختیار ہے۔ بقدر یک نفس یہ ہم دوں ثبات قرار ہے۔ حیرت ازالۂ حرکت کرتی ہے۔ قطرۂ مے افراطِ حیرت سے ٹپکنا بھول گیا۔ برابر برابر بوندیں جو جم کر رہ گئیں تو پیالی کا خط بصورت اُس تاگے کے بن گیا۔ جس میں موتی پروئے ہوں۔" (ماخوذ از مکتوبِ غالب موسومہ قاضی عبدالجمیل صاحب جنوں بریلوی)

(۲) ان کو اعتبار ہے کہ سوائے میرے کوئی عاشق نہیں۔ اس لئے کہ میں ہی نالہ و آہ کیا کرتا تھا۔ لیکن اس اعتبار کی خانہ بربادی دیکھئے کہ اگر غیر نے بھی اتفاقاً کبھی آہ کر دی تو وہ مجھ پر خفا ہوئے۔

جب بہ تقریبِ سفر یار نے محمل باندھا	۱	تپشِ شوق نے ہر ذرہ پہ اک دل باندھا
اہلِ بینش نے بہ حیرت کدۂ شوخیِ ناز	۲	جوہرِ آئینہ کو طوطیِ بسمل باندھا

یاس و امید نے یک عربدہ میداں مانگا	۳	عجز ہمت نے طلسم دل بسمل باندھا
نہ بندھے تشنگی شوق کے مضموں غالب	۴	گرچہ دل کھول کے دریا کو بھی ساحل باندھا

(۱) مصرعۂ اول صاف ہے۔ مصرعۂ ثانی سے یا تو یہ مراد ہے کہ پرتو حسن سے ہر ایک ذرہ جگمگا اٹھا اور چونکہ ذرّوں میں یہ چمک تاب جمال یار کی تھی اس لئے ذرّہ دلستاں ہو گیا یا یہ کہ ذرہ ذرہ میں شوقِ نظارۂ جمال اس طرح معمور تھا۔ گویا ہر ذرّہ ایک دل پُر ذوق تھا۔

(۲) اہل بینش "اہل نظر" حیرت کدہ "مقام حیرت یا عالم حیرت آفریں۔ حیرت و آئینہ میں رعایت ہے۔ اور لفظاً حیرت و بسمل میں تقابل۔ "جوہر" آئینہ فولادیں ہو یا تلوار وغیرہ پر اس تاب کو کہتے ہیں جو چمک اور جھلملاہٹ سے نگاہوں میں اس قسم کی خیرگی پیدا کر دیتی ہے اور یہ نقوش متحرک نظر آتے ہیں اور اسی متحرک نمائش کے سبب سے بسمل بہت لطیف تشبیہ ہے۔ اور چونکہ جوہر کچھ سبزی مائل نظر آیا کرتا ہے۔ اس لئے اس سبزی کو شعرا کے یہاں طوطی سے تشبیہ دیتے ہیں پس یہ سبزی جوہر بوجہ انعکاس متحرک شاعرانہ زبان میں طوطی بسمل ہے۔ مطلب ہے کہ اہل نظر شوخی ناز کے عالم حیرت میں جوہر آئینہ کو طوطی بسمل شمار کرتے ہیں گویا آئینہ بھی اس کے جلوہ کا شیدا ہے۔

(۳) "عربدہ" "لڑائی" طلسم "جادو یا نجوم کے عجائبات و اسرار سے تیار کیا ہوا مکان جس میں فریب نظر و خیال کے سوا کوئی

حقیقت نہ ہو۔ "عجز ہمت" پست ہمتی۔ مطلب ہے کہ پست ہمتی نے سائل یا طالب کے دل میں ایک وہمی طور پر بار بار رکھا ہے۔ جہاں یاس و ناامیدی کی ہنگامہ آرائیاں ہوتی رہتی ہیں اگر ہمت عاجز نہ ہو تو فیصلہ کن عزم و استقلال سے بیابانِ بلا سے ادہام رہتے اور پس و پیش کرنے کے طلب حاصل کی جا سکتی ہے۔

(۴) "تشنگیِ ذوق" مراد "ذوق بیجا"۔ "ساحل" کو تشنہ اور خشک لب لکھا جاتا ہے۔ تمام شعر میں رعایاتِ لفظی ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ مضامین شوق لکھنے کی بیجا کوشش کی۔ لیکن وفورِ جذبات کے بالمقابل وسعتِ الفاظ و بیان ناکافی ثابت ہوئی۔

میں اور بزمِ مے سے یوں تشنہ کام آؤں	۱	گر میں نے کی تھی توبہ ساقی کو کیا ہوا تھا
ہے ایک تیر جس میں دونوں چھدے پڑے ہیں	۲	وہ دن گئے کہ اپنا دل سے جگر جدا تھا
۳	درماندگی میں غالب کچھ بن پڑے تو جانوں جب رشتہ بے گرہ تھا ناخن گرہ کشا تھا	

(۱) "تشنہ کام" محروم۔ یعنی یہ قسمت کی بات ہے کہ بزمِ مے سے میں محروم واپس آ جاؤں۔ میں تائب سہی۔ ساقی کو تو اصرار سے پلا دینی ہی چاہیئے تھی۔

(۲) "درماندگی" مصیبت۔ "رشتہ بے گرہ" سے عدمِ مشکل مراد ہے۔ "ناخن گرہ کشا" یعنی تدبیر و چارہ کار کی قابلیت۔ مطلب یہ ہے کہ مصیبت کے وقت کوئی تدبیر بن پڑے تو کام چلے۔ اس سے کیا ہوتا ہے کہ جب کوئی مشکل درپیش نہ تھی تو تدبیریں

سوجھتی تھیں اور اب کچھ نہیں ہو سکتا۔

گھر ہمارا جو نہ روتے بھی تو ویراں ہوتا	۱	بحر گر بحر نہ ہوتا تو بیاباں ہوتا
تنگیٔ دل کا گلہ کیا یہ وہ کافر دل ہے	۲	کہ اگر تنگ نہ ہوتا تو پریشاں ہوتا
بعد یک عمرِ ورع بار تو دیتا بارے	۳	کاش رضواں ہی درِ یار کا درباں ہوتا

(۱) اپنے اس گھر کو جس میں گریہ ہوتا رہتا ہے۔ معرضِ طوفان میں بیان کر کے بحر سے تشبیہ دیتے ہوئے دوسرا نتیجہ ظاہر کیا ہے یعنی جس طرح دریا کی جگہ اگر دریا نہ ہوتا تو ویرانی ہوتی اسی طرح ہمارے گھر میں کوئی نہ کوئی بربادی ضرور ہوتی رونا نہ ہوتا کوئی اور آفت ہوتی۔

(۲) "تنگیٔ دل" تکلیفِ ملال۔ تنگ و پریشان کے لغوی معنے متضاد ہیں۔ لیکن دل کے ساتھ دونوں مترادف ہو جاتے ہیں۔ مطلب ہے کہ کمبخت دل ایسی بری چیز ہے کہ ہر حال میں تکلیف یقینی تھی۔ یعنی اگر دل تنگ نہ ہو تو پریشان ہوتا۔

(۳) "ورع" عبادت گذاری و تقویٰ۔ "رضوان" دربانِ جنت یعنی کاش تیرے آستانہ کا دربان رضوان ہی ہوتا جو ایک عمر کی پرستش کے بعد تیری بزم میں پہنچنے کی اجازت دے دیتا۔

نہ تھا کچھ تو خدا تھا کچھ نہ ہوتا تو خدا ہوتا	۱	ڈبویا مجھ کو ہونے نے نہ ہوتا میں تو کیا ہوتا!
ہوا جب غم سے یوں بے حس تو غم کیا سر کے کٹنے کا	۲	نہ ہوتا گر جدا تن سے تو زانو پر دھرا ہوتا

۳	ہوئی مدت کہ غالب مر گیا پر یاد آتا ہے وہ ہر اک بات پر کہنا کہ یوں ہوتا تو کیا ہوتا	

(۱) "جب کچھ نہ تھا" جب یہ عالم کثرت و تعیّنات نہ تھا تو صرف ذات الٰہی تھی۔ اسی طرح اگر یہ کثرت و تشخصات نہ ہوتے تو محض ذاتِ محبت ہوتی۔ بس مجکو میرے وجود نے مبدۂ ذات سے بعید کر دیا۔ اگر یہ میرا وجود مشخص نہ ہوتا تو میں عین ذات ہوتا۔

(۲) غم سے دماغ ایسا بے حس ہو گیا تھا کہ غم کا بھی احساس باقی نہ رہا تھا۔ پھر ایسے سر کے کٹنے کا غم ہی کیا اگر تن سے جدا نہ ہوتا تو زانو پر دھرا ہوتا۔

(۳) یعنی افسوس مدت ہوئی کہ غالب مر گیا لیکن اس کی یہ بات کس قدر یاد آتی ہے کہ ہر بات پر ارمان و تمنا سے کہا کرتا تھا کہ یوں ہوتا تو کیا ہوتا۔ یعنی یوں ہوتا تو کیسا لطف ہوتا۔ ایسا ہوتا تو کیسے مزے کی بات تھی۔ یا آپ میرے گھر آتے تو کیسی اچھی بات تھی۔ یا آپ مجھ سے وفا و محبت کرتے تو کیا کہنا تھا (الیٰ غیر النہایۃ)

یک ذرۂ زمیں نہیں بے کار باغ کا	۱	یاں جادہ بھی فتیلہ ہے لالے کے داغ کا
بے مے کسے ہے طاقتِ آشوبِ آگہی	۲	کھینچا ہے عجزِ حوصلہ نے خطِ ایاغ کا
بلبل کے کاروبار پہ ہیں خندہ ہائے گل	۳	کہتے ہیں جس کو عشق خلل ہے باغ کا
تازہ نہیں ہے نشۂ فکرِ سخن مجھے	۴	تریاکیِ قدیم ہوں دودِ چراغ کا
سو بار بندِ عشق سے آزاد ہم ہوئے	۵	پہ کیا کریں کہ دل ہی عدو ہے فراغ کا
بے خونِ دل ہے چشم میں موجِ نگہ غبار	۶	یہ میکدہ خراب ہے مے کے سراغ کا

(۱) "جادہ" خطِ راہ۔ "فتیلہ" بتی۔ "داغ" چراغ سے استعارہ ہے۔

چراغ کے شعلہ اور لالہ میں فتیلہ اور جادہ میں تشبیہات ہیں یعنی زمینِ چمن کی ہر چیز مناسبت رکھتی ہے جتے کہ خطِ راہ (جو پھولوں سے خالی ہوتا ہے) یہی فتیلہ چراغ لالہ کے مثل ہے۔

(۲) "آگہی" عقل و ہوش۔ "خط کھینچنا" کاٹ دینا۔ "عجز حوصلہ" ضعف ہمت۔ خط کھینچنا، یعنی کاٹ دینا، غلط کر دینا اور خارج کر دینا۔ ایاغ۔ جام مے۔ یعنی بغیر شراب کے مجھ میں تکلیفات عقل و ہوش برداشت کرنے کی طاقت نہیں۔ اور اسی بے حوصلگی کی وجہ سے میں بادہ کشی کرتا ہوں۔ تو گویا اس عجز ہمت نے (کہ بغیر مے کے تکلیفات عقل برداشت نہیں ہوتیں) فسادات عقل پر خط ایاغ کھینچ دیا ہے۔

(۳) "کاروبار" مراد حرکات و سکنات۔ یعنی بلبل کی حرکتوں کی پھول ہنسی اڑاتے ہیں گویا عشق دیوانگی ہے کہ تمسخر کیا جاتا ہے۔ یا دیوانگی عشق ہی کا یہ کرشمہ ہے کہ خود اپنے ہی مضحکہ کے لئے غنچوں کو پھول بنا دیتی ہے۔

(۴) "تریاک" کا جل۔ "دود" دھواں۔ مطلب صرف یہ ہے کہ میری مشق سخن بہت دیرینہ ہے۔

(۵) یعنی دل ہمیشہ مبتلائے عشق ہوتا رہتا ہے اور افتادِ طبیعت ہی کچھ ایسی ہے۔

(۶) "میکدہ" استعارۂ چشم۔ "مے" تشبیہ و استعارۂ خونِ دل۔ "سراغ" پتہ نشان۔ یعنی جس طرح جستجوئے شراب میں خالی میکدہ میں

خاک سی اُڑتی رہتی ہے اُسی طرح بغیر خونفشانی ہائے حسرت کے میری موجِ نگاہ غبار آلود ہوتی ہے۔

وہ مری چینِ جبیں سے غمِ پنہاں سمجھا	۱	رازِ مکتوب بہ بے ربطیِ عنواں سمجھا
یک الف بیش نہیں صیقلِ آئینہ ہنوز	۲	چاک کرتا ہوں میں جب سے کہ گریباں سمجھا
شرحِ اسبابِ گرفتاریِ خاطر مت پوچھ	۳	اس قدر تنگ ہوا دل کہ میں زنداں سمجھا
بدگمانی نے نہ چاہا اُسے سرگرمِ خرام	۴	رُخ پہ ہر قطرہ عرق دیدۂ حیراں سمجھا
عجز سے اپنے یہ جانا کہ وہ بدخو ہوگا	۵	نبضِ خس سے تپشِ شعلۂ سوزاں سمجھا
سفرِ عشق میں کی ضعف نے راحت طلبی	۶	ہر قدم سائے کو میں اپنے شبستاں سمجھا
تھا گریزاں مژۂ یار سے دل تا دمِ مرگ	۷	دفعِ پیکانِ قضا اس قدر آساں سمجھا
۸	دل دیا جان کے کیوں اُس کو وفادار اسدؔ غلطی کی کہ جو کافر کو مسلماں سمجھا	

(۱) "بے ربطی" ابتری۔ "عنوان" سرنامہ۔ بے ربطی سے چینِ جبیں کا استعارہ کیا ہے اور مکتوب سے دل کا۔ عنوان سے پیشانی کا۔ مطلب صاف ہے کہ اُس نے میری چینِ جبیں سے میری پریشانیِ خاطر کا اندازہ لگا لیا۔

(۲) گریبان سے مراد علائقِ دنیوی۔ آئینہ دل کا استعارہ ہے یعنی علائقِ دنیوی کے ترک کر دینے پر بھی کامل صفائے قلب میسر نہیں اور صفائے قلب ایک الف سے زیادہ نہیں یعنی بالکل ہی ابتدا ہے۔ نیز (ا) (الف) سے گریبان کی تشبیہ بھی مقصود ہے۔

(۳) "شرح" تفصیل یعنی اسبابِ گرفتاری کی تفصیل کیا پوچھتے ہو۔

دل اِس قدر تنگ ہوگیا کہ اُس کی تنگی کو میں تنگیٔ زنداں سمجھا۔ یا دل کی تنگی سے معلوم ہوا کہ میں زندانیٔ عشق ہوں۔ اور یہی اسبابِ گرفتاری کی تفصیل ہے۔

(۴) "سرگرم" مصروف۔ "عرق" پسینہ۔ یعنی بدگمانی سے یہ گوارا نہ ہوا کہ وہ مصروفِ آمد و رفت رہیں اور اسی بدگمانی سے اُنکے چہرے کا ہر قطرۂ عرق چشمِ غیر معلوم ہوتا تھا۔ گویا اغیار کی نگاہیں اُن پر پڑی ہیں اور شرم سے ان کو پسینہ آگیا ہے ورنہ سچا یہ کہ وہاں نزاکت سے آمد و رفت کی مشقت عرق ریزی تھی۔

(۵) "عجز" "ضعف۔ کم ہمتی" "بدخو" "تیز مزاج۔ دودھ" "تنکا" "بھبھک" محض مزاج اور تپش کی رعایت سے لائے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ میری ضعیف الخیالی اور کم ہمتی تھی کہ اس کو آتش مزاج سمجھ لیا اور اس کی شعلہ خوئی کی جو میری ضعیف الخیالی سے پیدا ہوئی مثال ایسی ہے گویا یہ شعلہ تنکے سے پیدا ہوا۔

(۶) "شبستان" آرامگاہ۔ یعنی سفرِ عشق میں مجھ کو ناتوانی نے ایسا راحت طلب بنا دیا ہے کہ ہر ایک قدم پر اپنے سایہ کو شبستان سمجھتا ہوں۔

(۷) مرتے دم تک مژگانِ یار سے بچنا چاہتا تھا اور اس تیرِ قضا کو خطا کرنا آسان سمجھتا تھا (لیکن نہ بچ سکا اور اُسی کا نشانہ ہوکر ہلاک ہوا)۔

(۸) "کافر" بیوفا۔ "مسلمان" لفظی رعایت کے طور پر بمعنی وفادار استعمال ہوا۔

پھر مجھے دیدۂ تر یاد آیا	۱	دل جگر تشنۂ فریاد آیا
دم لیا تھا نہ قیامت نے ہنوز	۲	پھر ترا وقتِ سفر یاد آیا
سادگی ہائے تمنا یعنی	۳	پھر وہ نیرنگِ نظر یاد آیا
عُذرِ واماندگی اے حسرتِ دل	۴	نالہ کرتا تھا جگر یاد آیا
زندگی یوں بھی گذر ہی جاتی	۵	کیوں ترا راہ گذر یاد آیا
کیا ہی رضواں سے لڑائی ہوگی	۶	گھر ترا خلد میں گر یاد آیا
آہ وہ جُرات فریاد کہاں	۷	دل سے تنگ آکے جگر یاد آیا
پھر ترے کوچے کو جاتا ہے خیال	۸	دلِ گم گشتہ مگر یاد آیا
کوئی ویرانی سی ویرانی ہے	۹	دشت کو دیکھ کے گھر یاد آیا

۱۰ میں نے مجنوں پہ لڑکپن میں اسدؔ
سنگ اُٹھایا تھا سر یاد آیا

(۱) یعنی دل و جگر کی تشنگیٔ فریاد نے مجھے چشم اشک فشاں کی یاد دہانی کی۔

(۲) یعنی تیری جدائی کا اضطراب کم نہ ہونے پایا تھا کہ وقت جدائی کی یاد نے تازہ محشرستانِ بیقراری بنا دیا۔

(۳) "سادگی" نادانی مراد ہے "نیرنگ نظر" سحر نگاہ۔ جادو چشم یعنی افسوس تمنا کی فریب خوردگی تو دیکھو کہ پھر وہی پُرفن یاد آ رہا ہے۔

(۴) "واماندگی" مجبوری و بے بسی "عذر واماندگی" کے بعد "مجھے ہے" محذوف ہے یعنی اے حسرت دل مجھے یہ عذر بے بسی ہے کہ نالہ کرتے کرتے جگر کے شق ہو جانے کا خیال گذرا۔

(اور خاموش رہ گیا)

(۵) زندگی تو کسی نہ کسی طرح گذر ہی جاتی ناحق تیرے رہ گذر کے شوق نے سرِ راہ (ٹھوکروں میں) لاکر ڈال دیا۔

(۶) یعنی رضوان سے تیرے گھر کی تعریف کروں [illegible] فردوس بریں کی قصیدہ خوانیاں کرے گا یا وہ جنت میں [illegible] گا اور میں تیرے گھر کی راہ لوں گا۔ بہر حال اگر تیرا گھر یاد آیا تو جنت میں رضوان سے لڑائی ہوگی۔

(۷) یعنی ہائے وہ جرات فریاد کہاں جو جگر گدازی سے قبل تھی۔ اب دل سے مایوس ہوکر جگر کو یاد کرتا ہوں۔ چونکہ اس وقت تک کہ جگر شکستہ نہ ہوا تھا فریاد کی پوری طاقت موجود تھی۔

(۸) دل تو تیرے ہی کوچہ میں گم ہوچکا ہے اب جو تیرے کوچہ کا خیال آرہا ہے شاید یہ دل کی یاد ہے۔

(۹) یعنی جنگل کی ویرانی دیکھ کر اپنا گھر یاد آیا جس کی ویرانی اس کی مماثل تھی۔

(۱۰) مجنوں پہ ہم نے لڑکپن میں پتھر اٹھایا تھا کہ اپنے سر کا خیال گذرا کہ یہی نوبت آئندہ کہیں ہمارے سر کی نہ ہو

(۱)
ہوئی تاخیر تو کچھ باعث تاخیر بھی تھا
آپ آتے تھے مگر کوئی عناں گیر بھی تھا

(۲)
تم سے بے جا ہے مجھے اپنی تباہی کا گلہ
اس میں کچھ شائبۂ خوبیٔ تقدیر بھی تھا

(۳)
تو مجھے بھول گیا ہو تو پتا بتلا دوں

کبھی فتراک میں تیرے کوئی نخچیر بھی تھا

(۴)
قید میں ہے ترے وحشی کو وہی زلف کی یاد
ہاں کچھ اک رنج گرانباری زنجیر بھی تھا

(۵)
بجلی اک کوند گئی آنکھوں کے آگے تو کیا
بات کرتے کہ میں لب تشنۂ تقریر بھی تھا

(۶)
یوسف اس کو کہوں اور کچھ نہ کہے خیر ہوئی
گر بگڑ بیٹھے تو میں لائق تعزیر بھی تھا

(۷)
دیکھ کر غیر کو ہو کیوں نہ کلیجہ ٹھنڈا
نالہ کرتا تھا و لے طالب تاثیر بھی تھا

(۸)
پیشے میں عیب نہیں۔ رکھئے نہ فرہاد کو نام
ہم ہی آشفتہ سروں میں وہ جواں میر بھی تھا

(۹)
ہم تھے مرنے کو کھڑے پاس نہ آیا نہ سہی
آخر اس شوخ کے ترکش میں کوئی تیر بھی تھا

(۱۰)
پکڑے جاتے ہیں فرشتوں کے لکھے پر ناحق
آدمی کوئی ہمارا دم تحریر بھی تھا

---

(۱) یعنی آپ کو جو آنے میں دیر ہوئی یقیناً کوئی روکنے والا بھی ہوگا۔

(۲) آپ سے ناحق مجھے اپنی بربادی کا شکوہ ہے۔ میری تباہی میں تو میری بدقسمتی کا حصہ شامل ہے

(۳) "فتراک" جس میں شکار رکھتے ہیں "نخچیر" چھپا ہوا۔ یعنی جو کبھی تیرے فتراک میں نخچیر تھا میں وہی تو ہوں۔

(۴) "وحشی" دیوانۂ الفت مراد ہے۔ یعنی قیس۔ میں بھی تیرے دیوانۂ عشق کو تیری ہی زلف کی یاد ہے۔ اور زنجیر کی ایذا بھی صرف یوں محسوس ہوتی ہے کہ کہاں وہ زلف لطیف و مشکبو اور کہاں یہ وزن آہنی۔

(۵) بجلی ایک کوند گئی۔ یعنی نظر کے سامنے آتے ہی چھپ گئے۔ "لب تشنہ" طلب گار۔ مطلب ہے کہ تم نگاہ کے سامنے آتے ہی روپوش ہو جاتے ہو۔ اس سے بھلا کیا تسکین قلب ہو سکتی ہے ذرا ٹھیرتے بات کرتے حال پوچھتے کیونکہ میں گفتگو کا طالب بھی تھا۔

(۶) "لائق تعزیر" قابل سزا۔ یعنی جمال یوسفی سے اس حسن مطلق کی تمثیل توہین ہے۔ میں اس غلط تشبیہ کا مجرم ضرور تھا۔

(۷) یعنی غیر کو اس حال میں دیکھ کر کہ وہ نالہ کر رہا تھا اور کوئی تاثیر نہ تھی، میرا کلیجہ کیوں ٹھنڈا نہ ہو کیونکہ میں اس کی اسی حالت غیر کا متمنی تھا۔

(۸) یعنی فرہاد کا پیشہ سنگ تراشی سہی۔ پیشہ میں عیب ہی کیا ہے وہ ہمارے گروہ عشاق میں شامل تھا۔

(۹) یعنی ہم تو ملنے کے لئے نہیں بلکہ مرنے کے لئے کھڑے ہوئے تھے۔ وہ نہ آیا۔ خیر لیکن کیا اس کے ترکش میں کوئی تیر بھی نہ تھا کہ وہیں سے چلا کے ہلاک کر دیتا۔

(۱۰) یعنی کراماً کاتبین کے لکھنے پر عذاب و عقاب کا مدار کیوں ہے۔ دم تحریر ہمارا جانب دار بھی تو ہونا ضروری تھا تاکہ

ان کی تحریری مطلق العنانی اور افراط و تفریط کا اندازہ ہوتا۔

لب خشک در تشنگی مردگاں کا	۱	زیارت کدہ ہوں دل آزردگاں کا
ہمہ ناامیدی ہمہ بدگمانی	۲	میں دل ہوں فریب وفا خوردگاں کا

(۱) اپنی ہستی سراپا الم کو پیاس کی شدت میں مرنے والے کے لب سے تمثیل کیا ہے اور "مردگان" کی رعایت سے دوسری تعبیر زیارت کدۂ اہل درد سے کی ہے۔ یعنی میں ان لوگوں کا لب خشک ہوں جو شدت پیاس سے جاں دے گئے ہوں اور ستائے ہوئے دلوں کا زیارت کدہ ہوں!

(۲) "فریب خوردگان" دھوکا کھائے ہوئے۔ دھوکا کھا کر آدمی میں احتیاط زیادہ ہوتی ہے (ہمیں کاٹا ہے جب سے سانپ نے رسّی سے ڈرتے ہیں) پس ایسا دل جو معشوق کے ظلم و ستم کو وفا سمجھنے کے بعد ہوشیار ہوا ہو بہت ہی باخبر لیکن مایوس ہونا چاہئے۔ چنانچہ شعر کا بھی مفہوم یہی ہے کہ اس دل کی طرح جو فریب وفا کھا چکا ہے میں اب ہمہ تن ناامیدی و بدگمانی ہوں۔

چھوڑا مہ نخشب کی طرح دست قضا نے	۱	خورشید ہنوز اس کے برابر نہ ہوا تھا
توفیق باندازۂ ہمت ہے ازل سے	۲	آنکھوں میں ہے وہ قطرہ کہ گوہر نہ ہوا تھا
جب تک کہ نہ دیکھا تھا قد یار کا عالم	۳	میں معتقد فتنۂ محشر نہ ہوا تھا
میں سادہ دل آزردگی یار سے خوش ہوں	۴	یعنی سبق شوق مکرر نہ ہوا تھا
دریائے معاصی تنک آبی سے ہوا خشک	۵	میرا سر دامن بھی ابھی تر نہ ہوا تھا
۶	جاری تھی اسد داغ جگر سے مری تحصیل	

	آتشکدہ جاگیر سمندر نہ ہوا تھا	+

(۴) "تحصیل" حاصل و نفع کو کہتے ہیں یہ لفظ جاگیر کی رعایت سے استعمال ہوا ہے۔ آتشکدہ جگر سے استعارہ ہے سمندر اس کیڑے کو کہتے ہیں جو آگ میں پیدا ہوتا اور پرورش پاتا ہے۔ مطلب صرف یہ ہے کہ داغ ابھی اتنا نہ ہوا تھا۔ کہ سارے جگر پر حاوی ہو جاتا۔ بلکہ ابھی کچھ کچھ خون بھی جگر میں باقی تھا جو آنکھوں کی راہ نکلتا رہتا تھا (اور یہ تحصیل آتشکدہ سے جاری تھی)۔

شب کہ وہ مجلس فروزِ خلوتِ ناموس تھا
رشتۂ ہر شمع خارِ کسوتِ فانوس تھا (۱)

مشہدِ عاشق سے کوسوں تک جو اگتی ہے حنا
کس قدر یارب ہلاکِ حسرتِ پابوس تھا (۲)

حاصلِ الفت نہ دیکھا جز شکستِ آرزو
دل بدل پیوستہ گویا یک لبِ افسوس تھا (۳)

کیا کہوں بیماریٔ غم کی فراغت کا بیاں
جو کہ کھایا خونِ دل بے منتِ کیموس تھا (۴)

(۱) "ناموس" راز "مجلس فروز" محفل روشن کرنے والا رونق محفل۔ انجمن آرا۔ شمع کی رعایت سے مجلس فروز استعمال کیا گیا ہے "خلوت" "تنہائی" "رشتۂ شمع" "بتی" "کسوت" پیراہن جامہ "خارکسوت" محاورہ فارسی میں بھی ہے استعمال ہوتا ہے۔ "فانوس" شمع دان۔ مطلب یہ کہ رات

بزمِ راز میں اُن کے تاب و جمالِ حسن کا یہ عالم تھا کہ ہر رشتۂ شمع لباسِ فانوس کے لئے گویا خار کسوت تھا یعنی اُن کی مجلس فروزی سے شمع حسد میں جلتی تھی۔ اور اُن کے حسن و جمال کے سامنے شمع کی روشنی ماند تھی۔

(۲) جس طرح مزار پر نرگس کے پھول کھلا کر شعرا حسرتِ انتظار کا مضمون باندھتے ہیں۔ اُسی طرح اُستاد نے یہاں وفا کی اُگائی ہے۔

(۳) حاصل "نتیجہ" "شکستِ آرزو" خونِ تمنا۔ پیوستگیٔ لب کی رعایت سے دل بدل پیوستہ کا استعارہ الفت کے لئے استعمال ہوا ہے۔ محاورہ میں بھی دل ملنا محبت کے معنے میں آتا ہے۔ یعنی محبت کا نتیجہ سوا خونِ تمنا کے کچھ نہیں گویا دو دلوں کا ملنا پیوستگیٔ لب افسوس کے مشابہ ہے۔

(۴) کیموس" جگر کے اس فعل ہضم کو کہتے ہیں جس سے غذا خون بنتی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ ہم غم کی آسانی کیا بیان کریں کہ اس میں خونِ دل کھانا ہوتا تھا۔ اور جب خون ہی کی غذا ہوگی تو ظاہر ہے کہ عمل کیموس کی ضرورت باقی نہ رہے گی۔ یا اس لئے کہ یہ غذا منہ سے نہیں کھائی جاتی بلکہ اندر ہی اندر خون خشک ہوتا جاتا ہے، اس لئے خونِ دل کھانے میں کیموس کا کیا احسان۔

آئینہ دیکھ، اپنا سا منہ لے کے رہ گئے	۱	صاحب کو دل نہ دینے پہ کتنا غرور تھا
قاصد کو اپنے ہاتھ سے گردن نہ ماریئے	۲	اُس کی خطا نہیں ہے یہ میرا قصور تھا

(۱) یعنی معشوق کو یہ زعم و دعویٰ ہوگا کہ ہمارا دل کوئی نہیں لے سکتا یا ہم کو کسی کا عشق نہیں ہو سکتا۔ آئینہ جو دیکھا تو وہ دعوے باطل شرمندہ ہوئے۔ ہوش جاتے رہے۔ حضور اپنے اوپر آپ فریفتہ ہوگئے۔

(۲) "اپنے ہاتھ" سے اشارہ ہے اقبالِ جرم پر۔ تاہم یہاں اس رشک کا اظہار بھی ہے کہ وہ کسی اور کو اپنے ہاتھ سے کیوں قتل کریں اُن کے ہاتھ سے قتل کے مستحق و مستوجب تو ہم ہی ہونے چاہیئیں۔

۱	عرضِ نیازِ عشق کے قابل نہیں رہا	جس دل پہ ناز تھا مجھے وہ دل نہیں رہا
۲	جاتا ہوں داغِ حسرتِ ہستی لیے ہوئے	ہوں شمعِ کشتہ درخورِ محفل نہیں رہا
۳	مرنے کی اے دل اور ہی تدبیر کر کہ میں	شایانِ دست و بازوئے قاتل نہیں رہا
۴	بر روئے شش جہت درِ آئینہ باز ہے	یاں امتیازِ ناقص و کامل نہیں رہا
۵	وا کر دیے ہیں شوق نے بندِ نقابِ حسن	غیر از نگاہ اب کوئی حائل نہیں رہا
۶	گو میں رہا رہینِ ستم ہائے روزگار	لیکن ترے خیال سے غافل نہیں رہا
۷	دل سے ہوائے کشتِ وفا مٹ گئی کہ واں	حاصل سوائے حسرتِ حاصل نہیں رہا
۸	بیدادِ عشق سے نہیں ڈرتا مگر اسدؔ جس دل پہ ناز تھا مجھے وہ دل نہیں رہا	

(۱) "عرض" اظہار۔ ناز و نیاز رعایاتِ لفظی ہیں۔ مطلب صاف ہے اور شعر عجیب حال میں کہا گیا ہے۔

(۲) "داغ" رعایت ہے "شمعِ کشتہ" کی۔ "حسرتِ ہستی" زندگی کی طلب اور دم۔ شمعِ کشتہ تمثیل ہے ذاتِ حسرتِ ہستی لیکر

مرجانے کی۔ محفل برعایت شمع عالم ہستی سے استعارہ ہے مطلب ہے کہ ناکارۂ روزگار ہوں۔ دنیا میں رہنے کے قابل نہیں اور مرتا ہوں۔

(۳) شعر صاف ہے۔ البتہ لفظ شایان معنی خیز ہے یعنی دست و بازوئے قاتل (معشوق) کے لائق تو وہی ہو سکتا ہے جس پر محض قاتل ہی کے وار ہوں یعنی ہلاکت گاہ عشق کے قابل وہی تازہ دم ہے جو آلام و مصائب ما سوئے العشق سے نیم جاں اور نیم مردہ نہ ہو چکا ہو یا اُن کے ہاتھ سے قتل ہونے کے لئے تو کوئی اچھا تندرست آدمی ہونا چاہئے اور میں تو پہلے ہی نیم مردہ ہوں۔

(۴) ہر در ولئے شش جہت "سارے زمانہ کے قابل یا سارے جہان کے واسطے" آئینہ "عالم حیرت یا پرتو فیضان غیب یعنی عامی اور صاحب بصیرت؛ عالم و جاہل اہل قرب و اہل بُعد عارف و ناآشنا اور مجہول و گمراہ سارا جہان مبتلائے حیرت ہے اور حقیقت شناسی سے عاجز یا پرتو فیضان غیب سے کوئی محروم نہیں اور یا اشیائے ظاہری انوار فطرت و قدرت سے سب مستفیض و مستنیر ہوتے ہیں۔

(۵) متصوفانہ نقطۂ نظر سے کمال دیدیہ ہے کہ طالب دید ہمہ تن دید۔ اور محو و مستغرق اور تماشۂ دیدار ہو جائے۔ یہاں تک کہ دیکھنے والا اور جس کو دیکھا جائے دونوں ایک ہو جائیں اور دیکھنے کا اشیا نہ حجاب باقی نہ رہے۔ اس شعر کا

بھی یہی مطلب ہے کہ اب سوائے نگاہ کے کوئی چیز حائل نہیں ہے اور شوق نے نقاب حسن کے بند کھول دیئے ہیں یعنے روئے زیبا پہ کوئی نقاب و حجاب نہیں رہا۔

(۶) یعنی اگرچہ میں دُنیاوی مصائب میں مبتلا رہا لیکن تجھے کبھی نہیں بھولا (نہایت لطیف جذبہ ہے)

(۷) "ہوا" خواہش و طلب "کشت" کھیتی "حاصل" اصطلاح زرعی میں پیداوار کو اور عام طور پر نفع کو کہتے ہیں۔ یعنی اب وفاداری کا ولولہ باقی نہیں ہے کیونکہ سوائے اس کے کہ تمنا پوری ہونے کی تمنا کی جائے اصلِ تمنا پوری نہیں ہوتی۔

(۸) یعنی تکلیفاتِ عشق سے میں ڈرتا نہیں لیکن وہ دل باقی نہیں جس پہ مجھے ناز تھا کہ سب کچھ برداشت کر سکوں گا۔

---

(۱)
رشک کہتا ہے کہ اسکا غیر سے اخلاص حیف
عقل کہتی ہے کہ وہ بے مہر کس کا آشنا

(۲)
ذرہ ذرہ ساغرِ میخانۂ نیرنگ ہے
گردشِ مجنوں بچشمک ہائے لیلا آشنا

(۳)
شوق ہے ساماں طرازِ نازشِ اربابِ عجز
ذرہ صحرا دستگاہ و قطرہ دریا آشنا

(۴)
شکوہ سنجِ رشکِ ہمدیگر نہ رہنا چاہیئے
میرا زانو مونس اور آئینہ تیرا آشنا

(۵)
میں اور اک آفت کا ٹکڑا وہ دلِ وحشی کہ ہے
عافیت کا دشمن اور آوارگی کا آشنا

	کوہکن نقاش یک تمثالِ شیریں تھا اسد سنگ سے سر مار کر ہووے نہ پیدا آشنا	(۶)

(۱) رشک سے یہ شبہ ہوتا ہے کہ اس سے اغیار کے مراسم اُنس ہیں لیکن عقل و غور سے یہ شبہ مٹ جاتا ہے کیونکہ بھلا وہ نامہربان، بیوفا کس کا دوست ہو سکتا ہے۔

(۲) "ساغر" جام سے۔ میخانۂ نیرنگ سے مراد نظام سیارگان یا افلاک ہیں یعنی ہر ذرّہ دور میخانۂ نیرنگ کا ایک ساغر ہے جو گردش و انقلاب پذیر ہے۔ اسی طرح مجنوں کی وحشیانہ جولانیاں بھی لیلیٰ کی نگاہ کی گردشوں سے وابستہ ہیں گویا مجنوں کی قسمت پر لیلیٰ اسی طرح حکومت کرتی ہے۔ جس طرح انقلاب ارضی و سماوی پر کارکنان قضا و قدر یا سیارگان طالع یا "میخانۂ نیرنگ" ذات قادر و قیوم سے استعارہ ہے اور "گردش" کی رعایت سے ذرّہ کو ساغر سے تشبیہ دی ہے مطلب ہے کہ جس طرح مجنوں کی گردش قسمت یا دشت خرامی لیلیٰ کے ایک اشارۂ چشم پر منحصر ہے۔ اسی طرح اس کائنات کا ایک ایک ذرّہ اس "میخانۂ نیرنگ" کا ساغر ہے جو حرکت، گردش اور انقلاب میں سرگرداں ہے۔

(۳) "شوق" جوشِ طلب "سامان طراز" سبب "نازش" فخر و شرف "ارباب عجز" منکسر المزاج لوگ "صحرا" ریگزار "دریا" سمندر، محیط، ناپیدا کنار۔ یعنی عالم انسانیت میں باعث شرف جوش طلب الٰہی اور ولولۂ عرفان ہے اور یہی معرفت

وطلب کا شرف اُس میں ایسی حقیقی نسبت قائم کر دیتا ہے جو قطرہ کو دریا سے اور ذرّہ کو صحرا سے ہے۔

(۴) "میں" کی تقدیم معنی آفریں ہے۔ مطلب ہے کہ میں تو عافیت طلب اور عزلت پسند ہوں اور دل ایسا آفت کا ٹکڑا ہے جو عافیت کا دشمن اور آوارگی کا شیدا ہے۔

(۵) شعرا زانو کو آئینہ سے استعارہ کرتے ہیں اور اس شعر میں بھی "ہمہ نگر" ثبوت ہے۔

(۶) "تمثال" تصویر۔ یعنی فرہاد تصویر شیریں کا نقاش تھا سنگ تراشی کرتا تھا۔ بھلا کہیں پتھروں سے سر پھوڑنے سے معشوق ملا کرتے ہیں۔ گویا سنگ تراشی سے تصویر بنائی اور نہر کھودی جا سکتی ہے۔ لیکن معشوق حاصل کرنے کے لئے جذبِ کامل کی ضرورت ہے۔

---

(۱)
ذکر اُس پری وش کا اور پھر بیاں اپنا
بن گیا رقیب آخر تھا جو رازداں اپنا

(۲)
مے وہ کیوں بہت پیتے بزمِ غیر میں یارب
آج ہی ہوا منظور اُن کو امتحاں اپنا

(۳)
منظر اک بلندی پر اور ہم بنا سکتے
عرش سے اُدھر ہوتا کاش کے مکاں اپنا

(۴)
دے وہ جس قدر ذلت ہم ہنسی میں ٹالیں گے
بارے آشنا نکلا اُن کا پاسباں اپنا

درد دل لکھوں کب تک جاؤں ان کو دکھلاؤں
(۵)
انگلیاں فگار اپنی خامہ خوں چکاں اپنا

گھستے گھستے مٹ جاتا آپ نے عبث بدلا
(۶)
ننگ سجدہ سے میرے سنگ آستاں اپنا

تا کرے نہ غمازی کر لیا ہے دشمن کو
(۷)
دوست کی شکایت میں ہم نے ہم زباں اپنا

ہم کہاں کے دانا تھے کس ہنر میں یکتا تھے
(۸)
بے سبب ہوا غالب دشمن آسماں اپنا

(۱) ایسے حسین و پری جمال کا تذکرہ۔ اور پھر ہماری تحسین عشق آمیز اور رنگین بیانی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ سننے والا بھی عاشق ہو گیا اور رقیب بن گیا۔

(۲) بھلا وہ بزم غیر میں اتنی شراب کیوں پیتے کہ متوالے اور مدہوش ہو جاتے مگر یہ میری بدقسمتی ہے کہ انہیں بزم غیر میں اپنے ظرف کی آزمائش مد نظر ہو گئی۔

(۳) اگر ہمارا مکان عرش سے اس طرف ہوتا تو عرش کو نظر نگاہ ٹھہراتے لیکن اپنا مقام عرش والا مکاں ہے جو بلندی کا منتہا ہے اور اب کوئی بالائی فضا باقی نہیں گویا مدارج عروج و کمال سب طے ہو چکے اور ہمت اور سعی طلب ابھی تازہ ہیں۔

(۴) یعنی ہم نے تو یہ ارادہ کر لیا تھا کہ ان کے پاسبان کی دی ہوئی سب ذلتیں گوارا کر لیں گے اور ان تک پہنچیں گے۔

لیکن وہ شناسا نکلا اور ذلتوں کی نوبت نہ آئی۔

(۵) دل کا حال لکھتے لکھتے انگلیاں زخمی ہوگئیں اب آخر کہاں تک لکھوں بہتر یہی ہے کہ اپنی خوں فشاں انگلیاں اُن کو خود جا کر دکھلا دوں، کہ حضور کو حال لکھتے لکھتے یہ عالم ہوگیا اب تو خبر لو۔

(۶) آپ نے اپنا سنگ در بیغا مذہ تبدیل کر دیا (اس ضمن میں کہ یہ کیوں اس پر سجدہ کرے) مگر وہ تو خود میرے سجدہ کی ذلت و شرم سے گھستے گھستے باقی نہ رہتا۔

(۷) "غمازی" چغلی معشوق کی بیوفائی کی شکایتوں میں ہم نے رقیب کو بھی اپنا ہمزبان بنا لیا ہے (یعنی وہ بھی شاکی ہوگیا ہے) تاکہ وہاں جا کر چغلیاں نہ کھائے۔

(۸) اہل ہنر و کمال سے تو فلک کی دشمنی مشہور ہے لیکن ہم تو کچھ ایسے ہنرمند اور عاقل نہ تھے آسمان بیوجہ ہمارا دشمن ہوگیا۔

سرمۂ مفت نظر ہوں مری قیمت یہ ہے	۱	کہ رہے چشم خریدار پہ احساں میرا
رخصت نالہ مجھے دے کہ مبادا ظالم	۲	تیرے چہرے سے عیاں ہو غم پنہاں میرا

(۱) حسن رہگذر، سرو و ہمسایہ وغیرہ سے جس طرح بلا کد و کاوش اور بلا قیمت کے لذت حاصل کی جا سکتی ہے۔ اسی طرح میرا کلام آنکھوں میں نور بصیرت اور راحت نظر کا باعث ہوتا ہے یعنی ایک سرمۂ مفت ہے جس کی قیمت سوائے اس کے کچھ نہیں کہ آنکھوں پر ایک احسان بے معاوضہ باقی نہ رہ جائے۔

(۲) ظالم مجھے نالہ و آہ کی اجازت دیدے تاکہ سوز میں کچھ تو

کمی ہوتی رہے ورنہ ضبط سے اور دل کی آگ بھڑکے گی۔ اور دل کی کیفیتوں کا اثر دوسرے دلوں پر ضرور پڑا کرتا ہے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ نالہ فریاد نہ کرنے سے موجودہ غم غمِ پنہاں ہو جائے اور تو جذبِ دل سے متاثر ہو کر پریشان ہو۔

بے شانۂ صبا نہیں طرّہ گیاہ کا ۱ غافل بہ وہمِ ناز خود آرا ہے ورنہ یاں
صیدِ ز دام جستہ ہے اس دامگاہ کا ۲ بزمِ قدح سے عیشِ تمنا نہ رکھ کہ رنگ
شرمندگی سے عذر نہ کرنا گناہ کا ۳ رحمت اگر قبول کرے کیا بعید ہے
پُرِ گل خیالِ زخم سے دامن نگاہ کا ۴ مقتل کو کس نشاط سے جاتا ہوں میں کہ ہے
۵ جاں در ہوائے یک نگہِ گرم ہے اسدؔ
پروانہ ہے وکیل ترے داد خواہ کا

(۱) "شانہ" کنگھی "طرّہ گیاہ" گھاس کا گچھا۔ غافل انسان اپنے وہم سے ناز کرتا ہے کہ میں بھی کارساز اور صنعت طراز ہوں اور خود آرائیوں میں مبتلا رہتا ہے۔ حالانکہ یہاں گھاس کے تنکے بھی صبا (مشاطۂ غیب) کی مشاطگی سے زینت حاصل کرتے ہیں بلکہ یہ اپنے آپ کو بھول بھی جائے تو قدرت اس کو خود بناتی سنوارتی رہے گی۔

(۲) "بزمِ قدح" محفلِ مے نوشی "عیش تمنا رکھ" عیش کی امید نہ رکھ "رنگ" عیش و خوشی "صید ز دام جستہ" دام سے نکلا ہوا شکار۔ دامگاہ استعارہ ہے دنیا سے یعنی بزمِ شراب سے عیش و خوشی کی امید نہ کر کیونکہ دنیا میں خوشی تو کسی طرح میسر ہی نہیں ہوتی۔

(۳) مواخذہ کے وقت شرمندگی سے اگر گناہ کا عذر نہ کیا جائے تو بعید نہیں رحمتِ الٰہی اسی سکوتِ خجالت کو معذرت سمجھ کر قبول کرے اور معاف فرما دے۔

(۴) "پرگل" پھولوں سے بھرا ہوا۔ زخم و گل میں مشابہت ہوتی ہے۔ یعنی میں مقتل ایسی خوشی سے جا رہا ہوں جیسے سیر باغ و گل چینی کے لئے جاتے ہیں۔

(۵) "ہوا" خواہش و حوصلہ "نگہ گرم" غصہ کی نگاہ۔ پروانہ برعایت شعلہ نگاہی استعمال ہوا۔ "دادخواہ" فریادی (عاشق) "وکیل" چارہ جوئی و پیروی کرنے والا یہ لفظ بھی دادخواہ کی رعایت سے استعمال ہوا ہے۔ یعنی جان ایک شعلہ نگاہی کی طالب ہے اور تیرے دادخواہ نگاہ گرم کا چاک کا ہستی اس جان پر منحصر ہے جو پروانہ صفت ہے اور جلنا ہی چاہتی ہے۔

جور سے باز آئے پر باز آئیں کیا	۱	کہتے ہیں ہم تجھ کو منہ دکھلائیں کیا
رات دن گردش میں ہیں سات آسماں	۲	ہو رہے گا کچھ نہ کچھ گھبرائیں کیا
لاگ ہو تو اس کو ہم سمجھیں لگاؤ	۳	جب نہ ہو کچھ بھی تو دھوکا کھائیں کیا
ہو لئے کیوں نامہ بر کے ساتھ ساتھ	۴	یا رب اپنے خط کو ہم پہنچائیں کیا
موجِ خوں سر سے گزر ہی کیوں نہ جائے	۵	آستانِ یار سے اٹھ جائیں کیا
عمر بھر دیکھا کئے مرنے کی راہ	۶	مر گئے پر دیکھئے دکھلائیں کیا

۷	پوچھتے ہیں وہ کہ غالب کون ہے کوئی بتلاؤ کہ ہم بتلائیں کیا	

(۱) یعنی وہ فرماتے ہیں کہ ہم اپنی جفا شعاریوں پہ پشیمان ہیں۔ اور اسی پشیمانی سے منہ چھپاتے ہیں۔ لیکن ان کا منہ دکھانا بھی تو ہمارے لئے ظلم ہے غرض کہ ترک ستم پہ بھی وہ ستم سے باز نہ آئے۔

(۲) یعنی کارکنان قضا و قدر ہر وقت مصروف کار ہیں۔ ہمیں گھبرانے کی کیا ضرورت ہے۔ شدنی امور ہو کر ہی رہیں گے۔

(۳) اُستاد فرماتے ہیں "ترک کیجئے نہ تعلق ہم سے۔ کچھ نہیں ہے تو عداوت ہی سہی" گویا تعلق دو قسم کے ہوتے ہیں۔ دوستی کا اور دشمنی کا۔ یہاں فرماتے ہیں کہ "لاگ" (دشمنی) کے تعلق پر بھی ہم دل کو دھوکا دے سکتے ہیں کہ دوستی (لگاؤ) ہے لیکن جب کسی قسم کی وہاں گنجایش ہی نہ ہو تو کیا کریں۔

(۴) "یارب" مقام تعجب میں استعمال ہوتا ہے یعنی جوشِ اشتیاق میں قاصد کو پیغام رسانی کے طریقے اور بزم محبوب کے نشیب و فراز اور انداز حضوری سمجھاتے سمجھاتے ایک عالم محویت میں خود ہی محبوب کے گھر تک پہنچ گئے کہ دفعتہً خیال کا رُخ بدلا، رُکے۔ اور منہ سے بے ساختہ نکل گیا ہے ہم تو قاصد کے ساتھ اس طرح اُن کے دروازہ تک آگئے گویا ہم خود اپنے خط کو پہنچانے آئے ہیں۔

(۵) یعنی اب چاہے خونفشانیوں سے موج خون سر سے گذر ہی کیوں نہ جائے اُن کے دروازہ سے اُٹھنا کیسا ؟ ۔

(۶) یعنی زندگی بھر تو موت کی راہ دیکھتے رہے اب خدا

جانے مرنے کے بعد کیا پیش آئے۔
(۷) اُن سے یہ کس طرح کہیں کہ غالب آپ کا عاشق ہے اور وہ پوچھتے ہیں کہ غالب کون ہے، اب کیا کہیں۔

لطافت بے کثافت جلوہ پیدا کر نہیں سکتا
چمن زنگار ہے آئینہ بادِ بہاری کا (۱)

حریفِ جوششِ دریا نہیں خودداریٔ ساحل
جہاں ساقی ہو تو باطل ہے دعویٰ ہوشیاری کا (۲)

(۱) "لطافت" نزہت پاکیزگی "کثافت" مادیت "جلوہ" ظہور ونمود "زنگار" صیقل۔ یعنی روحانیت و لطافت بغیر مادیت کے ظاہر و نمایاں نہیں ہو سکتی۔ بادِ بہاری کو کون دیکھ سکتا ہے تاوقتیکہ اُس کے مظاہر گل و ریحاں کی صورت اختیار نہ کریں گویا بادِ بہاری مثل آئینہ کے ہے اور چمن اس کا زنگار ہے اور یہی جلوۂ بادِ بہاری ہے۔
(۲) "حریف" مقابل "خودداری" اپنے پر قابو رکھنا "جوششِ دریا" روانی بحر "ساحل" کنارہ۔ یعنی جب وہ اس قدر دریا دلی اور عطائے پیہم کے ساتھ پلائے تو بھلا ہوش و ضبط کے دعوے کس طرح باقی رہ سکتے ہیں۔ جس طرح طوفانِ آب کو ساحل روک نہیں سکتا اُسی طرح عطائے ساقی کا مقابلہ دعوے خودداری سے ناممکن ہے۔

عشرتِ قطرہ ہے دریا میں فنا ہو جانا	۱	درد کا حد سے گزرنا ہے دوا ہو جانا
تجھ سے قسمت میں مری صورتِ قفلِ ابجد	۲	تھا لکھا بات کے بنتے ہی جدا ہو جانا

دل ہوا کشمکشِ چارۂ زحمت میں تمام	۳	مٹ گیا گھسنے میں اس عقدہ کا وا ہو جانا
اب جفا سے بھی ہیں محروم ہم اللہ اللہ	۴	اس قدر دشمنِ اربابِ وفا ہو جانا
ضعف سے گریہ مبدل بہ دمِ سرد ہوا	۵	باور آیا ہمیں پانی کا ہوا ہو جانا
دل سے مٹنا تری انگشتِ حنائی کا خیال	۶	ہو گیا گوشت سے ناخن کا جدا ہو جانا
ہے مجھے ابرِ بہاری کا برس کر کھلنا	۷	روتے روتے غمِ فرقت میں فنا ہو جانا
گر نہیں نکہتِ گل کو ترے کوچے کی ہوش	۸	کیوں ہے گردِ رہِ جولانِ صبا ہو جانا
تاکہ تجھ پر کھلے اعجازِ ہوائے صیقل	۹	دیکھ برسات میں سبز آئینے کا ہو جانا
۱۰	بخشے ہے جلوۂ گل ذوقِ تماشا غالبؔ چشم کو چاہئے ہر رنگ میں وا ہو جانا	

(۱) "عشرت" عیش و مسرت یہاں کامیابی اور کامرانی مراد ہے۔ یعنی قطرہ کی کامیابی یہی ہے کہ دریا میں مل کر جذب و فنا ہو جائے اور اپنی ہستی بحیثیت قطرہ کے مٹا کر دریا میں شامل ہو کر خود دریا ہو جائے۔ اسی طرح درد عشق بھی ایک جزو ہے شفائے حقیقی کا۔ اور اس کا حد سے گزرنا گویا دوائے غیب میں ملنا اور وصالِ معشوق حقیقی اور فنا فی الذات ہونا ہے۔

(۲) "قفل ابجد" اس قفل کو کہتے ہیں جس پر حروف منقش ہوتے ہیں اور ان حروف سے ایک خاص لفظ بنتا ہے۔ جس کے بننے پر قفل کھل جاتا اور حلقہ کھٹکے سے جدا ہو جاتا ہے۔ اس شعر میں اسی سے تمثیل کیا ہے۔ گویا تجھ سے صرف اس لئے ملاقات ہوئی تھی کہ جدائی کی مصیبت میں مبتلا ہو جاؤں۔

(۴) "کشمکش" "کوشش و کاوش" "چارہ زحمت" علاج کلفت "عقدہ" گرہ۔ دل سے استعارہ و تشبیہ ہے۔ یعنی پہلے جو غم دل میں موجود تھا۔ اس کو رفع کرنے میں ایسی تکلیفات اور آلام کا سامنا کرنا پڑا کہ یہ خود ایک مصیبت ہو گئی جس نے دل کو تمام کر دیا اور جس طرح گرہ کھولنے سے کھلتی تو ہے نہیں بلکہ گھس کر ناپید ہو جاتی ہے اسی طرح چارہ جوئیوں کی دشواریوں نے دل کو تمام کر دیا۔

(۵) شعر صاف ہے اور پانی کے ہوا ہو جانے کو اپنے گریہ کے سیلاب پہ عزم سرد ہونے سے تمثیل کیا ہے۔

(۶) انگشت حنائی کی رعایت سے ناخن سے گوشت جدا ہونے کی ضرب المثل استعمال کی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ جس طرح وہ ناممکن ہے اسی طرح یہ خیال دل سے نکلنا محال ہے۔

(۷) غم فرقت میں روتے روتے میرا ہنسا ہو جانا ایسا ہی پرلطف ہے جیسے ابر بہار کا برسنا اور برس کر کھلنا کہ ابر بہار کا کھلنا بھی خالی از لطف نہیں ہوتا۔

(۸) "نکہت گل" بوئے گل "گرد رہ" غبار راہ۔ صبا میں بوئے گل کے ملنے اور پھیلنے کی ایک شاعرانہ توضیح ہے۔

(۹) "ہوا" شوق "اعجاز" "کرشمہ صیقل" قلعی و جلائے آئینہ۔ فولادی آئینہ پر مرطوب ہوا سے زنگ آ جاتا ہے اس کو شاعرانہ انداز میں بیان کرتے ہوئے اعجاز شوق کا کرشمہ کہا

ہے کہ صیقل بھی جوشِ شوق سے سبزی و نمو پیدا کر لیتا ہے
اور یہ بھی ہوائے موسم کی اشتیاق انگیزی ہے۔
(۱۰) "جلوۂ گل" خوبی و زینت گل ہے "ذوق تماشا" لطفِ دیدار
اور نظر یک ۔ یعنی خود جلوۂ گل ہی لطفِ دیدار پیدا کر دیتا ہے۔
اس لئے ہر حال میں آمادۂ دیدار رہنا چاہئے۔ لطف خود بخود
ہر چیز سے میسر آجائے گا۔

ربط یک شیرازۂ وحشت ہیں اجزائے بہار	سبزہ بیگانہ، صبا آوارہ، گل ناآشنا

(۱) "ربط" بندش و جمع "شیرازہ" اوراقِ کتب کی سلائی
اسی رعایت سے اجزا استعمال ہوا ہے "سبزۂ بیگانہ"
خود رو گھاس "صبا آوارہ" پھیلی ہوئی اور چلتی ہوئی ہوا۔
یہ سب موصوف صفت خاص خاص شاعرانہ اصطلاحیں
ہیں جن کا ظاہری و لفظی فائدہ ثبوتِ وحشت کے لئے حاصل
کیا گیا ہے اور شعرا اپنے شاعرانہ انداز و محاسن اور حقیقت
ترجمانی میں اپنی آپ ہی نظیر ہے۔ مطلب ہے کہ سبزۂ بیگانہ
صبائے آوارہ اور گل ناآشنا دیکھو کہ بیگانگی آوارگی
اور ناآشنائی اوصافِ وحشت میں سے ہے) بہار کے
اجزا ہیں انہیں کے مجموعہ کو بہار سے تعبیر کیا جاتا ہے۔
حالانکہ یہ مجموعہ (با عتبار اوصاف مذکورہ) محض ربط
شیرازہ وحشت ہے۔ گویا ایک خیال کی مختلف روانیوں نے
عالم اشکال پیدا کر دیا ہے۔

برہمن شرم ہے باوصف شوخی اہتمام اُس کا (۱)
نگیں میں جوں شرارِ سنگ ناپیدا ہے نام اُس کا

مسی آلودہ ہے مُہر نوازش نامہ ظاہر ہے (۲)
کہ داغِ آرزوئے بوسہ دیتا ہے پیام اُس کا

بامیدِ نگاہِ خاص ہوں محمل کشِ حسرت (۳)
مبادا ہو عناں گیرِ تغافل لطفِ عام اُس کا

(۱) "برہمن شرم" پابندِ شرم وحجاب۔ "باوصف شوخی" باوجود شوخی۔ شوخی کے اہتمام سے اشارہ ہے کارسازیوں اور قدرت فرمائیوں کی طرف۔ "نگیں" نگینہ۔ "شرار" پتنگا۔ یعنی باوجود شوخی وظہور کے اس کی کارفرمائیاں اور قدرت آرائیاں اس کے جمال کے لئے حجاب ہیں اور ہر نگیں سے اُس کا نام اس طرح غیر نمایاں ہے جس طرح مادہ آتش پتھر میں، حالانکہ پتھر میں آگ ضرور ہے اور نگیں پر اس کا نام نامی بھی ہے لیکن اس کی کارفرمائیاں باوجود ظہور اُس پر سے حجاب نہیں اُٹھاتیں۔

(۲) "مسی آلودہ" مسی لگی ہوئی۔ مُہر اور داغ میں تشبیہ ہے اور داغ اور مسی میں یکرنگی۔ مطلب ہے کہ خط کی مُہر پر مسی کا نشان ہے گویا میرے دل میں جو آرزوئے بوسہ نے داغ ڈال دیا تھا اُس کا رنگ اُن لبوں پر نمایاں ہوا اور اب وہی رنگ آرزوئے بوسہ اُس کی طرف سے پیامِ بوسۂ لب کی صورت میں مجھ تک پہنچا ہے۔

(۳) تحمل کشِ حسرت اور عنایت گیر میں عایت ہے یعنی میں نگاہ خاص کی امید و حسرت کر رہا ہوں ایسا نہ ہو کہ اُن کا لطفِ عام مجھ ہی سے تغافل کر گزرے۔

دود کو آج اُس کے ماتم میں سیہ پوشی ہوئی
وہ دلِ سوزاں کہ کل تک شمع ماتم خانہ تھا (۱)

شکوہ یاراں غبارِ دل میں پنہاں کر دیا
غالبؔ ایسے گنج کو شایاں یہی ویرانہ تھا (۲)

(۱) "دود" دھواں۔ دھوئیں کے رنگ کو سیاہ پوشی و ماتم سے تعبیر کیا ہے یعنی وہ دلِ سوزاں جو ماتم خانۂ ارمان و تمنا کے لئے باعتبار سوز کے شمع بزمِ ماتم کے مثل تھا آج مطلقاً جل گیا اور صرف دھواں باقی رہ گیا جو معلوم ہوتا ہے کہ اُس کے ماتم میں سیاہ پوش ہے۔

(۲) "غبار دل" غبارِ خاطر۔ ویرانہ سے دل کا استعارہ ہے۔ گویا دل میں کچھ باقی ہی نہیں۔ خواہشوں۔ تمناؤں اور طلبیوں کا حشر ہو چکا۔ شکوۂ احباب چونکہ انکی دلچسپیوں اور مداراتوں پر منحصر ہوتا ہے اس لئے اس کو گنج سے تعبیر کرنا نامناسب اور رعایت سے خالی نہیں۔ "شایاں" لائق مستوجب۔ یعنے دوستوں کی شکایت غبارِ دل میں پوشیدہ ہو گئی۔ (سرزمین دل میں تو کچھ رہا ہی نہ تھا ویرانہ تھا اس سرزمین کے غبار میں گنج شکایت کا پنہاں ہونا یہ معنی رکھتا ہے کہ شکایت ہی باقی نہ رہی) ایسے خزانہ کے لئے ایسا ہی ویرانہ چاہئے تھا۔

پھر وہ سوئے چمن آتا ہے خدا خیر کرے	۱	رنگ اڑتا ہے گلستاں کے ہواداروں کا

(۱) "ہواداران چمن" یعنی پھول - یا پھولوں کے خیر طلب -

پھر ہوا وقت کہ ہو بال کشا موجِ شراب
(۱)
دے بطِ مے کو دل و دستِ شنا موجِ شراب

پوچھ مت وجہِ سیہ مستیِ اربابِ چمن
(۲)
سایۂ تاک میں ہوتی ہے ہوا موجِ شراب

جو ہوا غرقۂ مے بختِ رسا رکھتا ہے
(۳)
سر سے گزرے پہ بھی ہے بالِ ہما موجِ شراب

ہے یہ برسات وہ موسم کہ عجب کیا ہے اگر
(۴)
موجِ ہستی کو کرے فیضِ ہوا موجِ شراب

چار موج اٹھتی ہے طوفانِ طرب سے ہر سو
(۵)
موجِ گل موجِ شفق موجِ صبا موجِ شراب

جس قدر روحِ نباتی ہے جگر تشنۂ ناز
(۶)
دے ہے تسکیں بدمِ آبِ بقا موجِ شراب

بسکہ دوڑے ہے رگِ تاک میں خوں ہو ہو کر
(۷)
شہپرِ رنگ سے ہے بال کشا موجِ شراب

موجۂ گل سے چراغاں ہے گزرگاہِ خیال
(۸)
ہے تصور میں زبس جلوہ نما موجِ شراب

نشے کے پردے میں ہے محوِ تماشائی دماغ
(۹)
بسکہ رکھتی ہے سرِ نشو و نما موجِ شراب

(۱۰) ایک عالم پہ ہیں طوفانیِ کیفیتِ فصل

موجۂ سبزۂ نوخیز سے تا موجِ شراب

شرحِ ہنگامۂ ہستی ہے زہے موسمِ گل
(۱۱)
رہبرِ قطرہ بدریا ہے خوشا موجِ شراب

ہوش اُڑتے ہیں مرے جلوۂ گل دیکھ اسدؔ
(۱۲)
پھر ہوا وقت کہ ہو بال کشا موجِ شراب

(۱) "بال کشا" آمادہ پرواز۔ موجِ شراب کی بال کشائی سے جوشِ شراب یا دورۂ ساغر کی جانب اشارہ ہے۔ "بط مے" بط کی شکل کا ایک ظرف جس میں شراب بھرتے ہیں۔ "دل" ہمت۔ "دست" طاقت۔ "دل دوست" موقع یا اجازت۔ "شنا" تیرنا۔ بط کی رعایت سے یہ لفظ استعمال کیا ہے مقصود دور ہے مطلب یہ ہے کہ اب وہ وقت آگیا ہے کہ شراب میں جوش پیدا ہو۔ دورۂ ساغر اور مے خواری ہو۔

(۲) "سیہ مستی" بدمستی نشاط، مدہوشی۔ سایہ و سیاہ میں تشبیہ ہے۔ "تاک" انگور کی بیل یعنی اہلِ چمن کی سیہ مستی کا سبب کیا پوچھتے ہو کیونکہ انگور کی بیل کے سایہ میں (غالباً اثرِ مصاحبت سے) ہوا میں شراب کی تاثیر ہو جاتی ہے۔

(۳) "بخت رسا" اور سر سے گزرنے کی رعایت سے "بالِ ہما" لایا گیا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ نشۂ مے حد سے گزرنے پر بھی عیش و نشاط سے خالی نہیں ہوتا۔

(۴) "موجِ ہستی" روح سے استعارہ ہے یا میلان و رجحان اور کیفیات و جذبات روحانی مراد ہیں۔ یعنی یہ برسات ایسا

خوشگوار موسم ہے کہ فیض ہوائے لطیف سے اگر رُوح متکیف اور جذبات سے سرشار ہو جائے تو کوئی تعجب نہیں۔

(۵) "طوفانِ طرب" شدتِ طرب۔ گویا موجِ گل، موجِ شفق، موجِ صبا اور موجِ شراب عالمِ مسرت وطرب کے بہترین مظاہر و منظر ہیں (موج کی ترکیب تمام الفاظ میں طوفان کی رعایت سے واقع ہوتی ہے)

(۶) "رُوحِ نباتی" قوتِ نشو و نما۔ قوتِ نامیہ۔ "جگر تشنۂ ناز" طلبگارِ نمو اور نشو و نما حاصل کرنے کا جوش و ہیجان "تسکین" کا لفظ جگر تشنہ کی رعایت سے استعمال ہوا ہے اور اسی رعایت سے "آبِ بقا" جس سے مُراد باران ہے۔ جس قدر سے اشارہ ہے عام رُوحِ نباتی کی جانب جو تمام کائنات اور انسانوں میں ہے۔ "ناز" کا لفظ نامیہ انسانیہ ہی کے لئے خاص ہے۔ اور یہاں ولولہ اور مستی و نشاط مقصود ہیں مطلب ہے کہ جس طرح بارش کا پانی نبات کی پیاس بجھاتا ہے اُسی طرح نامیۂ انسانیہ کے لئے برسات میں شراب وجہ تحریک و نمو ہوتی ہے۔

(۷) "رگ" ریشہ۔ "رنگ" بیل کی سبزی وغیرہ کی طرف اشارہ ہے اور رنگ اُڑنے کی رعایت سے "شہپر اور بال کشا" استعمال ہوتے ہیں یعنی انگور کی بیل کے ریشوں وغیرہ میں شراب خون کی طرح سرایت کرتی ہے اور پتّوں میں رنگ بن کر نمودار ہوتی ہے۔

(۸) "گل وچراغاں" میں تشبیہ ہے۔ اور شراب وگل میں بھی
رنگ وجہ شبہ ہے۔ اور "جلوۂ گل" نورِ چراغاں اور جلوہ تماشائی
موجِ شراب سب رعایات ہیں۔ اور شراب کا ایک نام گل
بھی ہے۔ مطلب ہے کہ تصور میں شراب جلوہ نما ہے
اس لئے گذرگاہِ خیال روشن ہے۔

(۹) دماغ نظامِ عصبی کا مرکز اور حسیات و مدرکات وغیرہ کا منبع
و منشا ہے۔ "سرِ خیال" نشہ اور منشا (دماغ) ایک قبیل و مادہ
کے الفاظ ہیں۔ مطلب ہے کہ شراب جو نشہ بن کر دماغ میں
پہنچی اور دماغ میں گھومتی (محوِ تماشا) ہے۔ غالباً نشوونما
چاہتی ہے یا یہی اس کے لئے نشوونما ہے۔

(۱۰) "طوفانی" شدت زیادتی۔ "سبزۂ نوخیز" نیا اُگا ہوا سبزہ یعنی
فصلِ بہار نے سبزہ و شراب سب پر کیفیت و رونق اور لطف
پیدا کر دیئے ہیں (سبزۂ نوخیز کے ساتھ موجہ کی ترکیب بھی
طوفانی کی رعایت سے ہے)

(۱۱) "شرح" تفصیل۔ نمایش۔ "ہنگامۂ ہستی" موجودات و کائنات
"رہبرِ قطرہ بدریا" قطرہ کو دریا سے ملا دینے والا۔ موسمِ گل
موسمِ بہار میں نشو و ارتقا کا ظہور زیادہ نمایاں اور عام ہوتا ہے
اور اس موسم میں نامیہ کی کار پردازیاں تخلیق و تکوین عالم کی
مثال کو زندہ و تازہ کر دیتی ہیں۔ پھر اس عالم میں ہمارے لئے
دو ہی چیزیں ہیں۔ مخلوقات و کائنات اور خالق و تکوین۔
مخلوقات کی کیفیت نظارۂ نشوونما سے معلوم ہوتی ہے اور

ذات خالق تک رسائی کے لئے مظاہر سے قطع نظر کرنا ضروری ہے۔ موسم گل سے ہمیں علم نشو و ارتقا حاصل ہوتا ہے اور شراب سے خود فراموشی و عالم فراموشی یعنی خودی مٹنا اور ماسوا اللہ کا معدوم ہوتا ہے۔ پھر یہ خودی اور عالم فراموشی ہی وہ راہ ہے جس سے ذات باری تک رسائی ہوتی ہے اور چونکہ ہمارا وجود باعتبار تنزلات ذات کے ایک قطرہ ہے اُس دریائے حقیقت کا۔ اِس لئے اس قطرہ کی دریائے حقیقت تک رسائی مقصد حیات ہے۔ نیز شراب سے یہی شراب مُراد نہیں بلکہ مستی و نشاط عشق الٰہی مقصود ہے پس مطلب یہ ہے کہ دُنیا میں دو ہی چیزیں قابلِ غور ہیں وجود اور حقیقت۔ وجود کی تفسیر و تشریح مطالعۂ کائنات سے معلوم ہو جاتی ہے اور حقیقت شناسی خود فراموشی و عالم فراموشی سے میسّر آتی ہے۔

(۱۲) ہوش اُڑنا۔ محاورہ ہے۔ اور اُڑنے کے لئے بال کُشا اور ہوش اُڑنے کے لئے بال کُشائی موج شراب بہترین مناسبت ہے مطلب یہ ہے کہ موسم بہار سے طبیعت پر ضبط و قابو نہیں اور بس عین مے نوشی کا وقت ہے۔

۱	افسوس کہ دنداں کا کیا رزق فلک نے	جن لوگوں کی تھی درخورِ عقدِ گہر انگشت
۲	کافی ہے نشانی تری چھلے کا نہ دینا	خالی مجھے دکھلا کے بوقتِ سفر انگشت
۳	لکھتا ہوں اسدؔ سوزشِ دل سے سخنِ گرم	تا رکھ نہ سکے کوئی مرے حرف پر انگشت

(۱) "دیدان" (کیڑے) "عقد گوہر" انگشتر گوہر موتیوں اور کیڑوں میں تشبیہ ہے (یعنی ابھی ان کے خاک میں ملنے کے دن نہ تھے)

(۲) یہ شوخی یادگار رہے کہ نشانی مانگتے وقت تونے انگوٹھا دکھایا یا خالی انگلی دکھادی کہ انگلی میں چھلا نہیں۔

(۳) "حرف پر انگلی رکھنا" غلطی کی گرفت یا عیب چینی کرنا۔ یعنی گرمیٔ سخن سے حرف بھی جلتے ہیں اب اگر کوئی عیب چینی کے لئے انگلی حرفوں پر رکھے گا تو انگلیاں جل جائیں گی۔

رہا گر کوئی تا قیامت سلامت	۱	تو اک روز مرنا ہے حضرت سلامت
جگر کو مرے عشق خونابہ مشرب	۲	لکھے ہے خداوند نعمت سلامت
علی الرغم دشمن شہید وفا ہوں	۳	مبارک مبارک سلامت سلامت
نہیں گر سر و برگ ادراک معنی	۴	تماشائے نیرنگ صورت سلامت

(۲) "مشرب" طریق و مسلک لیکن یہاں لفظی رعایت سے استعمال کیا گیا ہے۔ مطلب صرف یہ ہے کہ عشق خون جگر سے پرورش پاتا ہے۔

(۳) "علی الرغم" ضد و مخالف۔ اس میں رعایات یہ ہیں کہ رقیب کی ضد وخلاف منشا میں شہید وفا ہوا اس لئے مبارک باد چونکہ شہادت اعتقاداً زندگی جاوید ہے اس لئے "سلامت"۔

(۴) "سر و برگ" ساز و سامان مراد اہلیت۔ "ادراک" علم عقلی "معنی" حقیقت۔ "صورت" مجاز۔ "نیرنگ" عجائبات یعنی اگر حقیقت شناسی کی اہلیت نہ ہو تو عجائبات مجاز کی ظاہری سیر بھی

خالی از لطف نہیں۔

مُند گئیں کھولتے ہی کھولتے آنکھیں غالب	۱	یار لائے مِرے بالیں پہ اُسے، پر کس وقت

(۱) یعنی اتنے وقفہ میں کہ آنکھیں کھول کر دیدارِ یار کروں آنکھیں ہمیشہ کے لئے بند ہو گئیں (یعنی موت آگئی) احباب اُن کو لائے بھی تو آخری وقت لائے۔

آمدِ خط سے ہوا ہے سرد جو بازارِ دوست		دودِ شمعِ کشتہ تھا شاید خطِ رخسارِ دوست
اے دلِ ناعاقبت اندیش ضبطِ شوق کر		کون لا سکتا ہے تابِ جلوۂ دیدارِ دوست
خانہ ویراں سازیِ حیرت تماشا کیجئے		صورتِ نقشِ قدم ہوں رفتۂ رفتارِ دوست
عشق میں بیدادِ رشکِ غیر نے مارا مجھے		کشتۂ دشمن ہوں آخر گرچہ تھا بیمارِ دوست
چشمِ ما روشن کہ اُس بیدرد کا دل شاد ہے		دیدۂ پُرخوں ہمارا ساغرِ سرشارِ دوست
غیر یوں کرتا ہے میری پرسش اُس کے ہجر میں	ق	بے تکلف دوست ہو جیسے کوئی غمخوارِ دوست
تاکہ میں جانوں کہ ہے اس کی رسائی واں تلک		مجھ کو دیتا ہے پیامِ وعدۂ دیدارِ دوست
جبکہ میں کرتا ہوں اپنا شکوۂ ضعفِ دماغ		سر کرے ہے وہ حدیثِ زلفِ عنبر بارِ دوست
چپکے چپکے مجھ کو روتے دیکھ پاتا ہے اگر		ہنس کے کرتا ہے بیانِ شوخیِ گفتارِ دوست
مہربانیہائے دشمن کی شکایت کیجئے		یا بیاں کیجے سپاسِ لذتِ آزارِ دوست

یہ غزل اپنی مجھے جی سے پسند آتی ہے آپ
ہے ردیفِ شعر میں غالب ز بس تکرارِ دوست

(۱) "سرد بازار ہو جانا" محاورہ ہے جس کے معنی طلب باقی نہ رہنا وغیرہ وغیرہ ہیں۔ "بازارِ دوست" سرد ہو جانے سے کمی عشق و عشاق مراد ہے۔ "خط آنا" داڑھی نکلنا اور بالوں کے رنگ کی تشبیہ "دود" اور "رخسار" کی شمع سے دی ہے۔ نیز سرد اور شمع

کشتہ میں رعایت ہے۔ خیال بالکل ایرانی شاعری کا سا ہے جو ذوقِ سلیم کو مرغوب نہیں۔

(۳) "حیرانی" اور نقشِ قدم میں عدمِ حرکت وجہ شبہ ہے۔ "خانہ ویراں سازی" گھر کی تباہی "رفتہ" وارفتہ بے خود اور لفظی طور پہ وارفتۂ رفتار سے پس ماندۂ رفتار یعنی نقشِ قدم مترشح ہوتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ میں ایسا وارفتۂ خرامِ یار ہوں کہ دوسری کسی بات کی خبر ہی نہیں اور یہی بے خبری و عالمِ فراموشی خانہ ویراں ساز ہے۔ گویا اُس کے چلے جانے کے بعد میں مٹا ہوا سا نقشِ قدم ہوں۔

(۴) رشکِ رقیب میں مرنے کو کشتۂ دشمن اور عشق کو بیمارئ دوست سے تعبیر کیا ہے۔

(۵) چشم ما روشن دلِ ما شاد مشہور محاورہ ہے جو شعر میں مخصوص بندش کے ساتھ نظم ہوا ہے۔ دیدۂ خونفشاں اور ساغرِ مے میں تشبیہ ہے چشم و دل کے دو متضاد احوال بیان کئے ہیں یعنی گو ہم خون روتے ہیں اور وہ مے نوشی کے عیش میں گذارتے ہیں۔ لیکن ہم ہر حال میں خوش ہیں کہ وہ خوش ہیں۔

(۶) (قطعہ ہے) اور رعایاتِ لفظی سے بھرا ہوا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ رقیب بجائے تسکین اور دلاسے کے ہر بات اُن کی یاد دلاتا اور سمندِ اضطراب پر تازیانہ لگاتا رہتا ہے۔ اور مجھے حیرت ہے کہ دوست کے لطفِ ستم کی تعریف کروں یا دشمن کی عنایت کی شکایت۔

گلشن میں بندوبست برنگِ دگر ہے آج	۱	قمری کا طوق حلقۂ بیرونِ در ہے آج
آتا ہے ایک پارۂ دل ہر فغاں کے ساتھ	۲	تارِ نفس کمندِ شکارِ اثر ہے آج
اے عافیت کنارہ کر اے انتظام چل	۳	سیلابِ گریہ درپئے دیوار و در ہے آج
معزولیٔ تپش ہوئی، افراطِ انتظار	۴	چشمِ کشودہ حلقۂ بیرونِ در ہے آج

(۱) "بندوبست" لغوی طور پر اس کے معنی روک تھام کے اور عام طور پر انتظام و اہتمام کے ہیں "حلقۂ بیرونِ در" دروازہ کی بیرونی زنجیر باغ کے اندرونی اہتمام اور بیرونی روک ٹوک کے لئے ضروری تھا کہ دروازۂ باغ کی زنجیر اندر سے لگائی جائے لیکن حلقۂ بیرونِ در سے معلوم ہوتا ہے کہ باہر سے دروازہ بند کیا گیا ہے۔ پھر قمری کے طوق کا قرینہ کچھ اور چاہتا ہے۔ قمری کے طوق کو شعرا گرفتاریٔ عشق سے تعبیر کرتے اور قمری کو سروِ آزاد کی عاشق قرار دیتے ہیں اور عشاق کے لئے آدابِ عاشقی بھی وصال کے منافی ہیں اور حقیقی وصل یہ ہے کہ ہمہ تن محبوب اور یکسر محبوبیت ہو جائے اور تقیدات عاشقی اٹھا دیئے جائیں۔ چنانچہ غالباً قمری کا طوق حلقۂ بیرونِ در سے یہی اشارہ ہے مطلب یہ ہے کہ چمن میں آج عجیب اِنتظام ہے۔ اغیار و اجانب کا گذر نہیں۔ عشاق و معشوق یکرنگ و واصل ہیں اور اندر یکسر معشوقیت و محبوبیت کی شادمانیاں اور مسرتیں جمال آرا ہیں۔ دوسرا مطلب یہ بھی نکلتا ہے کہ باہر دروازہ بند کرنے کا بندوبست غالباً اِس لئے ہے کہ بیگانوں کی صرف روک تھام ہی نہیں بلکہ ان کا گمان و خیال بھی اس طرف

نہ جانے کہ باغ میں کچھ ہے اور خدا جانے ایسے عالم راز میں کیا ہو رہا ہے۔

(۲) "پارۂ دل" لخت دل "فغاں" نالہ "نفس" سانس تارِ نفس۔ کمند کی رعایت وتشبیہ کی وجہ سے کہا گیا ہے "شکار اثر" اثر جو شکار رہوا ہے۔ یعنی تاثیر جو حاصل و میسر ہوئی ہے۔ مطلب ہے کہ آج ہر نالہ کے ساتھ ایک پارۂ دل باہر آتا ہے گویا سانس کی کمند میں اثرِ نالہ پارۂ دل کی صورت میں شکار ہوتا ہے۔

(۳) "عافیت و انتظام" سیلاب کی رعایات ہیں۔ شدّتِ گریہ کے لئے کنارہ کشی عافیت رخصتِ انتظام اور خطرۂ دیوار ودر شاعرانہ مبالغے ہیں۔

(۴) "معزولی" علیحدگی "تپش" جلن۔ "افراط" زیادتی "چشم کشودہ" کھلی ہوئی آنکھ "چشمِ انتظار" چشم کشودہ اور حلقۂ زنجیر میں تشبیہ ہے۔ یعنی انتظار کی زیادتی نے کیفیت اضطراب و سوز دل کو دور کر دیا ہے اور دروازہ کی جانب ہمہ تن انتظار ہو کر اس طرح دیکھ رہا ہوں گویا حلقۂ زنجیر میری چشم منتظر بن گئی ہے۔

نفس نہ انجمنِ آرزو سے باہر کھینچ	۱	اگر شراب نہیں انتظارِ ساغر کھینچ
کمالِ گرمیِ سعیِ تلاشِ دید نہ پوچھ	۲	برنگِ خار مرے آئنہ سے جوہر کھینچ
تجھے بہانۂ راحت ہے انتظار اے دل	۳	کیا ہے کس نے اشارہ کہ نازِ بستر کھینچ
تری طرف ہے بحسرت نظارۂ نرگس	۴	بکوریِ دل و چشمِ رقیب ساغر کھینچ

بہ نیم غمزہ ادا کر حقِ ودیعتِ ناز مرے قدح میں ہے صہبائے آتشِ پنہاں	۵	نیامِ پردۂ زخمِ جگر سے خنجر کھینچ بروئے سفرہ کبابِ دلِ سمندر کھینچ

(۱) یعنی ایک سانس بھی انجمن آرزو سے باہر نہ گذارو یا بغیر آرزو اور تمنا کے ایک سانس بھی نہ لو، اگر شراب نہ ہو تو جامِ شراب کا اِنتظار ہی سہی، غرضکہ عیش طلبی کی سعی سے غافل نہ ہونا چاہیئے۔

(۲) "برنگ خار" کانٹوں کی طرح، جوہر آئینہ اور خار میں تشبیہ ہے۔ آئینہ اشتیاقِ دید سے استعارہ ہے یعنی تلاشِ دیدار میں جس سرگرمی سے میں پھرتا ہوں، اس کا حال کیا پُوچھتے ہو، آئینۂ اشتیاق دید کے جوہر اگر دیکھے ہوں، تو وہ کانٹے ہیں، جو اس چکر میں، میرے پاؤں میں چبھے ہیں۔

(۳) "نازِ بستر اُٹھانا" آرام و راحت کے مزے لوٹنا۔ دل سے خطاب ہے، کہ یہ جو بستر پر پڑے پڑے اِنتظار کیا جا رہا ہے، سب آرام طلبی کا بہانہ ہے، تجھ سے کس نے کہا، کہ نازِ بستر اُٹھا۔

(۴) "چشمِ نرگس" کو شعرا کور بھی لکھتے ہیں۔ نرگس و ساغر میں تشبیہ ہے اور شراب کسی کی یاد میں پیتے ہیں۔

(۵) "نیم غمزہ" نگاہِ غلط انداز سے استعارہ ہے۔ "ودیعت" امانت۔ پردۂ زخمِ جگر سے نیام کی تشبیہ ہے۔ یعنی ناز پار نے جو خنجر پردۂ زخمِ جگر میں نیام کر دیا، اس امانت کا حق ہے کہ نگاہِ غلط انداز سے خنجر کو بے نیام کر دے۔ گویا، ناز سے جو

کسر باقی رہ گئی ہے۔ اُس کو غمزہ پورا کرے گا۔
(۶) "قدح" پیالہ۔ دل سے استعارہ ہے "صہبا" شراب "آتشِ پنہاں" عشقِ جانسوز "سفرہ" دسترخوان۔ سمندر اُس کیڑے کا نام ہے، جو آگ میں نشوونما پاتا ہے۔ مطلب ہے کہ میرا دل ایک ساغر ہے جس میں شرابِ عشق موجود ہے اس لئے اُس کی مناسبت سے دل سمندر کے کباب درکار ہیں۔

---

(۱)
حسن غمزے کی کشاکش سے چھٹا میرے بعد
بارے آرام سے ہیں اہلِ جفا میرے بعد

(۲)
منصبِ شیفتگی کے کوئی قابل نہ رہا
ہوئی معزولیِ انداز و ادا میرے بعد

(۳)
شمع بجھتی ہے تو اس میں سے دُھواں اُٹھتا ہے
شعلۂ عشق سیہ پوش ہوا میرے بعد

(۴)
خوں ہے دل خاک میں احوالِ بتاں پر یعنے
اُن کے ناخن ہوئے محتاجِ حنا میرے بعد

(۵)
درخورِ عرض نہیں جوہرِ بیداد کو جا
نگہِ ناز ہے سُرمے سے خفا میرے بعد

(۶)
ہے جنوں اہلِ جنوں کے لئے آغوشِ وداع
چاک کرتا ہے گریباں سے جُدا میرے بعد

(۷)
کون ہوتا ہے حریفِ مےِ مرد افگنِ عشق
ہے مکرر لبِ ساقی پہ صلا میرے بعد

(۸)
غم سے مرتا ہوں کہ اتنا نہیں دُنیا میں کوئی

کہ کرے تعزیت مہر و وفا میرے بعد
آئے ہے بیکسیِ عشق پہ رونا غالبؔ
کس کے گھر جائے گا سیلابِ بلا میرے بعد

(۹)

(۱) یعنی میرے مرنے کے بعد اہلِ حسن کو غمزہ روائی کی تکلیف سے فرصت ہو گئی۔

(۲) "نصب" تقرر و تعین "معزولی" برخواست کرنا یعنی آب شیفتگی و وارفتگی کی خدمت انجام دینے کے لائق کوئی باقی نہ رہا۔ اِس لئے میرے بعد ناز و انداز حسن معطل کر دیئے گئے۔

(۳) یعنی شعلۂ عشق کی بقا میرے دم سے تھی، میرے مرتے ہی یہ شعلہ بجھ گیا۔ اور شمع جب بجھتی ہے تو دھواں نکلتا ہے پس شمع عشق کے بجھنے سے جو دھواں نکلتا ہے وہ گویا میرے ماتم میں عشق کی سیہ پوشی ہے۔

(۴) یعنی حسینوں کے ناخن میرے خون سے رنگے جاتے تھے اور چونکہ میرے بعد حنا کی احتیاج ہو گئی اِس لئے تہ خاک میرا دل اُن کی اس حاجتمندی پر خون ہوا جاتا ہے ـــــ یا یہ کہ اُن کے ناخنوں کو حنا کی ضرورت ہے اور میرا سوگ مانع حنا بندی ہے۔ اس رنج سے میرا دل خون ہوا جاتا ہے کہ میری وجہ سے اُن کی آرائش میں فرق آ رہا ہے۔

(۵) "درخورِ عرض" قابلِ اظہار۔ مطلب ہے کہ میرے بعد نگۂ ناز سرمہ سے خفا ہے، کیونکہ اس جوہرِ بیداد سے کام لینے کا کوئی موقع نہیں رہا۔

(۶) "آغوش وداع" رخصتی بغل گیری۔

(۷) "حریف مقابل" "مئے مرد افگن عشق" وہ شراب عشق جس کی مستی کو بڑے بڑے اہل ہمت ضبط نہ کر سکیں۔ "صلا" اذن "مکرر" کے لفظ سے سوال وجواب دونوں حاصل ہوتے ہیں۔ یعنی میرے مرنے کے بعد ساقی حسن وعشق، پیمانہ عشق لے کر کہتا ہے، کہ کوئی ہے جو اس مئے مردفگن کا مقابل ہو" (یعنی اس جام عشق کو پی سکے) اس خطاب وصلا پر آوازے برخواست کا مضمون ہوتا ہے، مجبور و مایوس ہو کر مکرر خود ساقی کہتا ہے کہ "ہاں" بھلا کون اس کا مقابل ہو سکتا ہے!

(۸) یہ غم مجھے اور بھی ہلاک کئے دیتا ہے کہ میرے بعد تعزیت مہر ووفا بھی کوئی نہیں کر سکتا۔ یعنی وفا تو وفا، کوئی تعزیت وفا بھی نہیں کرتا۔

(۹) "سیلاب بلا" طوفانِ مصائب۔ استعارہ ہے عشق سے اور سیلاب کا نتیجہ گھروں اور آبادیوں کی بربادی ہوتا ہے اگر یہ نہ ہو تو سیلاب کی ناکامی و بے اثری ہے۔ مطلب ہے کہ عشق ویراں ساز کی میزبانی کرنے والا میرے بعد کوئی نہیں اور اس کی اس بیکسی پر رونا آتا ہے کہ اس سیلاب بلا کے لئے کوئی ٹھکانا باقی نہ رہے گا۔

بلا سے ہیں جو یہ پیشِ نظر در و دیوار	۱	نگاہِ شوق کو ہیں بال و پر در و دیوار
وفورِ اشک نے کاشانے کا یہ رنگ کیا	۲	کہ ہو گئے مرے دیوار و در، در و دیوار

نہیں ہے سایہ کہ سن کر نویدِ مقدمِ یار	۳	گئے ہیں چند قدم پیشتر در و دیوار
ہوئی ہے کس قدر ارزانیٔ مئے جلوہ	۴	کہ مست ہے ترے کوچے میں ہر در و دیوار
جو ہے تجھے سرِ سودائے انتظار تو آ	۵	کہ ہیں دکانِ متاعِ نظر در و دیوار
وہ آ رہا مرے ہمسایہ میں تو سایہ سے	۶	ہوئے فدا در و دیوار پر در و دیوار
نظر میں کھٹکے ہے بن تیرے گھر کی آبادی	۷	ہمیشہ روتے ہیں ہم دیکھ کر در و دیوار
ہجومِ گریہ کا سامان جب کیا میں نے	۸	کہ گر پڑے نہ مرے پاؤں پر در و دیوار
نہ پوچھ بیخودیٔ عیشِ مقدمِ سیلاب	۹	کہ ناچتے ہیں پڑے سر بسر در و دیوار

۱۰

نہ کہہ کسی سے کہ غالب نہیں زمانے میں
حریفِ رازِ محبت مگر در و دیوار

(۱) یعنی در و دیوار کے حجابات میں صاحبِ خانہ (محبوب) ہم سے محجوب نہیں رہ سکتا، کیونکہ در و دیوار سے جب نگاہیں رکتی ہیں، طبیعت الجھتی ہے، اضطراب بڑھتا ہے اور جوشِ شوق کا وفور ہوتا ہے۔ نگاہ شوق کی تلاش و جستجو زیادہ ہو جاتی ہے۔ گویا در و دیوار افزائش اشتیاق کے سبب ہوتے ہیں۔ غرضکہ نگاہ شوق کے لئے در و دیوار "بال و پر" ہو جاتے ہیں۔

(۲) "وفورِ اشک" آنسوؤں کا تار۔ یا رونے کی کثرت "کاشانہ" مکان "برنگ" حال یعنی رونے کے طوفان نے دروازوں کو گرا دیا ہے، اور دروازوں کے سامنے انبار ہو گیا ہے یعنی ایک دیوار سی بن گئی ہے، اور دیواروں کی شکستگی سے دروازے سے بن گئے ہیں۔

(۳) "نوید" "خوشخبری" "مقدم" "آمد۔ یعنی سایۂ دیوار نہیں ہے، بلکہ دوست کے خیر مقدم کے لئے در و دیوار آگے بڑھے ہیں۔

(۴) جلوۂ در و دیوار، یار کو مے سے تعبیر کیا ہے، اور یہ مبالغۂ کلام ہے کہ در و دیوار پر بھی مستی و نشاط کا عالم ہے۔

(۵) "متاع" جنس مراد ہے۔ "متاعِ نظر" انتظار سے استعارہ ہے۔ "سرِ سودا" خیالِ خریداری۔ یعنی اگر تجھ کو سودائے انتظار خریدنا ہو تو آ۔ در و دیوار اس جنس کی دکان ہے کیوں کہ میری پر شوق نگاہیں، اور در و دیوار پہ جم گئی ہیں)

(۶) یعنی میرے گھر کی در و دیوار کا سایہ اُس کے در و دیوار پر پڑتا تھا گویا میرے در و دیوار اُس کے در و دیوار پہ قربان و فدا ہو رہے تھے۔

(۷) ویرانی و صحرا کے مقابلہ میں "آبادی" در کا ثبت ہے اور در و دیوار سے مقصود ہے۔ اب آنکھوں میں کسی شے کے کھٹکنے سے آنسو جاری ہو جاتے ہیں۔ تو گویا یہ آبادی ناگوار ہے، اور گریہ ہجر و فراق کی غایت یہی ہے۔

(۸) مبالغہ ہے یعنی کبھی ایسا نہیں ہوا کہ میں نے رونے کی تیاری کی ہو اور در و دیوار گرنہ پڑے ہوں "پاؤں پڑنا" یعنی اظہارِ عجز کرنا کہ اگر آپ گریہ کریں گے تو سیلِ گریہ ہمیں بہا دے گا تو گویا بجز اس کے کوئی چارہ نہیں کہ بجائے سیلِ گریہ سے گرنے کے عجز و خوف سے گر پڑے۔

(۹) در و دیوار کے گرنے کو رقص سے تشبیہ دی ہے کہ آیا سیلاب

کی مسرت بربادی کا اظہار کیا ہے۔

(۱۰) غالب! ہمارا زِ محبت سننے کی تاب و طاقت کسی میں نہیں، در و دیوار بے جان و دل ہیں۔ اس لئے شاید یہ سن کر ساکت و جامد قائم رہ سکیں تو ان سے کہنا نہ کہنا برابر ہے۔

۱	گھر جب بنا لیا ترے در پر کہے بغیر	جانے گا اب بھی تو نہ مرا گھر کہے بغیر
۲	کہتے ہیں جب رہی نہ مجھے طاقتِ سخن	جانوں کسی کے دل کی میں کیونکر کہے بغیر
۳	کام اس سے آ پڑا ہے کہ جس کا جہان میں	لیوے نہ کوئی نام، ستمگر کہے بغیر
۴	جی ہی میں کچھ نہیں ہے ہمارے وگرنہ ہم	سر جائے یا رہے نہ رہیں پر کہے بغیر
۵	چھوڑنگا میں نہ اس بتِ کافر کا پوجنا	چھوڑے نہ خلق گو مجھے کافر کہے بغیر
۶	مقصد ہے ناز و غمزہ ولے گفتگو میں کام	چلتا نہیں ہے دشنہ و خنجر کہے بغیر
۷	ہر چند ہو مشاہدۂ حق کی گفتگو	بنتی نہیں ہے بادہ و ساغر کہے بغیر
۸	بہرا ہوں میں تو چاہیئے دونا ہو التفات	سنتا نہیں ہوں بات مکرر کہے بغیر
۹	غالب نہ کر حضور میں تو بار بار عرض ظاہر ہے تیرا حال سب اُن پر کہے بغیر	

(۲) یہ تمام بیانِ شعر بزبانِ حال ہے۔ کہ جب مجھ میں قوتِ گویائی باقی تھی اُس وقت تو پرسشِ حال فرمائی نہیں۔ اب سکوتِ موت کے وقت اِس رفعِ الزام کے لئے فرماتے ہیں کہ میں بھلا بغیر کہے کسی کے حالِ دل سے کس طرح واقف ہو سکتا ہوں۔

(۳) یعنی شہرۂ زمانہ جفا پیشہ سے واسطہ اُلفت قائم ہے۔

(۴) یعنی ہم جو چپ ہیں تو اس لئے کہ دل میں کچھ ہے ہی نہیں۔

ورنہ دل میں کچھ ہو تو بلا اندیشۂ انجام کہہ گذرتے ہیں۔

(۵) چاہے زمانہ مجھے کافر ہی کیوں نہ کہے لیکن میں اُس منکرِ عشق کی محبت سے منہ نہ موڑوں گا۔

(۶) مراد یہ ہے کہ مفہوم قلبی کی تفہیم کے لئے ضروری ہے کہ تمثیلات و تشبیہات سے کام لیا جائے۔

(۷) سچ یہ ہے کہ امثال و تشبیہ اگر نہ ہوں تو ہزاروں اثرات و کیفیات کے علم و تمیز اور سرسری احساس سے بھی انسان محروم رہ جائے۔ پس مشاہدۂ جمالِ حق کی گفتگو اگر ہو تو سوائے اس کے کیا چارۂ کار ہو سکتا ہے کہ ہم اُن تمثیلات سے کام لیں۔ جو ہمارے ذہن و فکر کے منتہائے پرواز تک پہنچتی ہوں۔

(۸) ایک مطالبۂ التفات ہے۔

(۹) یعنی بار بار عرض کرنے کی ضرورت نہیں۔ کیونکہ حضور کو بغیر کہے سب حال معلوم ہے۔

کیوں جل گیا نہ تابِ رخِ یار دیکھ کر	۱	جلتا ہوں اپنی طاقتِ دیدار دیکھ کر
آتش پرست کہتے ہیں اہلِ جہاں مجھے	۲	سرگرمِ نالہ ہائے شرربار دیکھ کر
کیا آبروئے عشق جہاں عام ہو جفا	۳	رکتا ہوں تم کو بے سبب آزار دیکھ کر
آتا ہے میرے قتل کو پر جوشِ رشک سے	۴	مرتا ہوں اُس کے ہاتھ میں تلوار دیکھ کر
ثابت ہوا ہے گردنِ مینا پہ خونِ خلق	۵	لرزے ہے موجِ مے تری رفتار دیکھ کر
واحسرتا کہ یار نے کھینچا ستم سے ہاتھ	۶	ہم کو حریصِ لذتِ آزار دیکھ کر
بک جاتے ہیں ہم آپ متاعِ سخن کے ساتھ	۷	لیکن عیارِ طبعِ خریدار دیکھ کر

زنار باندھ سبحۂ صد دانہ توڑ ڈال	۸	رہرو چلے ہے راہ کو ہموار دیکھ کر
ان آبلوں سے پاؤں کے گھبرا گیا تھا میں	۹	جی خوش ہوا ہے راہ کو پُر خار دیکھ کر
کیا بدگمان ہے مجھ سے کہ آئینے میں مرے	۱۰	طوطی کا عکس سمجھے ہے زنگار دیکھ کر
گرنی تھی ہم پہ برقِ تجلی نہ طور پر	۱۱	دیتے ہیں بادہ ظرفِ قدح خوار دیکھ کر
۱۲	سر پھوڑنا وہ غالبِ شوریدہ حال کا یاد آگیا مجھے تری دیوار دیکھ کر	

(۱) "جلتا ہوں" یعنی رشک سے جلتا ہوں (رشک و حسد سے جلنا محاورہ ہے) مطلب ہے کہ اگر برقِ جمال سے بچ گیا تو رشک سے جلتا ہوں۔ بہرحال جلتا ہوں!

(۲) "شرر باریِ نالہ" اور آتش پرستی کی رعایت لفظی ہے۔

(۳) "بے سبب آزار" بے وجہ ستانے والا معشوق کے ستانے کی صرف ایک ہی وجہ ہونی چاہئے۔ یعنی (اعتماد، وامتحان عشق) اور اگر محبوب امتحاناً اور اعتماداً نہ ستاتا ہو بلکہ عادتاً جفاجو ہو تو عشاق کو لذت الم نہیں ملتی، اور عمومیت میں امتیازِ عشق باقی نہیں رہتا!

(۴) یعنی تلوار اُن کے ہاتھ میں ہو، اور ہم اُس دستِ رنگین کو کبھی چھو بھی نہ سکے، اور گو وہ ہمارے ہی قتل کو آتے ہیں مگر ہم پہلے ہی سے ادائے تیغ کے رشک میں ہلاک ہوئے جاتے ہیں۔

(۵) سبحان اللہ۔ کیا ہی رنگین کلام ہے اور کیسا دل کش انداز بیان ہے۔ "مینا" اگرچہ نقوش جواہرین کو کہتے ہیں مگر شعرا کے

یہاں صراحی مے کے لیے مستعمل ہے۔ مطلب یہ ہے کہ تیری رفتار میں مستی و نشاط نے اور زیادہ متوالا پن پیدا کر دیا۔ جس کو دیکھ کر ہزاروں ہلاک خرام ہو گئے، تو گویا خلق اللہ کا یہ خون صراحی کی گردن پر سوار ہوا اور اس خون ناحق کے خوف سے موج مے کانپ رہی ہے۔

(۶) "واحسرتا" الفاظ تاسف میں سے ہے۔ یعنی افسوس انھوں نے مجھے لذت آزار کا طالب دیکھ کر ستم کرنا بھی چھوڑ دیا۔

(۷) "متاع" جنس فروختنی "سخن" کلام شاعر "عیار طبع" معیار طبیعت۔ یہاں قدر شناسی اور داد کی اہلیت مراد ہے۔ مطلب ہے کہ ہم تو کلام کے ساتھ خود بک جاتے ہیں، بشرطیکہ سامع میں قدر دانی، سخن سنجی، اور جوہر شناسی کی اہلیت ہو (خود بک جانے کا مفہوم ہے۔ وہ احسان ہونا ہے) یعنی اگر کوئی ہمارے کلام کی قدر کرے، تو ہم احسانمند بھی ہوتے ہیں۔

(۸) ظاہر ہے کہ سُبحہ (تسبیح) کے دانوں سے تاگے میں نشیب فراز پیدا ہو جاتے ہیں ان ہی نشیب و فراز سے ہمواری و ناہمواری راہ زنار و سُبحہ بیان کی ہے۔

(۹) یعنی اب کانٹوں سے آبلے ٹوٹ جائیں گے۔

(۱۰) "آئینہ"، دل سے، طوطی، معشوق سے، زنگار۔ بوشِ حرماں نصیبی، اور تکدر طبع سے استعارہ ہے "زنگار" و "طوطی" ہیں رنگ وجہ شبہ ہے مطلب ہے کہ وہ میرے آئینہ دل

ہیں، الوث حرماں نصیبی دیکھ کر یہ بدگمانی کرتا ہے کہ کسی اور کی محبت میں مبتلا ہے۔

(۱۱) جلوہ طور سے خطاب ہے کہ شراب، میخوار کا ظرف دیکھ کر دیا کرتے ہیں، بھلا پتھر میں برق جمال کی برداشت کہاں تھی یہ بجلی تو ہم ہی پر گرتی تو مناسب تھا!

(۱۲) یعنی اسی دیوار سے سر پھوڑا کرتا تھا، دیوار دیکھنے سے غالب یاد آگیا۔

---

(۱)
لرزتا ہے میرا دل زحمت مہر درخشاں پر
میں ہوں وہ قطرۂ شبنم کہ ہو خار بیاباں پر

(۲)
نہ چھوڑی حضرت یوسف نے یاں بھی خانہ آرائی
سفیدی دیدۂ یعقوب کی پھرتی ہے زنداں پر

(۳)
فنا تعلیم درس بیخودی ہوں اُس زمانے سے
کہ مجنوں لام الف لکھتا تھا دیوار دبستاں پر

(۴)
فراغت کس قدر رہتی مجھے تشویش مرہم سے
بہم گر صلح کرتے پارہ ہائے دل نمکداں پر

(۵)
نہیں اقلیم الفت میں کوئی طومار ناز ایسا
کہ پشت چشم سے جسکے نہ ہووے مہر عنواں پر

(۶)
مجھے اب دیکھ کر ابر شفق آلودہ یاد آیا
کہ فرقت میں تری آتش برستی تھی گلستاں پر

(۷)
بجز پرواز شوق ناز کیا باقی رہا ہوگا
قیامت اک ہوائے تند ہے خاک شہیداں پر

(۸)

نہ لڑ ناصح سے غالب کیا ہوا گر اُس نے شدت کی
ہمارا بھی تو آخر زور چلتا ہے گریباں پر

(۱) "لفظ بیاباں" کو پہلے نظر رکھ کر اگر خیال آفرینی سے کام لیا جائے، تو "زحمتِ مہرِ درخشاں" کا یہ مفہوم ہوگا، میدانِ فلک کو طے کرنے اور اس وحدت وحرارت میں خود آفتاب پہ کیا کچھ تکلیف نہ گذرتی ہوگی باقی شعر میں، زحمتِ مہرِ درخشاں کے لئے کوئی ثبوت نہیں۔ البتہ دل کے لرزنے کی تشبیہ اس قطرۂ شبنم سے جو سرِ خار پہ ہو، بہت ہی اعلیٰ و لطیف ہے۔
(۲) "خانہ آرائی" کی آرایش "سفیدیٔ دیدہ" آنکھ کی پتلی کے گرد جو سفید حصہ چشم ہوتا ہے اس کو سفیدی ہی کہتے ہیں لیکن محاورہ میں "آنکھیں سفید ہو جانا" کے معنی بینائی اور نور جاتا رہنا، اور اندھے ہو جانے کے ہیں۔ اور خصوصاً روتے روتے اندھے ہو جانے کے لئے یہ محاورہ مخصوص ہے۔ بیٹے کو بھی محاورہ میں نورِ نظر، نورِ چشم وغیرہ کہتے ہیں، شعر میں، حضرت یوسفؑ کے قصہ سے تلمیح ہے اور باقی لفظی رعایات ہیں
(۳) فنا تعلیم درسِ بیخودی" بیخودی کے سبق سے تعلیمِ فنا حاصل کرنے والا۔ اصل میں "بیخودی" کے معنی اپنے آپ سے بے خبر ہو جانے کے ہیں، اور اہلِ سلوک و معرفت کے یہاں اسی مقام کو "نفیٔ انانیت" سے تعبیر کیا جاتا ہے اور یہ مقام مراتب فنا میں سے ہے "فنا" اُس مقام و مرتبہ کا نام ہے جبکہ سالک، اپنی ہستی، یعنی خودی اور تمام غیر ہستیوں کو مٹا، اور

فراموش کر چکا ہو۔ "لام، الف" (لام) عربی میں لائے نفی ہے کلمۂ توحید "لاالٰہ الا اللہ" کی ابتدا اسی حرف نفی سے ہوتی ہے، پھر صوفیائے کرام کے یہاں "موجودیت" غیر الٰہی "مقصودیت" غیر الٰہی اور "محبوبیت" غیر الٰہی وغیرہ کے لئے بھی کلمات ہیں، اور نفس کشی کی تعلیم کا مبدا یہیں سے ہے! —— "مجنوں" (قیس کی طرف) "لام الف" منسوب کرتے ہیں، دوسری رعایت یہ ملحوظ ہے، کہ نام لیلیٰ کا پہلا حرف (لا) ہی ہے "دبستاں" (ادبستاں) مکتب۔ یا مدرسہ "دیوار پر لکھنا" بالکل ہی مبتدیانہ اور طفلانہ پن کا ثبوت ہے۔ مطلب ہے کہ اس میں تعلیم فنا میں اس وقت سے مصروف ہیں۔ جب قیس مبتدی تھا، یا جب کہ قیس کو لیلے کا پورا نام بھی لینا نہ آتا تھا بلکہ صرف لام الف کی مشق کرتا تھا، یا جب کہ اس کے خانۂ عشق میں صفر (۰) تھا، یا جب کہ وہاں عشق کے نام، نفی تھی گویا مجکو قیس پر افضلیت حاصل ہے!!

(۴) "تشویش مرہم" جستجو نے مرہم۔ یعنی، بعض پارہ ہائے دل لذت گیر نمکداں ہونا چاہتے ہیں، اور بعض کو مرہم درکار ہے کاش سب کے سب لذت نمک کے طالب ہوتے تو تلاش مرہم کی کاوش نہ ہوتی۔

(۵) "اقلیم" ملک۔ دار الحکومت حسن مراد ہے "طومار" حکم یا فرمان، یا شاہی مراسلات "طومار ناز" معشوق سے استعارہ ہے "چشم و مہر" میں تشبیہ ہے "پشت چشم" اُلٹی نگاہ، یا پھری ہوئی

آنکھ، یا بدلی ہوئی نظر۔ مطلب یہ ہے کہ، فرامین حُسن پر کج ادائیوں کی مُہر ہوتی ہے۔ یا معشوق کی فرمائشیں ستم سے خالی نہیں ہوتیں۔

(۶) شفقی بادل، اور آگ میں، رنگ وجہ شبہ ہے۔

(۷) یعنی شوقِ دیدارِ جمال، کی پرواز کے سوا، شہیدانِ ناز میں اب باقی ہی کیا ہوگا کہ قیامت اُن کو اُٹھائے گی، البتہ ہوائے تیز و تند ہو کر خاکِ مزار اُڑا سکتی ہے، یا قیامت اُس ہوائے تن سے زیادہ وقعت نہیں رکھتی، جو پرواز میں مدد دے۔

(۸) یعنی ناصح نے اگر نصیحت میں شدت کی تو اس کا یہی جواب ہو سکتا ہے، کہ فی الفور گریبان چاک کر دیا جائے تاکہ اُسے معلوم ہو جائے کہ اُس کی نصیحت کی کس قدر وقعت کی گئی۔

---

(۱)
ہے بسکہ ہر اِک اُن کے اشارے میں نشاں اور
کرتے ہیں محبت تو گزرتا ہے گماں اور

(۲)
یا رب! وہ نہ سمجھے ہیں نہ سمجھیں گے مری بات
دے اور دل اُن کو جو نہ دے مجھ کو زباں اور

(۳)
آبرو سے ہے کیا اُس نگہِ ناز کو پیوند
ہے تیر مقرر مگر اس کی ہے کماں اور

(۴)
تم شہر میں ہو تو ہمیں کیا غم جب اُٹھیں گے
لے آئیں گے بازار سے جا کر دل و جاں اور

(۵)
ہر چند سبک دست ہوئے بُت شکنی میں

ہم ہیں تو ابھی راہ میں ہیں سنگِ گراں اور

(۶)
ہے خونِ جگر جوش میں دل کھول کے روتا
ہوتے جو کئی دیدۂ خونبابہ فشاں، اور

(۷)
مرتا ہوں اِس آواز پہ ہر چند سر اُڑ جائے
جلاد سے لیکن وہ کہے جائیں کہ ہاں اور

(۸)
لوگوں کو ہے خورشیدِ جہاں تاب کا دھوکا
ہر روز دکھاتا ہوں میں، اک داغِ نہاں اور

(۹)
لیتا، نہ اگر دل تمہیں دیتا، کوئی دم چین
کرتا، جو نہ مرتا، کوئی دن آہ فغاں اور

(۱۰)
پاتے نہیں جب راہ تو چڑھ جاتے ہیں نالے
رُکتی ہے مری طبع تو ہوتی ہے رواں اور

(۱۱)
ہیں اور بھی دُنیا میں سخنور بہت اچھے
کہتے ہیں کہ غالب کا ہے اندازِ بیاں اور

(۱) یعنی اے فریبِ حُسن! یہ کچھ ہمت افزائی نہیں" دکھاتا۔

(۲) یعنی وہ میرے کلامِ شوق سے، آرزوئے وصل پر آگاہ نہیں ہوتے، اور میں رُعبِ حُسن یا خودداری و ضبط سے کام لیتا ہوں، اور صاف صاف عرضِ مطلب سے قاصر ہوں۔ پس اے خدا! ان کو دل جذبات شناس نہیں دیتا تو مجھی کو زنانہ کلامی کی قوت عطا فرما دے!

(۳) "کمان" عام استعارہ، "ابرو" سے ہے۔ مطلب یہ کہ ابرو سے نگاہوں کا کوئی تعلق ہی نہیں، نگاہ تیر ضرور ہے لیکن

اس تیر کی کمان تو گردش چشم کو سمجھنا چاہئے۔

(۴) یعنی اُس کے حسن نے تو سارے شہر کو جاں بلب اور دل بکف بنا رکھا ہے، ہم جس سے چاہیں گے، دوسرے جان و دل، بازار سے خرید لائیں گے۔

(۵) "سبک دست" تیز دست، یا ہاتھ کا صاف ہونا "بت شکنی" بُت توڑنا۔ "عالم توحید" میں الفاظ "بُت" "صنم" کا ہر موجود "غیر خدا" اور ہر مفہوم ماسوا اللہ" پر اطلاق ہوتا ہے اور راہ معرفت میں "انانیت" "خودی" بھی ایک ٹھوکر، ایک سنگ راہ اور رکاوٹ ہے۔ چنانچہ شعر میں "ہم" یعنی "خودی" ہی کو سنگ گراں کہا گیا ہے۔ مطلب ہے کہ اگرچہ بت شکنی میں ہمارا ہاتھ صاف اور رواں ہو گیا ہے، لیکن جب تک ہم کو اپنی ہستی کا احساس باقی ہے اُس وقت تک شرک کا خاتمہ نہ سمجھنا چاہئے!

(۶) "دیدۂ خونابہ فشاں" خون رونے والی آنکھ۔

(۷) یعنی اُس کی آواز ترغیب شہادت ہے۔

(۸) شعراء، داغ کی آفتاب سے تشبیہ دیا کرتے ہیں، ہر روز تازہ داغ کھانے اور دکھانے میں، یہ تازگی ہے، کہ آفتاب بھی ہر روز نکلتا ہے۔

(۹) یہ بہت لطیف تقریب ہے "لینا" کو ربط ہے "چین" سے "کرنا" مربوط ہے "آہ و فغاں" سے۔ عربی میں تعقید معنوی اور لفظی دونوں معیوب ہیں۔ فارسی میں تعقید معنوی عیب ہے۔ تعقید

لفظی جائز، بلکہ فصیح و ملیح ۔ ریختہ، نقلیہ ہے فارسی کی۔ حاصل معنی مصرعین یہ کہ۔ اگر دل تمہیں نہ دیتا، تو کوئی دم چین لیتا، اگر نہ مرتا تو کوئی دم اور آہ و فغاں کرتا (ماخوذ از مکتوب استاد غالب)

(۱۰) "راہ" "روانی" وغیرہ مناسبات لفظی ہیں، یعنی جب آہ، گلوگیر ہوتی ہے، یا دم گھٹتا ہے تو نالے بلند ہوتے ہیں، اور جب طبیعت الجھتی ہے تو اضطراب بڑھتا ہے (اور اضطراب مماثل روانی ہے)

صفائے حیرت آئینہ ہے سامانِ زنگ آخر
تغیر، آب بر جا ماندہ کا، پاتا ہے رنگ آخر (۱)

نہ کی سامانِ عیش و جاہ نے تدبیر وحشت کی
ہوا جامِ زمرد بھی مجھے داغِ پلنگ آخر (۲)

(۱) "صفا" "جلا"، آئینہ کی قلعی ۔ آئینہ کا وصف شعراء "حیرت" لکھا کرتے ہیں ۔ اور حیرت کی خاصیت "جمود" و عدمِ حرکت ہے "آب بر جا ماندہ" ٹھیرا ہوا، رُکا ہوا، غیر روان پانی ۔ "تغیر" تبدیلی ۔ مطلب ہے کہ جس طرح رُکے ہوئے پانی پر، کائی وغیرہ جم جاتی ہے، اُسی طرح آب آئینہ زنگ سے متبدل ہو جاتا ہے۔

(۲) وحشت و خوف سے وہم شبہی کی تمثیل دی ہے ۔ یعنی وحشت میں مجھے جامِ زمرد چیتے کے داغ کی طرح معلوم ہوتا ہے۔

جنوں کی دستگیری کس سے ہو گر ہو نہ عریانی
گریباں چاک کا حق ہو گیا ہے میری گردن پر (۱)

(۲)
بہ رنگِ کاغذِ آتش زدہ نیرنگِ بیتابی
ہزار آئینہ دل باندھے ہے بالِ یک تپیدن پر

(۳)
فلک سے ہم کو عیشِ رفتہ کا کیا کیا تقاضا ہے
متاعِ بُردہ کو سمجھے ہوئے ہیں قرض رہزن پر

(۴)
ہم اور وہ بے سبب رنج آشنا دشمن کہ رکھتا ہے
شعاعِ مہر سے تہمت نگہ کی چشمِ روزن پر

(۵)
فنا کو سونپ گر مشتاق ہے اپنی حقیقت کا
فروغِ طالعِ خاشاک ہے موقوف گلخن پر

(۶)
اسدؔ بسمل ہے کس انداز کا قاتل سے کہتا ہے
کہ مشقِ ناز کر خونِ دو عالم میری گردن پر

(۱) "گریبان چاک" باضافت مقلوب، چاکِ گریباں۔ یعنی چاکِ گریباں کا میں منت کش ہوں اگر یہ باعثِ عریانی نہ بن جایا کرے، تو میرے دیوانگی کے سب ولولے مٹ جائیں۔

(۲) "بہ رنگ" "مثل" "کاغذِ آتش زدہ" جلتا ہوا کاغذ۔ "نیرنگ" طرح طرح کے۔ یا شعبدے۔ "آئینہ بندی" چمکانا، یا فروغ دینا مراد ہے "آتش زدگی" اور آئینہ بندی میں تشبیہ ہے "بال" پر۔ "تپیدن" تڑپنا۔ اور مبالغتاً اُڑنے سے تعبیر کیا ہے کاغذ جب جلتا ہے، تو سکڑ جاتا ہے سکڑنے کی تشبیہ "تپیدن" سے ہے۔ مطلب ہے کہ شدتِ سوزِ دل سے بے تابی اس طرح بڑھتی ہے، جیسے کاغذِ سوزاں، جلنے سے پیچ و تاب میں آتا ہے۔

(۳) "عیشِ رفتہ" گذرا ہوا عیش۔ "متاعِ بردہ" برباد شدہ، یا مسروقہ مال۔ رہزن "مسافروں کو لوٹنے والا" یعنی عیش گذشتہ کو ہم فلک سے اس طرح واپس مانگ رہے ہیں۔ جس طرح کوئی نادان، اپنی مسروقہ دولت چور پہ قرض سمجھتا، اور واپسی کا تقاضا کرتا ہو۔

(۴) "بے سبب رنج آشنا" بے وجہ رنجیدہ۔ "جلنے والا دکھتا ہے" "تہمت" سے مربوط ہے دیگر سے عاشق کی نگاہ مراد ہے۔ دیوار و در کے "روزن" کی تشبیہ آنکھ سے دی گئی ہے۔ مطلب ہے، کہ ہم، اور ہزاروں قسم کے شوق و طلب، اور وہ ایسا فتنہ جو، کہ آفتاب کی شعاع، جو روزن دیوار ہیں سے چھنتی ہو، اس پہ نگاہ عاشق کی تہمت رکھ کر خفا ہو جاتا ہو، (دیکھئے کس طرح بنتی ہے)

(۵) "فروغِ طالعِ خاشاک" گھاس پھونس کی قسمت کا عروج "گلخن" انگیٹھی۔ یا آتش دان۔ گھاس پھونس ہستی انسان کی تمثیل ہے۔ یعنی اگر اپنی حقیقت معلوم کرنا چاہتا ہو، کو فروغ اصلیت و معرفت تک پہنچانا چاہتا ہے تو خودی مٹا دے اور اپنے خاشاکِ ہستی کو آتشِ عشقِ الٰہی میں جلا دے، کیونکہ خاشاک کی قسمت انگیٹھی ہی میں چمکتی ہے!!

(۶) خدا جانے "اسد" کس ادائے ناز کا دیوانہ ہے، کہ خود قاتل کو ترغیب دے رہا ہے اور دونوں جہاں قربان کئے دیتا ہے (سبحان اللہ کیا مضمون، اور کیا اسلوب بیان ہے)

(۱) ستمکش مصلحت سے ہوں، کہ خوباں تجھ پہ عاشق ہیں
تکلف برطرف مل جائے گا تجھ سا رقیب آخر

(۱) "ستم کش" بیداد پسند۔ "تکلف برطرف" آخر الامر، یا المختصر، یا غرضیکہ۔ یعنی میں مصلحتاً بیداد عشق کو گوارا کر رہا ہوں۔ اس لئے کہ تجھ پر اکثر حسین بھی ہوتے رہتے ہیں کبھی نہ کبھی تیری صورت و جمال کا مجھے کوئی رقیب، مل جائے گا، تو اپنی دل بستگی انہی سے ہو جائے گی!

فارغ مجھے نہ جان کہ مانند صبح مہر	۱	ہے داغ عشق زینت جیب کفن ہنوز
ہے ناز مفلساں زر از دست رفتہ پر	۲	ہوں گلفروش شوخی داغ کہن ہنوز
میخانۂ جگر میں یہاں خاک بھی نہیں	۳	خمیازہ کھینچے ہے بت بیداد فن ہنوز

(۱) "فارغ" بے علاقہ و بے فکر۔ سفیدی کفن سے صبح کی اور داغ سے آفتاب کی تشبیہ ہے۔ "داغ دل" کا مقام، گوشۂ صدر ہے، جیب کا لفظ اسی رعایت سے لائے ہیں۔ مطلب ہے کہ مجھے مرنے کے بعد بھی دورۂ لیل و نہار نے فرصت نہ دی اور صبح کفن سے آفتاب داغ نکلا ہوا ہے اور مصروف کاروبار۔

(۲) "زر از دست رفتہ" ضائع شدہ، یا خرچ شدہ دولت "داغ کہن" پرانا داغ۔ "گل" "اشرفی" "درہم" (دولت) اور "زخم" یا داغ، سب میں تشبیہ اور رعایت ہوتی ہے۔ بلکہ عام طور پر، گل داغ اور داغ گل۔ گل زخم وغیرہ کہا کرتے ہیں۔ یہاں بھی یہ تمام رعایتیں ملحوظ ہیں۔ مطلب ہے کہ جس طرح فضول خرچیوں سے مفلس ہو کر لوگ مفلسی میں اپنی گذشتہ

دولتمندی پر فخر کرتے ہیں، مَیں بھی اپنے زخمِ کہن کو تازہ رکھتا، اور اُس داغِ کہن میں نئی نئی شوخیاں نظارہ کرتا ہوں!

(۴) "خمیازہ کھینچے ہے" انگڑائی لیتا ہے۔ خون وشراب میں "رنگ" وجہِ شبہ ہے۔ اسی رعایت سے جگر کے ساتھ میخانہ استعمال ہوا ہے۔ انگڑائیاں نشہ اُترنے اور شراب کی مزید طلب میں آیا کرتی ہیں "خمیازہ" سے یہاں راہ بچا کر نکلنا بھی ظاہر ہوتا ہے، اور خود معشوقوں کی انگڑائی بھی ایک ادائے ناز اور اشتیاق انگیز حرکت ہوا کرتی ہے۔ مطلب ہے کہ وہ ابھی تک آمادۂ ستم ہیں، اور یہاں طاقت ضبط ہی نہیں! یا وہ آمادۂ ایذارسانی ہیں اور یہاں غم میں روتے روتے سب خونِ جگر ختم ہو چکا۔

حریفِ مطلبِ مشکل نہیں فسونِ نیاز	۱	دعا قبول ہو یارب! کہ عمرِ خضر دراز
نہ ہو بہرزہ بیاباں نوردِ وہمِ وجود	۲	ہنوز تیرے تصور میں ہے نشیب و فراز
وصال جلوہ تماشا ہے پر دماغ کہاں	۳	کہ دیجیے آئینہ انتظار کو پرواز
ہر ایک ذرۂ عاشق ہے آفتاب پرست	۴	گئی نہ خاک ہوئے پر ہوائے جلوۂ ناز

(۵) نہ پوچھ وسعتِ مے خانۂ جنوں غالبؔ
جہاں یہ کاسۂ گردوں ہے ایک خاک انداز

(۱) "حریفِ مطلبِ مشکل" یعنی کسی مشکل کے حل پر آمادہ اور مقابل "فسوں" اثر و تاثیر "نیاز" عجز و الحاح۔ یعنی کسی دشواری میں ہماری عاجزی کا تو کوئی اثر ہوتا ہی نہیں۔ تو، اے خدا، آپ ہم اس قسم کی دعا مانگا کریں گے جس میں کسی تاثیر کی ضرورت

ہی نہ ہو، اور گویا مقبول ہی ہو چکی ہو، مثلاً، اے خدا، خضرؑ کی عمر دراز کر، یا اے خدا، کل صبح آفتاب نکلے، اور شام کو چھپ جائے۔ یا اے خدا آفتاب جب نکلے تو دھوپ بھی اس کے ساتھ ہو، وغیرہ۔

(۲) "بہرزہ" تا نفی سے "وجود" ذات باری تعالیٰ" بیاباں نورد" صحرا گرد، اور یہاں آوارہ گرد زیادہ مناسب ہے "وہم" وخیال جو غیر واقعی امور، اور غیر موجودہ اشیاء کو واقعی اور موجود کی طرح ذہن میں پیش و نمایاں کردے "نشیب وفراز" پستی و بلندی، یا تنزل و عروج، یا مراتب امکان و وجوب مطلب ہے کہ جستجوئے ذات باری میں، اوہام وخواطر کی آوارہ گردیوں میں مبتلا نہ ہو، یہ سب واہمہ کی صورت آفرینیاں ہیں، اور ابھی تک تیرے تصور میں، پستی و عروج، اور این وآں کا امتیاز باقی ہے۔ اور یکرنگی و وحدۃ خیالی میسّر نہیں!

(۳) "تماشا" دید۔ نظارہ "دماغ کہاں" تاب کہاں "انتظار" محاورہ کے معنے میں استعمال نہیں ہوا بلکہ لغوی معنی "نظر کرنا، نظارہ کرنا وغیرہ مراد ہیں۔ "غور وتجسس" سے دیکھنے اور چاروں طرف نظر دوڑانے کا مفہوم، لفظ "پرواز" سے مترشح ہے۔ مطلب ہے کہ نظارۂ عام (تماشا) کرنے سے (یا مطالعہ ومشاہدہ کرنے سے) جلوہ سے وصل (یا حقیقت کا انکشاف) تو ہوتا ہے لیکن اتنی تاب وطاقت کہاں (یا اتنی قدرت وعقل کہاں) کہ چاروں طرف نظر دوڑائیں (یا عالم موجودات ومظاہر فطرت پر۔

غور کر سکیں)

(۴) یعنی عاشق کا ہر ذرہ خاک آفتاب کے مقابل ہے، اور مرنے کے بعد اشتیاق نظارۂ جمال مٹا نہیں۔

(۵) "میخانۂ جنوں" عالمِ جنوں دوا لہیت مراد ہے۔ اسی رعایت سے "الالگردوں) کے ساتھ "کاسہ" (پیالہ) کی ترکیب ہے، لیکن پھر بھی اس کو جامِ شراب یا ساغر سے، نہ کہنا، شانِ مضمون پہ دلالت کرتا ہے۔ "خاک انداز" کوڑا وغیرہ پھینکنے کا برتن۔ یعنی عالمِ جنوں اتنا وسیع ہے کہ آسمان کی عظمت خاک انداز کی برابر ہے۔

وسعتِ سعیِ کرم دیکھ کہ سرتا سرِ خاک	۱	گذرے ہے آبلہ پا ابرِ گہربار ہنوز
یکقلم کاغذِ آتش زدہ ہے صفحۂ دشت	۲	نقشِ پا میں ہے تپِ گرمیِ رفتار ہنوز

(۱) "سعی" کے لغوی معنی دوڑنے کے ہیں "سرتا سر" بلندی سے سطحِ زمین تک مراد ہے۔ قطراتِ باراں سے آبلہ پائی کی تشبیہ ہے۔ "وسعت" میں آبلہ پائی کی رعایت ملحوظ ہے۔ مطلب ہے کہ جوشِ کرم کی فراوانی دیکھیے کہ سارے جہان میں پھرتے پھرتے گویا ابرِ گہربار آبلہ پا ہو گیا ہے۔

(۲) "یکقلم" بالکل۔ کاغذ و نقش کی لفظی رعایت ملحوظ ہے۔ "دشت" ریگستان "تپ" گرمی۔ مطلب ہے کہ ابھی تک گرمیِ رفتار سے نقشِ پا جل رہے ہیں، اور صفحۂ دشت، کاغذِ آتش زدہ بن گیا ہے۔

کیونکر اس بت سے رکھوں جان عزیز	۱	کیا نہیں ہے مجھے ایمان عزیز
دل سے نکلا پہ نہ نکلا دل سے	۲	ہے ترے تیر کا پیکان عزیز

۳	تاب لائے ہی بنے گی غالب واقعہ سخت ہے، اور جان عزیز	

(۱) یعنی عشق ہمارا مذہب ہے، اور اُس بُت سے عشق ہے تو اُس پر ایمان ہے، ایمان، جان سے زیادہ عزیز ہوتا ہے ایمان کی راہ میں جان جاتی رہے، تو پروا نہیں!

(۲) "پیکاں" تیر کی آنی یا پر۔ یعنی گو، تیر دل کے پار نکل گیا لیکن اُس کی یاد (نشانِ زخم) باقی ہے۔

(۳) یعنی لطفِ زندگی، بلکہ زندگی کا انحصار تو عشق پر ہے، اگر عشق میں مصائب کا سامنا ہوتا ہے تو ہوا کرے، تمام سختیاں گوارا ہیں کیونکہ جان عزیز ہے، جو عشق سے وابستہ ہے۔

نہ گُلِ نغمہ ہوں نہ پردۂ ساز	۱	میں ہوں اپنی شکست کی آواز
تو اور آرائشِ خمِ کاکل	۲	میں، اور اندیشہ‌ہائے دُور دراز
لافِ تمکیں فریبِ سادہ دلی	۳	ہم ہیں اور رازہائے سینہ گداز
ہوں گرفتارِ اُلفتِ صیاد	۴	ورنہ باقی ہے طاقتِ پرواز
وہ بھی دن ہو کہ اُس ستمگر سے	۵	ناز کھینچوں، بجائے حسرتِ ناز
نہیں دل میں مرے وہ قطرۂ خوں	۶	جس سے مژگاں ہوئی نہ ہو گلباز
اے ترا غمزہ یک قلم انگیز	۷	اے ترا ظلم سر بسر انداز
تو ہوا جلوہ گر مبارک ہو	۸	ریزشِ سجدۂ جبینِ نیاز
مجھ کو پوچھا تو کچھ غضب نہ ہوا	۹	میں غریب اور تو غریب نواز

۱۰	اسد اللہ خاں تمام ہوا اے دریغا! وہ رندِ شاہد باز	

(۱) "گل" کا استعمال بہت سے معنوں میں ہوتا ہے، اور مختلف لفظوں سے ترکیب پاکر ہر موقع پر، مناسبت کے اعتبار سے مختلف معنی دیتا ہے۔ لیکن اس سے یہ خیال نہ ہونا چاہئے کہ مفہوم وضعی بدل جاتا ہے، بلکہ یوں سمجھنا چاہئے کہ "گل" رنگ، بُو، شگفتگی وغیرہ رکھتا ہے، پس کہیں رنگ کی رعایت مقدم ہوتی ہے، کہیں بُو کی مناسبت ملحوظ رہتی ہے۔ کہیں شگفتگی مقصود و بیان ہوا کرتی ہے۔ "گل نغمہ" میں شگفتگی مطلوب ہے۔ کیونکہ کلی سے جب پھول ہوتا ہے، تو اس کھلنے کو چٹکنا کہتے ہیں، اور چٹکنا اسماءِ صوت میں سے ہے اور "صوت" "نغمہ" ایک ہی حقیقت رکھتے ہیں۔ "ساز" باجا۔ نغمہ کی رعایت سے استعمال ہوا ہے۔ "پردہ" باجے کے وہ آلات، جن کے دبانے یا ضرب کرنے سے نغمہ پیدا ہوتا ہے۔ "شکست" رنج و غم مراد ہے، اور نغمہ و صوت وغیرہ کی رعایت ہے۔ مطلب یہ ہے کہ نہ تو میں صدائے عیش و سرور ہوں، نہ پردۂ ساز ہوں بلکہ اپنی شکستہ خاطری کا نالۂ زار اور اپنے رنج و غم کی صدائے فغاں ہوں۔

(۲) "آرائش" سنوارنا۔ "خم کاکل" زلفوں کے پیچ، یا بالوں کے حلقے یا چھلے۔ درازیٔ زلف شعرا کے یہاں مسلم ہے، اسی درازیٔ زلف کی رعایت سے "اندیشہ" (خطرے اور افکار) استعمال ہوا ہے۔ یعنی خدا جانے آج کیوں، آرائش مدِّنظر ہے کیا کہیں وعدہ تو نہیں؟!

(۳) "لاف" دعویٰ، یا شیخی "تمکیں" ضبط، یا خودداری۔ "فریبِ سادہ دلی" نادانی کے دھوکے میں رہنا۔ "رازہائے سینہ گداز" سینہ دل سے استعارہ ہے، وہ راز جو دل پگھلا دیں یا جن رازوں کے تحمل کی طاقت نہ ہو۔ یعنی وہ ہمارے ضبط و خودداری کے دعوے، سادہ دلی کے فریب پر مبنی تھے ورنہ ہمارے دل میں تو سوزِ عشق کے ایسے راز ہیں جو دل پگھلا دیں!

(۴) جب صیاد سے محبت ٹھیری تو صید ہو جانے کا ڈر ہی کیا۔ اور گرفتارِ اُلفت، طاقت پرواز ہونے پر بھی نہیں اُڑ سکتا!

(۵) یعنی اب تو صرف، ناز برداری کی حسرت ہی حسرت ہے۔ خدا وہ دن لائے کہ بجائے حسرت کشی کے ناز کشی میسّر ہو۔

(۶) "گلبازی" پھول بکھیرنا یعنی میرے دل میں ایسے ناکارہ خون کا کوئی قطرہ نہیں جس نے آنسوؤں کو رنگین نہ کیا ہو۔

(۷) "انگیز" اُٹھا ہوا، یہاں غالباً انداز کی رعایت سے لائے ہیں کہ "انداز" و "انگیز" انداختن و انگیختن سے ماخوذ ہیں جو متضاد معنی رکھتے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ تیرا غمزۂ التفات اُٹھا دیتا ہے اور تیرا ظلم گرا دیتا ہے۔ یا تیرا غمزہ بیباختہ ہے اور تیرا ظلم بھی ادا کے ساتھ ہے۔

(۸) سجدے ادا کرنے کو فارسی والے 'ریزش' سجدہ لکھا کرتے ہیں "جبیں" پیشانی "نیاز" عجز و منت۔ یعنی تو جلوہ فرما ہوا۔

اس نیاز مند کے سجدہ ہائے لذت تجکو مبارک ہوں۔
(۹) بے شک
(۱۰) "اے دریغا" کلمۂ ماتم و افسوس۔ شاہد باز حسن یا معشوق پرست۔

مژدہ اے ذوقِ اسیری کہ نظر آتا ہے
(۱)
دامِ خالی قفسِ مرغِ گرفتار کے پاس

جگرِ تشنۂ آزار تسلی نہ ہوا
(۲)
جوئے خوں ہم نے بہائی بنِ ہر خار کے پاس

مُند گئیں کھولتے ہی کھولتے آنکھیں ہے ہے
(۳)
خوب وقت آئے تم اس عاشقِ بیمار کے پاس

میں بھی رُک رُک کے نہ مرتا جو زباں کے بدلے
(۴)
دشنہ اک تیز سا ہوتا مرے غمخوار کے پاس

دہنِ شیر میں جا بیٹھیے لیکن اے دل
(۵)
نہ کھڑے ہوجئے خوبانِ دل آزار کے پاس

دیکھ کر تجکو چمن بسکہ نمو کرتا ہے
(۶)
خود بخود پہنچے ہے گل گوشۂ دستار کے پاس

مر گیا پھوڑ کے سر غالبِ وحشی ہے ہے
(۷)
بیٹھنا اُس کا وہ آکر تری دیوار کے پاس

(۱) نیا طائر پھانسنے کے لئے، جال کے پاس ایک طائر کا پنجرہ بھی رکھ دیتے ہیں، تاکہ ہم جنس کو دیکھ کر طائر آزاد جال میں آجائے۔ یہی مطلب شعر کا ہے کہ تمام سامان گرفتاری

موجود ہے۔

(۲) "جگر تشنۂ آزار" جگر ایذا طلب تسلّی نہ ہوا۔ راحت یاب نہ ہوا یعنی آبلہ پائی میں دشت نوردی کر کے ہم نے ہر کانٹے کے قریب ایک ایک جوئے خون، بہا بہا دی، مگر پھر بھی جگر ایذا طلب کی تشنگی خونفشانی نہ بجھی۔

(۳) یعنی نظارۂ و دیدار کے لئے آنکھیں کھولنے کا ارادہ کرتے ہی کرتے، ہمیشہ کے لئے آنکھیں بند ہو گئیں (یعنی موت آگئی)

(۴) غمخوار کے سارے دلاسے اور تسلّیاں مریض عشق کے لئے بیکار ہوتی ہیں ذرا اُس کے دلاسوں سے طبیعت ٹھہرتی ہے پھر بگڑ جاتی ہے، گویا سنبھلنا، پھر بگڑنا، رُک رُک کے مرنا ہے، اور ظاہر ہے کہ رُک رُک کے مرنا تکلیف دہ ہوتا ہے۔ مطلب ہے کہ میرے غمخوار کے پاس، بجائے اس زبان کے جس پر الفاظ تسکین و تسلّی جاری رہتے ہیں، تیز سی چھُری ہوتی، اور وہ چلتی تو آسانی سے موت آجاتی:

(۵) "شیر کے مُنہ میں جانا" محاورہ ہے، جس کے معنی، قضا کا سامنا کرنے کے ہیں۔

(۶) شاعرانہ انداز بیان ہے، کہ سب اُس کے شایق ہیں، اور شوق کی تعبیر مُوت سے کی ہے۔

(۷) "ہے ہے" کلمۂ افسوس ہے۔ مصرعہ ثانی میں لفظ "وہ" محاورہ کی کمال بیساختگی کے ساتھ استعمال ہوا ہے۔

نہ لیوے گر خسِ جوہر طراوت سبزۂ خط سے	۱	لگاوے خانۂ آئینہ میں روئے نگار آتش
فروغِ حسن سے ہوتی ہے حلِ مشکلِ عاشق	۲	نہ نکلے شمع کے پا سے نکالے گر نہ خار آتش

(۱) ظاہر ہے کہ تر و تازہ تنکے یعنی سبز گھاس، جلتی نہیں "جوہر" کی تشبیہ تنکوں سے دی ہے اور روئے جاناں کی سرخی جو آئینہ میں منعکس ہے، آتش زدگی کے مشابہ ہے۔ مطلب ہے کہ خسِ جوہرِ آئینہ، خطِ جاناں سے تری حاصل کر لیتا ہے ورنہ آتشِ رخسار آئینہ میں آگ لگا دیتی۔

(۲) "کانٹا نکلنا" مشکل آسان ہو جانے کے معنی میں مستعمل ہے شمع کی بتی کی تشبیہ "خار" سے دی ہے۔ مطلب ہے کہ پائے شمع کا کانٹا آتشِ شمع نکال دیتی ہے۔ اسی طرح عاشق کے دل کے خارہائے حسرت، آتشِ جمالِ دوست سے نکل سکتے ہیں۔

جادۂ رہ خور کو وقتِ شام ہے تارِ شعاع	۱	چرخ وا کرتا ہے ماہِ نو سے آغوشِ وداع

(۱) "تارِ شعاع" وہ خطوطِ ابیض مراد ہیں جو غروب کے بعد افق پر نمایاں ہوتے ہیں اسی کو "جادۂ راہ" (نشانِ راہ۔ خطِ راہ) آفتاب کہا گیا ہے، اور ہلال یا ماہِ نو نصف دائرہ اور آغوش کی شکل کا ہوتا ہے، اس کو آغوشِ وداع سے تعبیر کر کے سفرِ آفتاب کو تمثیل کیا ہے۔ یعنی آفتاب کی راہِ سفر تارِ شعاع ہے اور آسمان کی آغوشِ وداع ماہِ نو۔

رخِ نگار سے ہے سوزِ جاودانیِ شمع	۱	ہوئی ہے آتشِ گل آبِ زندگانیِ شمع
زبانِ اہلِ زباں میں ہے مرگِ خاموشی	۲	یہ بات بزم میں روشن ہوئی زبانیِ شمع
کرے ہے صرف بایمائے شعلہ قصہ تمام	۳	بطرزِ اہلِ فنا ہے فسانہ خوانیِ شمع

غم اس کو حسرتِ پروانہ کا ہے اے شعلہ	۴	ترے لرزنے سے ظاہر ہے ناتوانیِ شمع
ترے خیال سے رُوح اہتزاز کرتی ہے	۵	بہ جلوہ ریزیِ باد و بہ پرفشانیِ شمع
نشاطِ داغِ غمِ عشق کی بہار نہ پُوچھ	۶	شگفتگی ہے شہیدِ گلِ خزانیِ شمع
	۷	جلے ہے دیکھ کے بالینِ یار پر مجھ کو نہ کیوں ہو دل پہ مرے داغِ بدگمانیِ شمع

(۱) شمع، رُخِ محبوب کی آتشِ حسد سے جلا کرتی ہے، شعرا کے مسلمات میں سے ہے، رُخِ محبوب گُل اور شمع میں آب و تاب اور رنگ وجہِ شبہ ہیں۔ مطلب ہے کہ محبوب کے رُخ سے شمع کو سوزِ دائمی حاصل ہے، اور یہی آتشِ گل، شمع کے لئے آبِ حیات ہے!

(۲) شمع کی لَو کو زبانِ شمع کہتے ہیں۔ اور بجھی ہوئی شمع کو شمع کشتہ لکھتے ہیں۔ گویا شمع کی زندگی زبانِ شمع پر منحصر ہے۔ "روشن ہوئی" محاورہ برجستہ ہے یعنی ثابت ہوئی یعنی، یہ بات شمع کی زبانی ثابت ہوئی کہ خاموشی آثارِ موت میں سے ہے۔

(۳) "ایما" اشارہ، لَو کو اشارہ سے تعبیر کیا ہے۔ سوزِ شمع کو سوزِ عشق کہا جاتا ہے اور مصرعِ ثانی میں اہلِ فنا سے سوختہ جانانِ عشق مُراد ہیں۔ "قِصّہ تمام کرنا" مٹانا یا فنا کرنا، اسی کا ترجمہ "فسانہ خوانی" استعمال ہوا ہے۔ مطلب ہے کہ جس طرح سوختہ جانانِ عشق کی فنا اور اُن کی بربادی سے بزبانِ حال، فسانہ خوانیِ داستانِ عشق ہوتی ہے۔ اسی طرح شمع باشاراتِ شعلۂ سوزِ عشق کا قِصّہ بیان کرتے ہوئے اپنا خاتمہ کر لیتی ہے۔

(۴) کمزوری سے کپکپی پیدا ہوتی ہے، اور یہ کیفیت، غم اور غصہ دونوں حالتوں میں ظاہر ہوتی ہے۔ لَو (شعلہ) کی حرکات کو لرزنے پر محمول کیا ہے، مطلب یہ ہے کہ لَے شعلہ اتیرے کانپنے اور تھرتھرانے سے معلوم ہوتا ہے کہ شمع، حالِ حسرت مآل پروانہ پر، ناتوانیٔ غم سے کانپ رہی ہے۔

(۵) "اہتزاز" حرکت کرنا، پھڑکنا، "رُوح کا پھڑکنا" دو اعتبار سے محاورہ میں مستعمل ہے، یا تو جوشِ طلب اور اضطرابِ تمنا میں پھڑکنا، یا مسرتِ حاصلہ پر پھڑک جانا یہاں جوشِ مسرت اور اضطرابِ تمنا دونوں کیفیتیں مترشح ہیں۔ اگر خیال کے معنے "یاد" کے لئے جائیں تو اضطرابِ تمنا مفہوم ہوگا، اور اگر خیال کے معنے "تصور" سمجھے جائیں، تو جوشِ مسرت سے پھڑک جانا مُراد ہے۔ اور مصرعہ ثانی میں "جلوہ ریزیٔ باد" کا قرینہ مقتضی ہے، کہ خیال بمعنی تصورِ دل خوش کن، اور اہتزاز بر بنائے جوشِ مسرت ہے "بہ" دونوں جگہ قسمیہ ہے۔ جس سے تاکیدِ اثبات، اور شوکتِ کلام مقصود ہے۔

"باد" (ہوا) چونکہ خیال (تصور) سے مربوط ہے، اِس لئے "جلوہ ریزی" کہا گیا ہے (اور یہ نئی بات ہے) غالباً یہ مناسبت بھی ملحوظ ہے کہ "لَو" جلوہ ہے، اور ہوا ہی اُس کو متحرک و مشتعل کرتی ہے، اور ہوا کے بغیر اشتعال ناممکن ہے پس "جلوہ ریزی" ہوا ہی سے ہوتی ہے "پرفشانیٔ شمع" کی ترکیب

وتمثیل، دقیق وبلیغ ہے "پریشانی" (طائر کا پرواز کے لئے پر پھیلا دینا) ہوا کی شدت سے لَو شرعت کے ساتھ متحرک اور زیر وزبر ہوتی ہے، اسی کو "پرفشانیٔ شمع" سے تعبیر کیا ہے پھر شمع، اس طرح پرفشانیوں کے بعد، اکثر بجھ جاتی اور اپنی حیات ختم کر دیتی ہے، تو جو ہوا، باعث اشتعال (حیات شمع) یا باعث جلوہ ریزی ہوتی ہے، "اسی ہوا" کی زیادتی اُس لَو (شمع کو) پرفشاں (لَو کا زیر وزبر کرنا) کرتی اور بجھا دیتی ہے۔

"روح" اور "ریح" (باد۔ ہوا) ایک ہی مادہ کے الفاظ اور تقریباً ایک سی ہی خاصیت رکھتے ہیں مطلب ہے، کہ تیرا خیال میری روح (چراغ حیات انسانی) کو اس طرح اہتزاز میں لاتا ہے، جس طرح ہوا شعلۂ شمع کو، کہ باعث حیات بھی ہے۔ اور باعث ہلاکت بھی، یعنی تیرے خیال بغیر جی بھی نہیں سکتا۔ اور تیری یاد میں مرتا بھی ہوں!

(۱۸) "نشاط" "خوشی" "داغ" کو تشبیہاً گل لکھتے ہیں، اس اعتبار سے بہار وخزاں، لوازمِ گل سے ہیں۔ پھر گل "شعلۂ شمع" سے استعارہ ہے اور چونکہ یہ گل شمع، ہستی شمع کو جلا دیتا ہے اس لئے شمع کے لئے یہ گل باعثِ خزاں و بربادی ہے "شگفتگی" "نتائج بہار" میں سے ہے "شہید" رنگ گل کی رعایت ہے اور بمعنی عاشق استعمال ہوا ہے مطلب یہ ہے کہ غم عشق نے گل ہائے داغ کھلائے ہیں، اُن کی بہار و شگفتگی گلِ شمع کے مانند ہے یعنی

ایسی بہار ہے جس سے خزاں سوز نشو نما پاتی ہے۔
(۷) "بالیں" سرہانہ یعنی شمع جو جمالِ یار کے رشک و حسد میں جل رہی ہے یا سرِ بالین یار، مجکو دیکھ کر جلتی ہے، مجھے یہ جلن ہوتی ہے، کہ یہ سرِ بالیں کیوں ہے؟ اس بدگمانی نے میرے دل پر داغ ڈال دیئے ہیں۔ کہ یہ رقابت کیسی؟

بیم رقیب سے نہیں کرتے وداعِ ہوش	۱	مجبوریاں تلک ہوئے اے اختیار حیف
جلتا ہے دل کہ کیوں نہ ہم اک بار جل گئے	۲	اے ناتمامیِ نفسِ شعلہ بار حیف

(۱) "بیم رقیب" غیر کا خوف "وداع" رخصت "حیف" کلمہ تاسف "مجبور و اختیار" دو متضاد المعنی الفاظ ہیں، اُن کو مترادف المعنی طریقہ پر استعمال کیا ہے، اور یہ حسن استعمال ہے، یعنی رقیب کے اندیشہ سے ہمارے ہوش و حواس (خود دارانہ) رخصت نہیں ہوتے اور ہم باوجود اضطراب عشق، طبیعت پر اختیار اور قابو رکھتے ہیں، کہ وہ ہمارے تغیرِ حال کا مضحکہ نہ کر سکے، پس افسوس ہے کہ مجبوراً ہم اختیار کا عمل کرتے ہیں!
(۲) "ناتمامی" عدم کمال "نفس" سانس "شعلہ بار" سانس کی وہ مسلمہ صفت ہے جو اہلِ سوز و درد کے یہاں تسلیم کی جاتی ہے یعنی نفسِ شعلہ بار کی اس ناتمامی پر دل جلا جاتا ہے، کہ اس نے ہم کو ایک مرتبہ ہی میں کیوں نہ خاک کر دیا!

(۱)	زخم پر چھڑکیں کہاں طفلانِ بے پروا نمک کیا مزہ ہوتا اگر پتھر میں بھی ہوتا نمک

(۲)
گردِ راہِ یار ہے سامانِ نازِ زخمِ دل
ورنہ ہوتا ہے جہاں میں کس قدر پیدا نمک

(۳)
مجھ کو ارزانی رہے، تجھ کو مبارک ہو جیو
نالۂ بلبل کا درد اور خندۂ گل کا نمک

(۴)
شورِ جولاں تھا، کنارِ بحر پر کس کا کہ آج
گردِ ساحل ہے، بہ زخمِ موجۂ دریا نمک

(۵)
داد دیتا ہے مرے زخمِ جگر کی واہ واہ
یاد کرتا ہے مجھے دیکھے ہے وہ جس جا نمک

(۶)
چھوڑ کر جانا تنِ مجروحِ عاشق حیف ہے
دل طلب کرتا ہے زخم اور مانگیں ہیں اعضا نمک

(۷)
غیر کی منت نہ کھینچوں گا پئے توفیرِ درد
زخم مثلِ خندۂ قاتل ہے سر تا پا نمک

(۸)
یاد ہیں غالب تجھے وہ دن کہ وجدِ ذوق میں
زخم سے گرتا تو میں پلکوں سے چنتا تھا نمک

---

(۱) لوازمِ دیوانگی میں سے لڑکوں کا پتھر مارنا بھی ہے۔ شعرا کے یہاں زخم پر نمک پاشی کی ایذا طلبی بھی عام ہے یعنی پتھر سے زخم تو ہوتا ہے لیکن نمک پاشی کی کمی رہ جاتی ہے، طفلانِ بے پروا، بھلا اس زحمت کو کیوں گوارا کریں، کاش کہ پتھر میں قدرت نمک کا ذخیرہ فراہم کر دیتی!

(۲) یعنی اگرچہ دنیا میں نمک کی کمی نہیں، لیکن میں اس سے مستغنی ہوں، کیونکہ رہ گذرِ یار کی خاک بادِ پُر لطف ہوتی ہے۔

اور میرے زخموں کے لئے بہترین نمک کا کام دیتی ہے۔

(۳) حاصل یہ کہ میری قسمت میں ہی عاشقانہ ستم کشی رہے، اور تمہیں معشوقانہ جفا پروری مبارک۔

(۴) "شور" شور و غل۔ اور نمک کو بھی کہتے ہیں اور سمندر کا پانی بھی شور (کھاری) ہوتا ہے۔ اور یہی لفظی فائدہ شعر میں اٹھایا گیا ہے۔ "جولاں" دوڑنا۔ جوش و تموج دریا کو بھی جولانی کہتے ہیں۔ "گردِ ساحل" دریا کے کنارے کی خاک "بزخم موجہ دریا" موج، زخم کے مشابہ ہوتی ہے، یعنی آج کس کے جولانی اسپ کا "شور" مچا ہوا تھا، کہ جس نے تمام گردِ ساحل کو نمکیں (پر رونق) کر دیا، پھر یہ گرد جو اڑ کر موجِ زخمِ دریا میں پڑی تو اس نے یہ نمک پاشی کی، تیری (موج کی) جولانی ہیچ ہے، جولانی ایسی ہوتی ہے!

(۵) یعنی وہ جو نمک دیکھ کر مجھے یاد کر لیتا ہے، گویا نمک پاشی کے ضمن میں میرے زخموں کی یاد و داد ہو جاتی ہے۔

(۶) یعنی ابھی تو بہت کچھ ستم باقی ہیں، تم نے صرف جسم کو مجروح کر دیا، دل کے لئے زخم اور نمک پاشی باقی رہے، اور افسوس تم خاتمہ سمجھ کر چل دیئے!

(۷) "توفیر" زیادتی۔ "خندہ" ہنسی۔ معشوق نمکیں کی ہنسی بھی نمکیں ہوتی ہے، زخم کے شگاف کی خندہ سے تشبیہ کرتے ہیں پھر جب خندۂ زخم، خندۂ قاتل کے مماثل ہو تو ظاہر ہے کہ نمکیں بھی ہوگا۔ یعنی، مجھے اضافۂ درد و ایذا کے لئے کسی اور کے

احسان کی کیا ضرورت، میرے زخم خود نمکین ہیں۔
(۸) "وجد ذوق" محویتِ شوق "نمناک پلکوں سے چُلنا" تعظیماً مشہور ہے۔

آہ کو چاہیئے اک عمر اثر ہونے تک
کون جیتا ہے تری زلف کے سر ہونے تک (۱)

دامِ ہر موج میں ہے حلقۂ صد کامِ نہنگ
دیکھیں کیا گزرے ہے قطرے پہ گہر ہونے تک (۲)

عاشقی صبر طلب اور تمنا بیتاب
دل کا کیا رنگ کروں خونِ جگر ہونے تک (۳)

ہم نے مانا کہ تغافل نہ کرو گے لیکن
خاک ہو جائیں گے ہم تم کو خبر ہونے تک (۴)

پرتوِ خور سے ہے شبنم کو فنا کی تعلیم
میں بھی ہوں ایک عنایت کی نظر ہونے تک (۵)

یک نظر بیش نہیں فرصتِ ہستی غافل
گرمیِ بزم ہے اک رقصِ شرر ہونے تک (۶)

غمِ ہستی کا اسدؔ کس سے ہو جز مرگ علاج
شمع ہر رنگ میں جلتی ہے سحر ہونے تک (۷)

(۱) "اک عمر" ایک زمانۂ دراز۔ سر ہونا جس کے معنی فتحمندی اور مُسخر کرنے ہیں۔ ندرتِ تاثیرِ آہ کی رعایت سے "زلف" استعمال کیا ہے، کیونکہ درازیِ زلف بھی مسلم ہے! (اندازِ بیان بہت دل کش ہے)

(۲) "موج" کی "دام" سے تشبیہ دیکر "ہر موج" میں "دام" لکھا ہے۔
"حلقۂ صد کام نہنگ" = صد حلقہ ہائے کام نہنگ یا حلقۂ کام
صد نہنگ، یعنی دہن نہنگ کے سینکڑوں حلقے مراد ہیں۔ مطلب
یہ کہ دریا موجوں کا جال ہے، جس کے حلقے، دہن ہائے
نہنگ ہیں، دیکھئے قطرۂ نیسان پر گہر ہونے تک کیا گزرتی
ہے یا اس عالم حوادث و ابتلا کا ذرہ ذرہ انسانی مسرت کا
دشمن ہے اگر ان الجھنوں سے نکل گیا تو کامیاب ہو گیا۔ یا اس
بحر کثرت کی ایک ایک موج دام ہے جس میں دہن نہنگ سے
ایں داں کے سینکڑوں حلقے ہیں، ان سے ایمان بچ جائے
تو گوہر مقصود پائے، مگر دیکھئے عرفان حقیقت تک
میں اس پر کیا گزرتی ہے؟!
(۳) "صبر طلب" بمعنی طالب، طوالت طلب، دیر طلب، تمنّا
عشق کا استعارہ ہے، اور چونکہ دل کی چارہ طلبی تھی، اس کے
مقابلہ میں "خون جگر" لائے ہیں۔ قریب قریب اسی مضمون کا
ایک شعر اس سے پہلے گزر چکا ہے، یعنی "دل ہوا کشمکش
چارۂ زحمت میں تمام، مٹ گیا گھسنے میں اس عقدے کا وا ہونا"
یہاں زحمت چارۂ دل نے دل کو تمام کردیا، اور یہاں
صبر طلبی سے خون جگر ہونا، اور خون جگر ہونے تک دل کی
حالت کی طرف متوجہ کیا ہے!
(۴) یعنی جب تک آپ کو خبر ہوگی، ہماری جان جا چکی ہوگی
گی، مانا کہ آپ تغافل نہ فرمائیں گے، لیکن آپ کو خبر ہونے تک

حال کی خبر بھی تو ہو۔

(۵) "پرتو خور" نورِ آفتاب۔ آفتاب کی تشبیہ بھی آنکھ سے کیا کرتے ہیں، عاشق کی ہستی بے ثبات کی تمثیل بے ثباتی شبنم سے کی ہے۔ چونکہ آفتاب کا وجود، کائنات کے لئے منبع فیض ہے، اسی رعایت سے چشم کرم یار سے تشبیہ دی گئی ہے، یعنی جس طرح چشم آفتاب باوجودِ فیض، شبنم کو فنا کر دیتی ہے، اسی طرح عاشق کو نگاہ کرم بھی ہلاک کر دیتی ہے۔ دوسرے الفاظ میں شعر کا یہ مطلب ہوگا کہ فنا سے وہ مقام معرفت و سلوک مراد ہے، جو عشق الٰہی میں پیش آتا ہے۔ "میں بھی ہوں" کے معنی زبانِ اہل عرفان میں "انانیت" اور "خودی" کے ہیں، اور اسی "میں بھی ہوں" کے مٹنے کو "فنا" کہتے ہیں، اسی کو دوسرے الفاظ میں بیخودی و خود فراموشی کہہ سکتے ہیں، معشوق کی نگاہ اور خصوصاً نگاہ التفات کا اثر بیخودی مسلم ہے، یعنی میری جداگانہ ہستی، یا خودی، یا انانیت تو تیری نظر کرم ہونے تک باقی ہے، جو وقت نگاہ عنایت مجھ پر پڑ گئی میری ہستی "فنا" ہو جائے گی، جس طرح تابش آفتاب شبنم کو بخاراتی حالت میں متحول کر دیتی، اور شبنم کو فنا کر دیتی ہے!!

(۶) "یک نظر بیش نہیں" ایک لحظہ سے زیادہ نہیں فرصتِ ہستی مدت زندگی "گرمیِ بزم" رونق و آرائشِ محفل "شرر" چنگاری جو شمع سے چکراتا ہوا سا نکلتا اور بجھ جاتا ہے، اس کے نکلنے کو رقص سے تعبیر کرتے ہیں، یعنی مدتِ عمر اس سے زیادہ

نہیں کہ عالمِ موجودات کا صرف ایک نظارہ سرسری کر لیا جائے جس طرح شرر کے لئے سارا لطفِ محفل اُس کی ایک گردش تک ہے، محفل، شمع گو تا قیامت رہے، لیکن اُس کو اس سے زیادہ مہلتِ بقا نہیں۔

(۷) موت کو شعرا صبحِ فنا لکھتے ہیں، اور شمع بھی صبح کو، شمع کشتہ کہلاتی ہے۔ یعنی غمِ ہستی کے سوز و گداز کا علاج سوائے فنا کے کچھ نہیں، جس طرح شمع کو رات بھر جلنا ہی پڑتا ہے بالآخر صبح جو اس کے لئے فنا ہوتی ہے اس کے سوز کا علاج کرتی ہے۔

گر تجھ کو ہے یقینِ اجابت، دعا نہ مانگ ۱ یعنی بغیر یک دلِ بے مدعا نہ مانگ
آتا ہے داغِ حسرتِ دل کا شمار یاد ۲ مجھ سے مرے گنہ کا حساب اے خدا نہ مانگ

(۱) "اجابت" اصطلاحاً، قبولیتِ دعا۔ "بے مدعا" بے طلب۔ یعنی اگر تجھ کو یہ یقین ہو جائے کہ دعا قبول ہو جائے گی، تو یہ دعا مانگ کہ اے خدا، مجھے ایسا دل عنایت فرما جس میں کوئی خواہش و طلب نہ ہو" تاکہ یہ استغنا دنیا بھر سے فارغ کر دے!

(۲) حسرت کا مفہوم، آرزو مندی ہے "آرزو پوری نہ ہونے سے داغ ہوتا ہے، مطلب ہے کہ اے خدا مجھ سے مرتکبِ گناہوں کا مواخذہ نہ فرما، کیونکہ ناکردہ گناہوں کی حسرتوں نے میرے دل میں جو داغ دیئے ہیں وہ بھی یاد آتے ہیں، اور مجھے اور زیادہ شرمندگی ہوتی ہے۔ اسی مضمون کو دوسری جگہ دوسرے عنوان سے اس طرح بیان فرمایا ہے:۔

ناکردہ گناہوں کی بھی حسرت کی ملے داد
یارب اگر ان کردہ گناہوں کی سزا ہے

ہے کس قدر ہلاکِ فریبِ وفائے گل	۱	بلبل کے کاروبار پہ ہیں خندہ ہائے گل
آزادئ نسیم مبارک کہ ہر طرف	۲	ٹوٹے پڑے ہیں حلقۂ دامِ ہوائے گل
جو تھا سو موجِ رنگ کے دھوکے میں مر گیا	۳	اے وائے نالۂ لبِ خونیں نوائے گل
خوش حال اس حریفِ سیہ مست کا کہ جو	۴	رکھتا ہو مثلِ سایۂ گل سر بپائے گل
ایجاد کرتی ہے اسے تیرے لیے بہار	۵	میرا رقیب ہے نفسِ عطر سائے گل
شرمندہ رکھتے ہیں مجھے بادِ بہار سے	۶	مینائے بے شراب و دلِ بے ہوائے گل
سطوت سے تیرے جلوۂ حسنِ غیور کی	۷	خوں ہے مری نگاہ میں رنگِ ادائے گل
تیرے ہی جلوے کا ہے یہ دھوکا کہ آج تک	۸	بے اختیار دوڑے ہے گل در قفائے گل
غالب مجھے ہے اس سے ہم آغوشی آرزو جس کا خیال ہے گلِ جیبِ قبائے گل	۹	

(۱) بلبل گلوں سے وفا اور فریب ... تک ہو گئے ہیں
بلبل کی آہ و زاری ہوتی ہے اس پر پھول مسکرا رہے ہیں۔
(۲) نسیم نکہت ... ہو گیا ہے۔ گل جب تک کلی کی صورت میں
تھا گویا دامِ ہوا کے حلقوں میں جکڑا ہوا تھا اور خود کلی کی شکل
حلقہ نما ہو کر دام بن گیا ہے یعنی اب حلقہ ہائے دامِ ہوا
ٹوٹ گئے ہیں (یعنی پھول کھل گئے ہیں) اور شگفتگی گل حلقہ ہائے
دامِ ہوا کی شکست سے تعبیر کیا ہے اور ٹوٹے گل اور
نسیم کو آزادی ... جیسی ہو گئی ہے۔
(۳) ... نالۂ لبِ خونیں نوائے گل کی رعایت سے ... رنگ

دلِ پُر خوں کو "پھولوں کی پنکھڑیوں" سے استعارہ دے کر
"..." سے تشبیہ لائے ہیں یعنی جس کو دیکھ کر
کی ... رنگ ... پہنچایا گیا ہے۔ حالانکہ یہ پنکھڑیاں زبانِ
حال ... پر رنگِ نالہ خونیں ہے!

(۳) ... "..." ... کی ... ناامیدی ...
گل ... شوق ... یعنی ... اشارہ ہے کہ
... کے ... شوق کے ... ڈال دیا ہوا
(۴) ... منظر یعنی بہار پھولوں کو ...
... ہے۔ پھولوں کی ... کی ... ہے۔ کم
... کو ... میسر ہے۔

(۵) "..." ظرف ... نقش ... ظرف سے ...
... مستقل ... دل ... ہوا ... گل "وہ دل
... سیر گل کا شوق باقی نہ ہو۔ یعنی ... دل ...
... ہو ... شرمندہ ... گئی ہیں۔

(۶) ... "حسن ..." دو حسن جس کی شہرت ایسی
... یعنی ... جلوہ حسن محبوب کی ...
پھول کے رنگ و ادا کو میرے لئے دل کش نہیں رکھتی۔ بلکہ
میری نگاہوں میں اس کے رنگ کا خون کر دیتی ہے۔

(۷) "... گل" ... دیگر سے پھولوں کا کھلنا مراد
ہے۔ یعنی تیرے جلوہ کے ذوقِ دیدار میں پھولوں کی شگفتگی
کا سلسلہ جاری ہے۔

(۹) گل: جیبِ قبائے گل پیرہن گل کی جیب کا پھول یا معشوقوں کا معشوق یا معشوقِ حقیقی۔ مطلب ہے کہ مجھے اس سے وصال ہونے کی آرزو ہے جو معشوقوں کا معشوق ہے۔

غم نہیں ہوتا ہے آزادوں کو بیش از یک نفس
(۱)
برق سے کرتے ہیں روشن شمعِ ماتم خانہ ہم

محفلیں برہم کرے ہے گنجفہ بازِ خیال
(۲)
ہیں ورق گردانیِ نیرنگِ یک بت خانہ ہم

باوجودِ یک جہاں ہنگامہ پیدائی نہیں
(۳)
ہیں چراغانِ شبستانِ دلِ پروانہ ہم

ضعف سے ہے نے قناعت سے یہ ترکِ جستجو
(۴)
ہیں وبالِ تکیہ گاہِ ہمتِ مردانہ ہم

دائم الحبس اس میں ہیں لاکھوں تمنائیں اسد
(۵)
جانتے ہیں سینۂ پرخوں کو زنداں خانہ ہم

---

(۱) بزم کے التزام سے شمع کا ذکر ہے۔ برق سے روشن کرتے ہیں یعنی برق کی شمع روشن کرتے ہیں۔ بیش از یک نفس برق کی سرعتِ نمود کی توضیح ہے۔ مطلب ہے کہ آزاد منش لوگوں کو ایک لمحہ سے زیادہ کوئی غم نہیں ہوتا۔ ان کی بزمِ ماتم صرف اتنی دیر برپا رہتی ہے جتنی دیر میں بجلی چمک جاتی ہے۔
(۲) محفل سے مراد محفلِ حسینان ہے۔ حسینوں کو شاعرانہ زبان میں بت بھی کہتے ہیں اس لئے بزمِ حسینان اور بت خانہ مرادف مفہوم ہیں۔ مناسبتِ محفل کی رعایت سے "گنجفہ باز"

اور گنجفہ باز کی رعایت سے "ورق گردانی" استعمال ہوتے ہیں۔
"نیرنگ" انقلابات و عجائب۔ گنجفہ باز خیال معشوق متلون
مزاج سے استعارہ ہے۔ مطلب ہے کہ وہ شوخ متلون مزاج
محفل آرائیاں اور محفلیں برہم کرتا رہتا ہے۔ گویا ہم بھی انقلابات
محبت خانہ کے تختۂ مشق ہیں۔ گویا مشیت الہٰی کی طرف اشارہ
ہے کہ اسکی مشیت نے ہم کو حوادث کا تختۂ مشق بنا رکھا ہے۔
(۱۳) "با وجودیک جہاں ہنگامہ" باوجودیکہ اتنا ہنگامہ اور
ہلچل ہے کہ ایک جہان معلوم ہوتا ہے۔ یا باوجودیکہ ہنگامہ نے
ایک دنیا بنا دی ہے۔ "پیدائی" نمود و وجود۔ چراغ یا شمع کے
ظہور و جلوہ کی یہ ہنگامہ آرائی ہے کہ پروانوں کو فریفتگی اور آرزو
سوز کی شورش میسر ہے۔ لیکن حقیقتاً اُن چراغوں اور شمعوں
میں یہ قدرت کہاں کہ کسی میں کوئی فریفتگی پیدا کر سکیں۔
یہ تو خالق و صانع کائنات نے جبلت و خلقت میں اس
قسم کے خواص مطبوع فرما دیئے ہیں کہ پروانہ شمع کا عاشق
ہوتا ہے اور وہ اور یہی چراغان قادر ہے جو دل پروانہ میں
ہے۔ اور محرک عشق شمع ہے یعنی وہ اصل ہنگامہ فرما چراغ دل
پروانہ میں روشن ہے۔ اور پروانہ عام چراغوں کو وہی چراغ
سمجھ کر سوز عشق میں جلتا ہے۔ یہی کیفیت تمام موجودات عالم
کی ہے۔ کہ وجود تو نظر آتا ہے۔ لیکن وہ وجود حقیقی کا صرف
پرتو یا عکس ہوتا ہے اور یہی مثال ہمارے وجود کی حقیقت
کی ہے۔ کہ ہم کو شمع کی طرح ظاہر و پیدا ہیں لیکن ہماری

حقیقت بھی [illegible] چراغ ہے جو شبستانِ دل پروانہ میں روشن [illegible]
(۳) مضمون [illegible] ہے ۔ قناعت ایک روحانی کیفیت
ہے کہ جو میسر آ جائے اسی [illegible] کافی دوسری [illegible]
جائے زیادہ کی ہوس و خواہش نہ ہو [illegible] [illegible]
[illegible] قناعت کے مقابلہ میں [illegible]
کیفیت ہے کہ [illegible] جائے [illegible] سرگرم
رہنا یعنی ہمارا ترکِ خواہشات کرنا بھی [illegible]
[illegible] ہے کہ قناعت کی وجہ [illegible]
[illegible] ہوا ہیں ۔
(۵) [illegible] یعنی ہمارے دل [illegible]
[illegible] نہیں ہو سکتیں گویا یہ [illegible]
[illegible]

[illegible]	۱	[illegible]

(۱) اصل [illegible] سے [illegible]
[illegible] تعلق و [illegible]
[illegible] ہے کہ سلسلۂ تعلقات [illegible]
[illegible] اور [illegible] آتا ہے [illegible]
[illegible] نہیں ہوتا ۔

مجھ کو دیارِ غیر میں مارا وطن سے دور	۱	رکھ لی مرے خدا نے مری بیکسی کی شرم
وہ حلقہ ہائے زلف کمیں میں ہیں اے خدا	۲	رکھ لیجیو مرے دعویٔ وارستگی کی شرم

(۱) بیکسی کا کمال یہ ہے کہ کوئی شریک و ہمدرد حال [illegible] کیا کرتی

شناسا اور واقف بھی نہ ہو۔ اور یہ بیکسی غربت میں چاہتی ہے

اسی مضمون کو شعر میں ادا کیا گیا ہے۔

(۲) وارستگی "آزادی" — یعنی نفرت میری تاک میں ہے مجھے اسے

خدا میرے [illegible] آزادی [illegible] کی شرم رکھ

لینا کہیں ایسا نہ ہو کہ میری ذلت ہو جائے۔

[illegible] ایک [illegible]	[illegible] ایک دن

(۱) [illegible] قرض [illegible] اور [illegible]

آرام کی نیند [illegible] میں یا [illegible] وہ مال [illegible]

ہوتی [illegible] قرض تو لے لیتے ہیں لیکن [illegible]

[illegible] بیان کر کے لکھا ہے [illegible]

کرنے سے ادا کر دیں گی۔

وہ فراق اور وہ وصال کہاں	وہ شب و روز و ماہ و سال کہاں
فرصتِ کاروبارِ شوق کسے	ذوقِ نظارۂ جمال کہاں
دل تو دل وہ دماغ بھی نہ رہا	شورِ سودائے خط و خال کہاں
تھی وہ اک شخص کے تصور سے	اب وہ رعنائیٔ خیال کہاں
ایسا آساں نہیں لہو رونا	دل میں طاقت جگر میں حال کہاں
ہم سے چھوٹا قمار خانۂ عشق	واں جو جاویں گرہ میں مال کہاں
فکرِ دنیا میں سر کھپاتا ہوں	میں کہاں اور یہ وبال کہاں

مضمحل ہو گئے قویٰ غالبؔ

وہ عناصر میں اعتدال کہاں

یہ تمام غزل نظم کی طرح ایک ہی مضمون یادِ ایامِ گذشتہ پر

لکھی ہے اور عہد شباب کے فراق و وصال دونوں کی یاد اور
ذکر پر موجود کے حسرت و شوق پر مشتمل ہے۔ غزل نہایت صاف
عام فہم اور رواں ہے۔

(۱)
کی وفا ہم سے تو غیر اس کو جفا کہتے ہیں
ہوتی آئی ہے کہ اچھوں کو برا کہتے ہیں

(۲)
آج ہم اپنی پریشانیٔ خاطر ان سے
کہنے جاتے تو ہیں پر دیکھیے کیا کہتے ہیں

(۳)
اگلے وقتوں کے ہیں یہ لوگ انہیں کچھ نہ کہو
جو مے و نغمہ کو اندوہ ربا کہتے ہیں

(۴)
دل میں آ جائے ہے ہوتی ہے جو فرصت غش سے
اور پھر کون سے نالے کو رسا کہتے ہیں

(۵)
ہے پرے سرحد ادراک سے اپنا مسجود
قبلے کو اہل نظر قبلہ نما کہتے ہیں

(۶)
پائے افگار پہ جب سے تجھے رحم آیا ہے
خار رہ کو ترے ہم مہر گیا کہتے ہیں

(۷)
اک شرر دل میں ہے اس سے کوئی گھبرائے گا کیا
آگ مطلوب ہے ہم کو جو ہوا کہتے ہیں

(۸)
دیکھیے لاتی ہے اس شوخ کی نخوت کیا رنگ
اس کی ہر بات پہ ہم نام خدا کہتے ہیں

(۹)
وحشت و شیفتہ اب مرثیہ کہویں شاید
مر گیا غالب آشفتہ نوا کہتے ہیں

(۱) یعنی جب ہم سے وفا کی تو یقیناً غیروں سے بے وفائی ہوئی اس لیئے وہ بُرا کہتے ہیں لیکن ہم سے وفا کرنا خوبی ہے اور اغیار اُن کی وفا کے مستحق نہ تھے۔ اس لیئے اُن کا بُرا کہنا ایسا ہی ہے کہ اچھوں کو اکثر بُرا ہی کہا کرتے ہیں۔

(۳) مصرعۂ اولیٰ عام محاورہ سا ہے۔ جو اگلے زمانہ کے لوگوں کے لیئے کہا گیا ہے۔ دورِ موجود کے لوگ اس خیال سے کہ زمانہ ترقی کر رہا ہے اور ہر ماضی ہر حال سے نسبتہً تاریکی اور جہل میں گذرا ہے۔ لیکن ساتھ ہی اس کے اگلے وقتوں کے لوگوں کو ان کی بزرگی و اوّلیت کا لحاظ کرتے ہوئے بُرا نہیں کہتے۔ مصرعۂ ثانی کا مطلب ہے کہ شراب اور راگ سے غم غلط نہیں ہوتا کیونکہ غم غلط ہونے والی چیز نہیں پھر غمِ عشق تو ان سے اور ترقی کرتا ہے۔

(۴) نالہ کی یہ رسائی کیا کم ہے کہ جہاں غش سے فرصت ملی کہ دل میں آ پہنچا۔

(۵) "ادراک" فہم۔ اور سمجھ "مسجود" معبود جس کو سجدہ کیا جاتا ہے "قبلہ" مرجعِ عبادات و سجود۔ جس کے سامنے یا جس کو سامنا بنا کر سجدہ اور عبادتیں ادا کیئے جائیں۔ اور چونکہ نماز وغیرہ کعبہ کی طرف پڑھتے ہیں اس لیئے اُس کو قبلہ کہتے ہیں۔ لیکن مقصود بالذات جو قبلۂ عبادت ہے وہ وحدہٗ لاشریک لہٗ ہے پس قبلۂ اول سے مقصودِ عبادات، ذاتِ باری تعالیٰ مراد ہے اور قبلۂ ثانی سے کعبۂ عربستان جس کو عرفِ عام میں قبلہ کہتے ہیں

مطلب یہ ہے کہ [illegible] آگے

[illegible] بتا دیا ہے۔

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible] (1)

[illegible]

[illegible] کہ کچھ باقی ہے تن میں [illegible] (2)

رنگ ہو اڑ کر گیا ہو جس کے دامن میں نہیں

ہو گئے ہیں جمع اجزائے نگاہِ آفتاب

(۳)

ذرّے اس کے گھر کی دیواروں کے روزن میں نہیں

کیا کہوں تاریکیٔ زندانِ غم اندھیر ہے

(۴)

پنبہ نورِ صبح سے کم جس کے روزن میں نہیں

رونقِ ہستی ہے عشقِ خانہ ویراں ساز سے

(۵)

انجمن بے شمع ہے گر برق خرمن میں نہیں

زخم سلوانے سے مجھ پر چارہ جوئی کا ہے طعن

(۶)

غیر سمجھا ہے کہ لذت زخمِ سوزن میں نہیں

بس کہ ہیں ہم اک بہارِ ناز کے مارے ہوئے

(۷)

جلوۂ گل کے سوا گرد اپنے مدفن میں نہیں

قطرہ قطرہ اک ہیولیٰ ہے نئے ناسور کا

(۸)

خوں بھی ذوقِ درد سے فارغ مرے تن میں نہیں

لے گئی ساقی کی نخوت قلزم آشامی مری

(۹)

موجِ مے کی آج رگ مینا کی گردن میں نہیں

ہو فشارِ ضعف میں کیا ناتوانی کی نمود

(۱۰)

قد کے جھکنے کی بھی گنجائش مرے تن میں نہیں

تھی وطن میں شان کیا غالبؔ کہ ہو غربت میں قدر

(۱۱)

بے تکلف ہوں وہ مشتِ خس کہ گلخن میں نہیں

---

(۱) یعنی اس کی زبان لیا ہے کہ گویا عشق تنگ سے دکھا رہا ہے
جس کا چاک دامن تک نہ پہنچ گیا ہو۔

(۲) چہرہ وغیرہ پر سرخی اور رونق و رنگ، خون اور دوران خون ہی کی وجہ سے ہوتے ہیں اور رنگ اُڑ جانے سے مراد یہی ہے کہ خون رنگ ہو ہو کر اُڑ گیا۔ اور خون جب باقی ہی نہ رہا تو اشکوں میں کیا نکل سکتا ہے اور دامن پر رنگین دھبے کہاں سے آ سکتے ہیں۔

(۳) روزنِ دیوارِ یار کے چمک اور ذرّے گویا نگاہِ شوق آفتاب کے اجزا ہیں۔

(۴) "غمِ دل" سے عالم تاریک ہو جانا عام طور پر کہا جاتا ہے اور غم سے چھٹکارا نہ پانا گویا غم زنداں ہے۔ "اندھیر" کی تاکید و رعایت نہایت پاکیزہ ہے۔ "پنبۂ روزن" ضد اور مقابلہ کی نسبت سے تمام حالات کا اندازہ کیا جاتا ہے۔ ظاہر ہے کہ جہاں روئی کی سفیدی نورِ صبح کی مثل معلوم ہوتی ہو وہاں تاریکی کا کیا عالم ہوگا۔

(۵) "رونقِ ہستی" زندگی کی چہل پہل اور ہستی میں رونق نہ ہو تو انجمن بے شمع ہے۔ "عشقِ خانہ ویراں ساز" برقِ خرمن سہی لیکن زندگی کی چہل پہل اور ہنگامہ اسی سے قائم ہے۔ یہاں "رونق" اور "خانہ ویراں ساز" متضاد سے معلوم ہوتے ہیں لیکن اوّل تو "ہستی" اور "خانہ" دو علیحدہ باتیں ہیں دوسرے یہ کہ رونق ہنگامہ بربادی سے ہو سکتی ہے۔ اگرچہ عرفِ عام میں رونق انتظام و اہتمام اور صنعت سے متعلق ہے۔

(۶) یعنی سوئی چبھنے سے جو درد ہوتا ہے اُس کی لذت حاصل

کرنے کے لئے میں زخم سلواتا ہوں۔ اور غیر یہ سمجھتا ہے کہ چارۂ زخم مقصود ہے۔

(۷) "بہارِ ناز" جس میں گوناگوں ناز و انداز کے پھول کھلتے ہوں معشوق سے استعارہ ہے۔ یہاں ناز کی لفظی رعایت سے جلوۂ گل کہا گیا ہے۔

(۸) "ہیولیٰ" کالبد۔ مادہ۔ یعنی ہر ایک قطرہ میں ناسور ہو جانے کا مادہ موجود ہے۔ اور میرے جسم کا خون بھی ذوقِ درد کی صلاحیت رکھتا ہے۔

(۹) "نخوت" زعم مراد ہے۔ قلزم آشامی۔ کثرت سے نوشی قلزم کی رعایت سے موج اور خط یا نشان سے کو غرور و نخوت کے لوازمہ میں "رگ" کہا گیا ہے۔ "مینا" صراحی سے اور گردن میں رعایت ہے۔ یعنی ساقی کو تنہا ہی شراب پر بہت ناز تھا۔ لیکن میں سب پی گیا۔

(۱۰) "فشار" دبانا یا جکڑنا۔ مبالغہ ہے۔ یعنی جھکنا بھی محال ہے۔

(۱۱) "مشتِ خس" "مٹھی بھر تنکے" "دیگِ گلخن" انگیٹھی۔ تنکوں کی ان کے وطن جنگل میں پرسش ہی کیا۔ پھر جنگل سے باہر غربت میں مشتِ خس کی حیثیت کوڑے کی ہوتی ہے۔ البتہ گلخن کو تھوڑی دیر روشن کر دینے کے کام آ سکتے ہیں۔ یہی مطلب شعر کا ہے کہ وطن اور غربت دونوں جگہ ہماری شان و قدر ہی کیا ہاں آتشکدۂ عشق میں ڈال دیئے جاتے تو بہتر تھا کہ ہم اس قابل ضرور ہیں۔

[illegible]	۱	گر ایک ادا ہو تو اُسے اپنی قضا کہہ لیں
حلقہ میں [illegible]	۲	[illegible]
ہیں اور [illegible]	۳	[illegible]
ظالم [illegible]	۴	ہے [illegible]

[illegible] ہو سکتا [illegible] اور اسی [illegible] کہنا نہ دو اداؤں کی تعریف [illegible] کے نا دو اداؤں کا [illegible] ہو سکتا [illegible] وہاں تو [illegible] نا دو ادائیں ہیں [illegible] ایک ادا کو اپنی قضا کہہ سکتا اور یہاں دو قضائیں [illegible] سکتا ہوں [illegible] اور کوئی حالت باقی نہیں [illegible] اس کے [illegible] اس کے بقیہ نا دو اداؤں [illegible] ہوں ۔

[illegible] نہیں ہو [illegible] تشبیہ ہے اور [illegible] قرار دیا ہے ۔

[illegible] استعمال بھی اس [illegible] زبان کے یا غیر زبان [illegible] استعمال ہوتا ہے [illegible] اس طرح نہیں [illegible]

(۴) "گمان" بمعنی سوئے ظن استعمال ہوا ہے "منفعل" شرمندہ
خدا نکردہ محاورہ ہے۔ جیسے خدا نخواستہ یعنی میرے ساتھ
ایسا برتاؤ نہ کر کہ خدا نخواستہ میں زبان سے تجھے بیوفا کہنے پر
مجبور ہو جاؤں۔ کیونکہ ابھی تک میں اپنی بدگمانی سے یہ مقابلہ
بھی کرتا ہوں کہ تو بیوفائی نہ کرے۔

۱	مہرباں ہو کے بلا لو مجھے چاہو جس وقت	میں گیا وقت نہیں ہوں کہ پھر آ بھی نہ سکوں
۲	ضعف میں طعنۂ اغیار کا شکوہ کیا ہے	بات کچھ سر تو نہیں ہے کہ اٹھا بھی نہ سکوں
۳	زہر ملتا ہی نہیں مجھ کو ستمگر ورنہ	کیا قسم ہے ترے ملنے کی کہ کھا بھی نہ سکوں

(۱ تا ۳) وقت جا کر نہیں آتا۔ شدت ضعف میں سر اٹھانا مشکل ہوتا ہے
معشوق سے ملنے کی قسم کھانا عاشق سے ناممکن ہے۔ تینوں اشعار
میں یہ تینوں باتیں نہایت بے ساختگی سے بامحاورہ لکھی گئی ہیں،
اور محاسن استعمال قابل داد ہیں۔

۱	ہمسے کھل جاؤ بوقتِ مے پرستی ایکدن	ورنہ ہم چھیڑینگے رکھ کر عذرِ مستی ایکدن
۲	غرۂ اوجِ بنائے عالمِ امکاں نہ ہو	اس بلندی کے نصیبوں میں ہے پستی ایکدن
۳	قرض کی پیتے تھے مے لیکن سمجھتے تھے کہ ہاں	رنگ لائیگی ہماری فاقہ مستی ایکدن
۴	نغمہ ہائے غم کو بھی اے دل غنیمت جانیے	بے صدا ہو جائیگا یہ سازِ ہستی ایکدن
۵	دھول دھپا اُس سراپا ناز کا شیوہ نہ تھا	ہم ہی کر بیٹھے تھے غالبؔ پیش دستی ایکدن

(۱) "کھل جاؤ" بے تکلف ہو جاؤ۔ یعنی مے خواری کے وقت ہم سے
کسی دن بے تکلف ہو جاؤ ورنہ ہم نشہ کا بہانہ کر کے کبھی نہ کبھی
خوب چھیڑیں گے اور یوں بے تکلف ہو جانے میں تمہاری شان
میں بھی فرق نہ آئیگا کیونکہ نشہ کا عُذر معقول ہے۔

(۲) "عزّہ" گھمنڈ "اوج" عروج۔ عالمِ امکان "دنیا یعنی اس عالم کے اسباب پر یا بناء پر کسی عروج و کمال کا گھمنڈ نہ ہو جائے کیونکہ یہاں ساری ترقیوں اور بلندیوں کے لئے پستیاں اور تنزل ہیں اور ایک دن یہی اس عالم کا حشر ہو جائیگا۔

(۳) "رنگ لائے گی" فساد و فتنہ پیدا کرے گی یعنی مفلسی میں شراب پینا رنگ لائے گا۔

(۴) "ساز ہستی" جسمِ انسانی سے استعارہ ہے۔ اور ساز کی رعایت سے "صدا اور نغمہ" استعمال ہوئے ہیں "خاموشی" خاصۂ موت ہے۔ اس لئے آواز خواہ درد و غم ہی کی کیوں نہ ہو لوازماتِ زندگی میں سے ہے۔ اس لئے نغمہ ہائے غم کو بھی غنیمت سمجھنا چاہئے۔

ہم پر جفا سے ترکِ وفا کا گماں نہیں	۱	اک چھیڑ ہے وگرنہ مراد امتحاں نہیں
کس منہ سے شکر کیجئے اس لطفِ خاص کا	۲	پرسش ہے اور پائے سخن درمیاں نہیں
ہم کو ستم عزیز ستمگر کو ہم عزیز	۳	نا مہرباں نہیں ہے اگر مہرباں نہیں
بوسہ نہیں نہ دیجئے دشنام ہی سہی	۴	آخر زباں تو رکھتے ہو تم گر دہاں نہیں
ہر چند جاں گدازیِ قہر و عتاب ہے	۵	ہر چند پشت گرمیِ تاب و تواں نہیں
جاں مطربِ ترانۂ ہل من مزید ہے	۶	لب پردہ سنجِ زمزمۂ الاماں نہیں
خنجر سے چیر سینہ اگر دل نہ ہو دو نیم	۷	دل میں چھری چبھو مژہ گر خونچکاں نہیں
ہے ننگِ سینہ دل اگر آتشکدہ نہ ہو	۸	ہے عارِ دل نفس اگر آذر فشاں نہیں
نقصاں نہیں جنوں میں بلا سے ہو گھر خراب	۹	سو گز زمیں کے بدلے بیاباں گراں نہیں
کہتے ہو کیا لکھا ہے تری سرنوشت میں	۱۰	گویا جبیں پہ سجدۂ بت کا نشاں نہیں

پاتا ہوں اُس سے داد کچھ اپنے کلام کی	۱۱	رُوح القدس اگرچہ مرا ہمزباں نہیں	
	(۱۲)	جاں ہے بہائے بوسہ ولے کیوں کہے ابھی غالبؔ کو جانتا ہے کہ وہ نیم جاں نہیں	

(۱) ہم پر اُنہیں ترکِ وفا کا گمان نہیں ہے۔ بلکہ وہ جفا کر کے امتحان کا نام لیتے ہیں یہ ایک قسم کی چھیڑ ہے۔

(۲) یعنی ہم سے تو بات چیت ہوتی نہیں دوسروں سے ہمارا حال پُوچھ لیتے ہیں یہ خاص معشوقانہ انداز ہے۔ اور یہ پرسشِ حال لطفِ خاص ضرور ہے لیکن اس کا شکر کون ادا کرے۔ خود ہم سے پُوچھتے ہو تو ہم ہی شکر ادا کرتے۔

(۳) ہم ستم پسند ہیں اور وہ جفا پسند۔ وہ چونکہ جفا پسند ہے اس لئے لُطف و عنایت نہیں کرتا۔ اور ستم کرتا ہے جو ہمیں عزیز ہے پس ہمارے لئے وہ نامہربان نہیں ہے۔

(۴) معشوق کی صفت بے دہانی (مبالغہ تنگیٔ دہن) ہے پھر بوسہ دہن کا مطالبہ بھی ہوا کرتا ہے۔ اور طلب بوسہ پر گالیاں کھانے میں بھی مزہ آتا ہے۔ مطلب یہی ہے کہ بوسہ نہ سہی۔ گالیاں تو دے دیجئے۔ دہن نہیں ہے زبان تو ہے۔

(۵ و ۶) "جاگدازی" بیقراری و بے چینی مُراد ہے پشت گرمی ہمت برداشت۔ "تاب و تواں" طاقت و ضبط "مطرب" گانے والا "ہل من مزید" کچھ اور زیادتی۔ "پردہ سنج" مطرب کی رعایت سے یہ لفظ بمعنی جنبشِ لب استعمال ہوا ہے "زمزمہ" نغمہ۔ یعنی اگرچہ قہر و عتاب یا جفا و ستم سے بے چینی و اضطراب ہیں

اور ضبط و تحمل کی طاقت نہیں لیکن جان ہے کہ ترانۂ ہل من مزید گا رہی ہے اور نہ لبوں پر لفظ الامان ہے۔ دونوں شعروں میں ایذا طلبی ظاہر کی گئی ہے۔

(۷و۸) "آذر" اس آتشکدہ کے بانی کا نام ہے جس میں ابراہیم خلیل اللہ ڈالے گئے تھے۔ آذر فشاں کی ترکیب اسی تلمیح سے یعنی آتش افشانی و شرر افشانی ماخوذ ہے اور نہایت پُر شوکت ترکیب ہے۔ یعنی اگر زخمِ عشق سے دل پارہ پارہ نہ ہو تو سینہ خنجر سے چیر ڈالو۔ اور دل کو دو نیم کر لو۔ اور پلکوں سے اگر دمِ گریہ خون نہ ٹپکتا ہو تو دل میں چھری چبھو کہ خوننابہ فشانی کریں۔ دل میں اگر آتشکدہ عشق نہیں تو سینہ کے لئے ایسا سرد مردہ دل ننگ و عار ہے۔ اور جو سانس شرر فشاں نہ ہو وہ دل کے لئے باعثِ شرم ہے (ایذا طلبی کا ایسا پُر لطف اسلوبِ بیان بیداد کا سزاوار ہے اس کا لطف کچھ زخمی دلانِ عشق اور سوختہ جانانِ الفت ہی اُٹھا سکتے ہیں)

(۹) یعنی گھر کا رقبہ دشتِ وحشت و جنوں کے بالمقابل ناقابلِ لحاظ ہے۔ گھر کی بربادی کے عوض اہلِ جنوں کو اتنی وسعتِ بیاباں میسر آجاتی ہے تو جنوں میں کچھ نقصان نہیں۔

(۱۰) یعنی آپ کے در پر جو سجدہ کرتے کرتے پیشانی پر داغ پڑ گیا ہے بس اسی کو قسمت کا لکھا سمجھ لیجئے۔ اب یہ کیا پوچھتے ہو کہ تیری قسمت میں کیا لکھا ہے۔

(۱۱) "روح القدس" حضرت جبرئیل مُراد ہیں۔ گو رُوح القدس میرا

ہمزباں نہیں لیکن وہی دادِ سخن دے سکتا ہے کیونکہ وہ تلامذۂ غیب سے واقف ضرور ہوتا ہے۔

(۱۲) بوسہ کی قیمت ایک جان ہے۔ لیکن وہ ابھی قیمت ظاہر نہیں کرتا کیونکہ جانتا ہے کہ جان دیکر بوسہ لیا جا سکتا ہے قیمت اُس وقت ظاہر کرے گا جب میں نیم جاں ہو جاؤں گا اور قیمت ادا کرنے کے قابل نہ رہوں گا۔

مانع دشت نوردی کوئی تدبیر نہیں	۱	ایک چکر ہے مرے پاؤں میں زنجیر نہیں
شوق اُس دشت میں دوڑائے ہے مجھکو کہ جہاں	۲	جادہ غیر از نگہ دیدۂ تصویر نہیں
حسرتِ لذتِ آزار رہی جاتی ہے	۳	جادۂ راہِ فنا جز دمِ شمشیر نہیں
رنج نومیدی جاوید گوارا رہیو	۴	خوش ہوں گر نالہ زبونی کش تاثیر نہیں
سر کھجاتا ہے جہاں زخم سر اچھا ہو جائے	۵	لذتِ سنگ باندازۂ تقریر نہیں
جب کرم رخصتِ بیباکی وگستاخی دے	۶	کوئی تقصیر بجز خجلتِ تقصیر نہیں

غالبؔ اپنا یہ عقیدہ ہے بقولِ ناسخؔ
آپ بے بہرہ ہے جو معتقدِ میرؔ نہیں

(۱) دشت نوردی سے باز رکھنے کی کوئی تدبیر بھی نہیں۔ زنجیر جو میرے پاؤں میں ہے وہ بھی میرے پاؤں کو جو چکر لگا ہوا ہے اُس کے مماثل ہے۔

(۲) "جادہ" خط راہ۔ "دیدۂ تصویر" تصویر کی آنکھ۔ تصویر ہمہ تن حیرت ہوتی ہے۔ گویا تارِ نگاہ حیرت خط راہ ہے۔ یا جہاں کی راہ حیران کن یا حیرانی ہے۔ یا جہاں ہمہ تن حیرت ہو کر چلنا پڑتا ہے یعنی شوق مجھکو عالم حیرت میں دوڑاتا ہے اور یہ ہنگامِ معرفت

الٰہی کا وہ مقام گو مگو ہے جہاں سے سالک پر آثارِ فنا طاری ہونے شروع ہوتے ہیں۔

(۳) وفا پرستانِ عشق کے لئے تلوار کی باڑہ راہِ فنا ہے۔ لیکن یہ وہ راستہ ہے کہ ایک لمحہ میں طے ہو جاتا ہے۔ اِس لئے رُک رُک کر جان دینے اور ستم ہائے گوناگوں کے مزے لینے کی حسرت باقی رہ جاتی ہے۔

(۴) "رُبونی کش" لذّت کش۔ یعنی نالہ کو تاثیر کے احسان اُٹھانے کی ذلت تو نہ ہوئی۔ میں خوش ہوں بہتر ہے کہ دائمی نا اُمیدی کا رنج ہی میرے لئے گوارا ہے۔

(۵) "باندازۂ تقریر نہیں" یعنی حدِ بیان سے باہر ہے۔

(۶) "کرم" معشوق کا التفات، اُس کی رواداری۔ "تقصیر" قصور کرنا۔ یہاں دست درازیاں اور اظہاراتِ شوق مراد ہیں مطلب ہے کہ جب محبوب کی رواداری بیباکی کی اجازت دے اور اُس کا کرم گستاخ دستیوں سے نہ روکے تو قصور کرنے سے شرمانا یا جھجکنا سب سے بڑا گناہ ہے۔

مت مردمکِ دیدہ میں سمجھو یہ نگاہیں	۱	ہیں جمع سویدائے دلِ چشم میں آہیں

(۱) "مردمک" آنکھ کی پتلی۔ "سویدا" دل کا نقطۂ سیاہ۔ سویدہ اور مردمک اور دیدہ و دل اور تارِ نگاہ اور آہوں میں تشبیہ ہے۔ یعنی پتلی میں نگاہیں نہیں ہیں۔ بلکہ سویدا میں آہیں ہیں۔

برشکالِ دیدۂ عاشق ہے دیکھا چاہیے	۱	کھل گئی مانندِ گل سو جا سے دیوارِ چمن
اُلفتِ گل سے غلط ہے دعوئ وارستگی	۲	سرو ہے با وصفِ آزادی گرفتارِ چمن

(۱) "برشگال" (بارش) شاعرانہ مبالغہ نگاری ہے۔
(۲) "وارستگی" آزادی۔ سرو کی بھی صفت آزادی ہے۔ لیکن سرو باغوں ہی میں ہوا کرتا ہے۔ گویا وہ باوصف آزادی اُلفتِ گل کے باعث زنداں خانۂ گلشن سے باہر نہیں نکل سکتا اور دعویٰ آزادی غلط ثابت ہوتا ہے۔

عشق تاثیر سے نومید نہیں	۱	جاں سپاری شجرِ بید نہیں
سلطنت دست بدست آئی ہے	۲	جامِ مے خاتمِ جمشید نہیں
ہے تجلی تری سامانِ وجود	۳	ذرّہ بے پرتوِ خورشید نہیں
رازِ معشوق نہ رُسوا ہو جائے	۴	ورنہ مر جانے میں کچھ بھید نہیں
گردشِ رنگِ طرب سے ڈر ہے	۵	غمِ محرومیٔ جاوید نہیں
کہتے ہیں جیتے ہیں اُمید پہ لوگ	۶	ہم کو جینے کی بھی اُمید نہیں
مے کشی کو نہ سمجھ بے حاصل	۷	بادہ غالبؔ عرقِ بید نہیں

(۱) "جاں سپاری" جان دینا۔ "شجرِ بید" بید کا درخت جو برگ و ثمر سے محروم پیدا ہوتا ہے یعنی عشق تاثیر سے مایوس نہیں ہے چونکہ عشق میں جان بھی جاتی ہے اور جان جیسی شے دینا بے نتیجہ و بے ثمر نہیں ہو سکتا۔ جیسا کہ شجرِ بید۔
(۲) "دست بدست" ہاتھوں ہاتھ۔ یعنی یکے بعد دیگرے۔ خاتمِ جمشید۔ جمشید کی انگوٹھی۔ یہاں مقصود یہ ہے کہ جامِ شراب سلطنت ہے یہ ہاتھوں ہاتھ جمشید سے ہم تک پہنچا ہے لیکن جامِ انگشتریِ جمشید نہیں کہ اُسی کا نام کندہ تھا اسی کے ہاتھ میں رہی اور کسی کو دستیاب نہ ہو سکی۔ اگر وہ بھی جام کی طرح

الٰہی کا وہ مقام گو مگو ہے جہاں سے سالک پر آثار فنا طاری ہونے شروع ہوتے ہیں۔

(۳) وفا پرستانِ عشق کے لئے تلوار کی باڑھ راہِ فنا ہے۔ لیکن یہ وہ راستہ ہے کہ ایک لمحہ میں طے ہو جاتا ہے۔ اس لئے رُک رُک کر جان دینے اور ستم ہائے گوناگوں کے مزے لینے کی حسرت باقی رہ جاتی ہے۔

(۴) "نہ ہوئی کش" لذت کش۔ یعنی نالہ کو تاثیر کے احسان اٹھانے کی ذلت تو نہ ہوئی۔ میں خوش ہوں بہتر ہے کہ دائمی ناامیدی کا رنج ہی میرے لئے گوارا ہے۔

(۵) "باندازۂ تقریر نہیں" یعنی حدِ بیان سے باہر ہے۔

(۶) "کرم" معشوق کا التفات، اس کی رواداری۔ "تقصیر" قصور کرنا۔ یہاں دست درازیاں اور اظہاراتِ شوق مراد ہیں۔ مطلب ہے کہ جب محبوب کی رواداری بیباکی کی اجازت دے اور اس کا کرم گستاخ دستیوں سے نہ روکے تو قصور کرنے سے شرمانا یا جھجکنا سب سے بڑا گناہ ہے۔

حسرت مردمکِ دیدہ میں سمجھو یہ نگاہیں	۱	ہیں جمع سویدائے دلِ چشم میں آہیں

(۱) "مردمک" آنکھ کی پتلی۔ "سویدا" دل کا نقطۂ سیاہ۔ سویدہ اور مردمک اور دیدۂ و دل اور نگاہ اور آہوں میں تشبیہ ہے یعنی پتلی میں نگاہیں نہیں ہیں۔ بلکہ سویدا میں آہیں ہیں۔

برشکالِ دیدۂ عاشق ہے دیکھا چاہیئے	۱	کھل گئی مانندِ گل سو جا سے دیوارِ چمن
اُلفتِ گل سے غلط ہے دعوئ وارستگی	۲	سرو ہے با وصفِ آزادی گرفتارِ چمن

(۱) "برشگال" (بارش) شاعرانہ مبالغہ نگاری ہے۔
(۲) "وارستگی" آزادی۔ سرو کی بھی صفت آزادی ہے۔ لیکن سرو باغوں ہی میں ہوا کرتا ہے۔ گویا وہ باوصفِ آزادی اُلفتِ گل کے باعث زندانِ خانۂ گلشن سے باہر نہیں نکل سکتا اور دعویٰ آزادی غلط ثابت ہوتا ہے۔

عشق تاثیر سے نومید نہیں	۱	جاں سپاری شجرِ بید نہیں
سلطنت دست بدست آئی ہے	۲	جامِ مے خاتمِ جمشید نہیں
ہے تجلی تری سامانِ وجود	۳	ذرہ بے پرتوِ خورشید نہیں
رازِ معشوق نہ رسوا ہو جائے	۴	ورنہ مر جانے میں کچھ بھید نہیں
گردشِ رنگِ طرب سے ڈر ہے	۵	غمِ محرومیٔ جاوید نہیں
کہتے ہیں جیتے ہیں اُمید پہ لوگ	۶	ہم کو جینے کی بھی اُمید نہیں
مے کشی کو نہ سمجھ بے حاصل	۷	بادہ غالبؔ عرقِ بید نہیں

(۱) "جاں سپاری" جان دینا۔ "شجرِ بید" بید کا درخت جو برگ و ثمر سے محروم پیدا ہوتا ہے۔ یعنی عشق تاثیر سے مایوس نہیں ہے چونکہ عشق میں جان بھی جاتی ہے اور جان جیسی شے دینا بے نتیجہ و بے ثمر نہیں ہو سکتا۔ جیسا کہ شجرِ بید۔
(۲) "دست بدست" ہاتھوں ہاتھ۔ یعنی یکے بعد دیگرے۔ خاتمِ جمشید جمشید کی انگوٹھی۔ یہاں مقصود یہ ہے کہ جامِ شراب سلطنت ہے یہ ہاتھوں ہاتھ جمشید سے ہم تک پہنچا ہے لیکن جامِ انگشتری جمشید نہیں کہ اُسی کا نام کندہ تھا اسی کے ہاتھ میں رہی اور کسی کو دستیاب نہ ہو سکی۔ اگر وہ بھی جام کی طرح

سلطنت ہوتی تو متوارث ہوتی رہتی۔

(۳) "تجلی" پرتو جمال" عکس نور" سامان وجود" باعث تکوین' وجہ تخلیق۔ آفتاب کے مقابلہ میں جس ذرّہ کا تذکرہ ہوا کرتا ہے وہ وہ ذرّہ ہوتا ہے جو آفتاب سے اکتساب نور کر کے خود منوّر ہو چکا ہو ورنہ آفتاب کے ساتھ عام ذرات خاک وریگ کا کبھی تذکرہ نہیں ہوتا۔ مطلب یہی ہے کہ جس طرح ذرّہ بے پرتو خورشید نہیں ہوتا اسی طرح یہ ظہور کائنات وشہود عالم خلق بغیر تیرے نور جمال کے کائنات وجود کے حیثیت نہیں رکھتے۔ گویا یہ خود تیری تجلی کے سامان ہیں۔ یا معمل اور محل ہیں۔

(۴) مرجانے میں کوئی راز دوسرا تو ہے نہیں خیال یہ ہے کہ لوگ کہیں گے اس کے عشق میں مرگیا اور یہ اس کی رسوائی کا باعث ہوگا۔

(۵) گردش" انقلاب" رنگ طرب" حال مسرت وعیش مجبوری ومحرومی کا علم ویقین ہونے کے بعد نہ کوئی تمنا ہوسکتی ہے اور نہ کوئی مصیبت باقی رہتی ہے جس میں مبتلا ہونے کا اندیشہ وخوف ہو۔ لیکن مسرت وعیش کی حالت میں ہر وقت خوف رہتا ہے کہ کہیں یہ زمانہ انقلاب پذیر نہ ہوجائے۔

(۷) یعنی عرق بید میں نشاط ومسرت نہیں ہوتا اور مے میں ہوتا ہے۔

جہاں تیرا نقش قدم دیکھتے ہیں	۱	خیاباں خیاباں ارم دیکھتے ہیں
دل آشفتگاں خال کنج دہن کے	۲	سویدا میں سیر عدم دیکھتے ہیں

۳ تیرے سروقامت سے اک قدِ آدم
قیامت کے فتنے کو کم دیکھتے ہیں

۴ تماشا کر اے محوِ آئینہ داری
تجھے کس تمنا سے ہم دیکھتے ہیں

۵ سراغِ تفِ نالہ لے داغِ دل سے
کہ شب رو کا نقشِ قدم دیکھتے ہیں

۶ بنا کر فقیروں کا ہم بھیس غالب
تماشائے اہلِ کرم دیکھتے ہیں

(۱) "خیاباں" با غنچہ تکرار لفظی سے قدم قدم پر خیابانِ ارم مترشح ہے۔ معشوق کی نقش قدم کی تشبیہ گل و گلزار سے عام ہے۔

(۲) "دل آشفتگاں" پریشان دلانِ عشق "خال" تل۔ "کنج دہن" گوشہ دہن مراد ہے۔ سویدا (نقطۂ قلب) اور خال میں تشبیہ ہے۔ سویدائے قلب وہ نقطہ ہے جہاں انوار باطنی پرتو افگن ہوتے ہیں اور یہی نقطہ تماشائے معرفت کے لئے بصیرت ہے۔ دہنِ معشوق کو معدوم لکھتے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ دہن (چونکہ معدوم ہوتا ہے) کے خال میں ہم سیر عدم کرتے ہیں۔

(۳) ایک قدِ آدم کم ہونا گویا فتنہ قیامت تیرے قدموں میں پڑا ہوا ہے۔ طرزِ بیان بہت بدیع ہے۔

(۴) "تماشا کر" یعنی تماشا دیکھ۔ "محو آئینہ داری" آئینہ کے سامنے بناؤ سنگھار کرنے میں محو۔ یعنی اے بناؤ سنگھار میں محو ہو جانے والے ذرا ادھر دیکھ کہ ہم تجھے کس تمنا و شوق سے دیکھ رہے ہیں گویا تیرا بناؤ سنگھار کامیاب ہے کہ شوق و پسندیدگی کی نظریں

پڑ رہی ہیں ـــــ یا جس قدر تو آئینہ کے سامنے بناؤ سنگھار کرنے میں محو ہے اُسی قدر ہم تیرے جلوے سے متحیر ہیں۔

(۵) "سُراغ" پتہ۔ نشان "تفِ نالہ" نالہ کا نشانِ سوز یا وہ گرمی جو داغ ڈال دینے والی ہو "شب رو" مسافرِ شب۔ گرمی کے موسم میں اکثر مسافر رات کو سفر کرتے ہیں۔ اور نالے بھی رات ہی کو کھینچے جاتے ہیں یعنی نالہ ہائے شبِ ہجر کی گرمی کا داغِ دل سے پتہ چلا جس طرح رات میں سفر کر جانے والے مُسافر کا سُراغ نقشِ قدم سے ملتا ہے۔ گویا داغِ دل نالۂ شب رَو کا نقشِ قدم ہے۔

ملتی ہے خوئے یار سے نار التہاب میں
(۱)
کافر ہوں گر نہ ملتی ہو راحت عذاب میں

کب سے ہوں کیا بتاؤں جہانِ خراب میں
(۲)
شب ہائے ہجر کو بھی رکھوں گر حساب میں

تا پھر نہ انتظار میں نیند آئے عمر بھر
(۳)
آنے کا عہد کر گئے آئے جو خواب میں

قاصد کے آتے آتے خط اک اور لکھ رکھوں
(۴)
مَیں جانتا ہوں جو وہ لکھیں گے جواب میں

مجھ تک کب اُن کی بزم میں آتا تھا دَورِ جام
(۵)
ساقی نے کچھ ملا نہ دیا ہو شراب میں

جو مُنکرِ وفا ہو فریب اُس پہ کیا چلے
(۶)
کیوں بدگماں ہوں دوست سے دشمن کے باب میں

میں مضطرب ہوں وصل میں خوفِ رقیب سے
(۷)
ڈالا ہے تم کو وہم نے کس پیچ و تاب میں

میں اور خطِ وصل خدا ساز بات ہے
(۸)
جاں نذر دینی بھول گیا اضطراب میں

ہے تیوری چڑھی ہوئی اندر نقاب کے
(۹)
ہے اِک شکن پڑی ہوئی طرفِ نقاب میں

لاکھوں لگاؤ ایک چرانا نگاہ کا
(۱۰)
لاکھوں بناؤ ایک بگڑنا عتاب میں

وہ نالہ دل میں خس کے برابر جگہ نہ پائے
(۱۱)
جس نالے سے شگاف پڑے آفتاب میں

وہ سحر مدعا طلبی میں نہ کام آئے
(۱۲)
جس سحر سے سفینہ رواں ہو سراب میں

غالبؔ چھٹی شراب پر اب بھی کبھی کبھی
(۱۳)
پیتا ہوں روزِ ابر و شبِ ماہتاب میں

(۱) "نار" آگ۔ "التہاب" سوزش یعنی دوست کی آتش مزاجی سے آگ بھی جلتی جلتی ہے۔ اِس لئے عذابِ دوزخ سے اگر لذت و راحت حاصل نہ کروں تو کافر عشق ہوں۔

(۲) شعراء و عشاق کے یہاں ہجر کی مدت برسوں کی ہوتی ہے اگر شبِ ہجر کا حساب کیا جائے تو ایک ایک رات کئی سو برس کی ہوگی اور یہ اندازہ مشکل ہو جائے گا کہ "جہانِ خراب" (دنیا) میں آتے ہوئے کتنی مدت ہوئی۔

(۳) یعنی خواب میں آکر اس لئے آنے کا وعدہ کر گئے کہ انتظار میں عمر بھر نیند نہ آئے اُن کی یہ کیسی شوخی ہے اور عاشق کی کتنی سادگی ہے کہ خواب کے وعدہ پر سچ مچ عمر بھر انتظار میں جاگنے پر تیار ہے۔

(۴) یعنی ہمارے سوالات کا اپنی عادت کے مطابق وہ جو جواب دیں گے معلوم ہے اِس لئے ایک خط اور اُن کے جواب میں لکھ رکھوں۔

(۵) یعنی آج مجھے خلافِ عادت جام دیا جا رہا ہے ساقی نے کچھ مِلا تو نہیں دیا۔

(۶) یعنی معشوق سے بدگمانی عبث ہے کہ اُس نے رقیب سے پیمانِ محبت کیا ہو کیونکہ وہ تو وفا ہی سے منکر ہے چہ جائیکہ جھوٹے اظہارِ عشق کے دھوکے میں آجائے۔

(۷) "وہم" خیال باطل۔ اور رقیب کے خیال کو عاشق خیال باطل ہی سے تعبیر کر سکتا ہے۔ مصرعین کے تقدیم و تاخیر سے شعر کے معنی صاف ہو جاتے ہیں یعنی تم کو وہم نے خدا جانے کس اُلجھن میں ڈال دیا ہے مجھے تمہاری خاموشی دیکھ کر بے چینی ہے اور یہ خوف ہوتا ہے کہ کہیں رقیب کا خیال تو تمہارے دل میں نہیں ہے۔

(۸) "میں اور حظِّ وصل" بندش مقام تعجب کی ہے یعنی بھلا مجھے اور ایسی کیفیت میسّر آجائے۔ "خدا ساز" محاورہ ہے ایسا امر جس کی ظاہر میں کوئی توقع نہ ہو محض غیب سے نا معلوم

اسباب کی بناء پر واقع ہو جائے۔ اور اسی کثرتِ تعجب کی وجہ سے اور یک لخت یہ لطف میسّر آجانے سے مجھ میں اس قدر اضطراب ہوا کہ جان نذر نہ کر سکا۔ ورنہ موقع تو جان دینے کا تھا۔

(۹) "طرفِ نقاب" گوشۂ نقاب یعنی نقاب کے ایک گوشہ میں جو شکن پڑ گئی ہے غالباً نقاب کے اندر اُن کے تیور پر بل ہے۔

(۱۰) اِس شعر کی خوبی حدِ بیان سے باہر ہے اور ان اداؤں کے نظارہ ہی سے محسوس ہو سکتی ہے۔ کیونکہ بیگانوں سے نگاہ نہیں چُرایا کرتے اور غیروں سے اظہار برہمی نہیں ہوا کرتا۔

(۱۱) شگاف اور رخش کی تشبیہ ہے۔ اور رخش کے برابر جگہ نہ پانا محاورہ ہے۔

(۱۲) "سحر" استعارہ ہے عشق سے "سفینہ" کشتی "سراب" ریگِ رواں جس پر پانی کا دھوکا ہوتا ہو۔ یا سحر سے محبوب کی قدرتِ تام مُراد ہے کہ باوجود اس قدرت کے کہ کائنات کے ذرّہ ذرّہ پر محبوب کا کرشمہ حکمرانی کرتا ہے، ہمارا مقصد پورا کرنے میں اُس کی ساری کارسازی بے کار ثابت ہو رہی ہے۔

کل کیلئے کر آج نہ خسّت شراب میں	۱	یہ سوءِ ظن ہے ساقیِ کوثر کے باب میں
ہیں آج کیوں ذلیل کہ کل تک تھی پسند	۲	گستاخیِ فرشتہ ہماری جناب میں
جاں کیوں نکلنے لگتی ہے تن سے دمِ سماع	۳	گر وہ صدا سمائی ہے چنگ و رباب میں
رو میں ہے رخشِ عمر کہاں دیکھئے تھمے	۴	نے ہاتھ باگ پر ہے نہ پا ہے رکاب میں
اتنا ہی مجھ کو اپنی حقیقت سے بُعد ہے	۵	جتنا کہ وہمِ غیر سے ہوں پیچ و تاب میں

اصل شہود و شاہد و مشہود ایک ہے	۶	حیراں ہوں پھر مشاہدہ ہے کس حساب میں
ہے مشتمل نمودِ صُوَر پر وجودِ بحر	۷	یاں کیا دھرا ہے قطرہ و موج و حباب میں
شرم اک ادائے ناز ہے اپنے ہی سے سہی	۸	ہیں کتنے بے حجاب کہ ہیں یُوں حجاب میں
آرائشِ جمال سے فارغ نہیں ہنوز	۹	پیشِ نظر ہے آئینہ دائم نقاب میں
ہے غیبِ غیب جس کو سمجھتے ہیں ہم شہود	۱۰	ہیں خواب میں ہنوز جو جاگے ہیں خواب میں
۱۱	غالب ندیمِ دوست سے آتی ہے بوئے دوست مشغولِ حق ہوں بندگیِ بوتراب میں	

(۱) شعر میں "کل" ذو معنی ہے۔ ایک تو آنے والی کل۔ دُوسرے فردائے قیامت۔ پھر اگر ہم آج مر گئے تو کل ہی ہماری قیامت ہے۔ یعنی شراب میں خِسّت و بخل نہ کر اور کل کے لئے باقی نہ رکھ۔ کیونکہ کل تک جینے ہی کی کیا اُمید۔ کل کی فکر کرنا ساقیِ کوثر کی شان میں سوئے ظنی و گستاخی ہے۔ کیونکہ "کل" شراب عطا کرنے کا منصب صرف اُسی ساقیؑ عالی جناب کو ہے۔

(۲) "کل" کا اشارہ یومِ تخلیقِ آدم کی جانب ہے جب فرشتوں سے جنابِ باری نے سجدہ آدم کا حکم دیا تھا وَاِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلٰٓئِكَةِ اِنِّیْ جَاعِلٌ فِی الْاَرْضِ خَلِیْفَةً قَالُوْٓا اَتَجْعَلُ فِیْهَا مَنْ یُّفْسِدُ فِیْهَا وَیَسْفِكُ الدِّمَآءَ وَنَحْنُ نُسَبِّحُ بِحَمْدِكَ وَنُقَدِّسُ لَكَ۔ قَالَ اِنِّیْٓ اَعْلَمُ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ ٥ ارشاد فرمایا کہ ہم زمین پر آدم کو اپنا خلیفہ بنانے والے ہیں تو انہوں نے عرض کیا کہ کیا تو ایسوں کو خلیفہ بناتا ہے جو زمین میں فساد پھیلائیں گے اور خونریزیاں کرینگے

اور ہم تو تیری حمد کی تسبیح و تقدیس کرتے ہیں (گویا ہم مستحق خلافت ہیں) تو ہماری حمایت میں ارشاد ہوا کہ ہم خوب جانتے ہیں تم نہیں جانتے۔ یعنی انسان کے متعلق فرشتوں نے جو حجت پیش کی تھی اس سے ان کی زبان بندی کردی گئی، اور خلافت ارضی کی قابلیت ہم ہی میں ثابت رہی۔ پھر آج کیوں ذلیل ہیں۔

(۳) "دم سماع" گانا یا ساز سننے کے وقت "وہ" کا اشارہ معشوق حقیقی کی جانب ہے۔ "چنگ و رباب" باجوں کے نام ہیں یعنی دم سماع جو جان سی نکلی جاتی ہے یہ کیا بات ہے۔ اگر چنگ و رباب میں معشوق کی آواز سمائی ہوئی ہے تو وہ صدا جانفزا ہونی چاہیئے۔ نہ کہ جان گداز۔

(۴) "رخش" گھوڑا۔ "رو میں ہے" سرگرم رفتار ہے۔ یعنی جان پر کوئی اختیار نہیں نہ معلوم کس وقت نکل جائے۔

(۵) یہ ایک اصول تصوف۔ ہے کہ غیریت اور کثرت مدنظر رکھنے سے توحید حاصل نہیں ہوتی۔ اور اپنی حقیقت جو کہ وحدت ہے توحید سے بعید ہو جاتی ہے پس ان تمام مظاہر میں جن کو کثرت سے تعبیر کیا جاتا ہے اپنی ہستی بھی شامل کر کے ایک ہی عینیت کا مشاہدہ کرنا چاہیئے۔ یہی شعر کا مطلب ہے۔ کہ جس قدر غیریت اور غیر سے مجھے وابستگی ہے اتنی ہی اپنی حقیقت سے دوری ہے۔

(۶) "شہود" "شاہد" "مشہود" یہ سب تصوف کی اصطلاحیں ہیں۔

شہودِ عالم وجود و ظہور اور یہی عالمِ شہود، شاہد یعنی دیکھنے والے کے مشاہدے سے مشہود ہوتا ہے، نظر آتا ہے تو گویا شہود و مشہود اور شاہد تو ایک ہیں لیکن مشاہدہ وہ شے جس سے شاہد کو شہود و مشہود ہوتا ہے یعنی وہ قوتِ بصر کیا ہے۔ ظاہر ہے کہ ہمہ اوست۔

(۷) "مشتمل" شامل "صور" صورتیں اور شکلیں یعنی وجودِ دریا کا ظہور صورتوں اور شکلوں کی بنا پر ہوتا ہے۔ قطرے سے موج اور حباب دریا کی مختلف شکلیں ہیں جو دریا سے علیحدہ وجود و ہستی نہیں رکھتیں درآں حالیکہ دریا کی نمود انہیں اشکال پر منحصر ہے۔ اگر دریا میں روانی نہ ہو۔ موجیں نہ اٹھیں تو ایک سطحِ ساکن کی طرح دریا کی ہستی تمام تر رہے۔ اسی طرح یہ کائنات اور یہ عالمِ صور و اشکال خالقِ حقیقی کے وجود کے مظاہر ہیں۔

(۸) شرم کو ادائے ناز یا ایک اندازِ تمکنت کہا ہے۔ اور کسی اندازِ تمکنت و ناز کے لئے بیباکی اور بے حجابی ضروری ہے گویا یہ شرم خود بے حجابی ہے "اپنے ہی سے سہی" یعنی خود بخود۔ آپ ہی آپ۔ خود اپنے آپ سے۔ شعر میں شاعرانہ انداز میں منصوفانہ نتیجہ نکالا گیا ہے۔ یعنی شرم اداۓ ناز ہے اس لئے بے حجابی ہے۔ گویا اُس جمالِ حقیقت کا ظہور، خفا اور خفا ظہور ہے۔

(۹) "آرایشِ جمال" حسن کا بناؤ سنگھار۔ یہ عالمِ خلق و دنیا صفت خالقیت کا مظہر ہے۔ گویا اس کی خالقیت اُس کے جمالِ صفت

کا آئینہ ہے۔ لیکن یہ کائنات مخلوقات خود اس کے جمالِ ذات کے لئے حجاب و نقاب بھی ہے۔ اور چونکہ اس کی صفت و قدرت خالقیت پر کبھی تعطل وارد نہیں ہوتا۔ اس لئے وہ بنانے اور سنوارنے سے فارغ نہیں ہو سکتا۔ گویا حجاب کائنات و مخلوقات کے اندر آئینۂ خالقیت لئے ہوئے وہ شاہدِ حقیقی آرائشِ ذات میں مصروف ہے۔

(۱۰) "غیبِ غیب" کی ترکیب تصوف کی اصطلاح غیب الغیب سے ماخوذ ہے۔ اور یہ ذات الٰہی کی صفت یا مرتبہ ہے۔ اس دنیا کو عالمِ شہود کہتے ہیں۔ اور شہود بھی اس کی ایک صفت یا مرتبہ ہے گویا ظہورِ ذات کا دوسرا نام شہود ہے۔ لیکن اس ظہور سے کنہِ ذات پر اور خفا وارد ہوتا ہے۔ اس لئے غالب نے بکمال بلاغت و دقیقہ رسی مرتبۂ ظہور کو غیب الغیب سے تعبیر و ثابت کیا ہے۔ اور جس کی نہایت بدیہہ تمثیل اس طرح کی ہے کہ جو لوگ خواب میں بیداری کا خواب دیکھتے ہیں وہ بیدار نہیں بلکہ خواب میں خواب دیکھتے ہیں۔

(۱۱) "نایم" مقرب۔ "بوتراب" حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی کنیت ہے یعنی میں حضرت علی کی پرستش سے خدا ہی کی عبادت کرتا ہوں کیونکہ مقربان دوست سے دوست ہی کی بو آتی ہے۔

حیراں ہوں دل کو روؤں کہ پیٹوں جگر کو میں (۱)
مقدور ہو تو ساتھ رکھوں نوحہ گر کو میں

(۲) چھوڑا نہ رشک نے کہ ترے گھر کا نام لوں

ہر اک سے پوچھتا ہوں کہ جاؤں کدھر کو میں

جانا پڑا رقیب کے در پر ہزار بار
(۳)
اے کاش جانتا نہ ترے رہ گزر کو میں

ہے کیا جو کس کے باندھیے میری بلا ڈرے
(۴)
کیا جانتا نہیں ہوں تمہاری کمر کو میں

لو وہ بھی کہتے ہیں کہ یہ بے ننگ و نام ہے
(۵)
یہ جانتا اگر تو لٹاتا نہ گھر کو میں

چلتا ہوں تھوڑی دور ہر اک تیز رو کے ساتھ
(۶)
پہچانتا نہیں ہوں ابھی راہبر کو میں

خواہش کیا احمقوں نے پرستش دیا قرار
(۷)
کیا پوجتا ہوں اس بتِ بیداد گر کو میں

پھر بے خودی میں بھول گیا راہِ کوئے یار
(۸)
جاتا وگرنہ ایک دن اپنی خبر کو میں

اپنے پہ کر رہا ہوں قیاس اہلِ دہر کا
(۹)
سمجھا ہوں دل پذیر متاعِ ہنر کو میں

غالب خدا کرے کہ سوارِ سمندِ ناز
دیکھوں علی بہادرِ عالی گہر کو میں

---

(۱) یعنی میں دل یا جگر دونوں میں سے کسی ایک ہی کا ماتم کر سکتا ہوں۔

(۲) یعنی رشک سے تو یہ گوارا ہوا نہیں کہ تیرے گھر کا نام لوں، اور تلاش تیرے گھر کی منظور تھی، اسی لیے تلاش میں ہر ایک سے یہ پوچھتا

تھا کہ کدھر جاؤں۔

(۳) تیری رہگذر تو در رقیب کی جانب سے تھی۔ اور مجھے معلوم ہوگیا تھا اس لئے ہزاروں مرتبہ تیرے اشتیاق میں رقیب کے در تک جانا پڑا۔ کاش تیری رہگذر معلوم نہ ہوتی تو در رقیب پر جانا نہ پڑتا۔

(۴) یعنی آپ جو کمر کستے ہیں۔ یہ محض قتل کی دھمکی ہی دھمکی ہے۔ میں کیا تمہاری کمر جانتا نہیں ہوں کہ (یعنی معشوق کی کمر ہوتی ہی نہیں) یہ کمر کسنا جھوٹ موٹ کا ہے۔ پھر میں کیوں ڈروں۔

(۵) یعنی میں تو یہ سمجھتا کہ وہ میری وفاداری اور قربانیوں کی قدر کریں گے لیکن وہ بھی مجھے بے نام ونگ کہنے لگے۔ اگر یہ خبر ہوتی تو گھر بار کیوں لٹا دیتا۔

(۶) یعنی رہبر کی کوئی شناخت تو ہے نہیں۔ تیز روی باعث ترغیب تھی اور ہر تیز رو کے ساتھ ہولیتا تھا۔ بعد میں معلوم ہوتا تھا کہ یہ رہبر اور اپنی منزل مقصود کا خضر راہ نہیں ہے۔ یعنی تیز روی دلیل رہبری ہے۔

(۷) یعنی بے خودی و عالم خود فراموشی اس قدر بڑھ گئی کہ کوئے یار کا پتہ یاد نہ رہا۔ اگر بے خودی نہ ہوتی تو اپنے آپ کی تلاش میں میں ایک دن وہاں جاتا۔ کیونکہ میں وہیں جاکر کھویا سا جاتا ہوں۔ یا یہ کہ خود میری ہستی کوئے یار کا پتہ ہے۔ لہذا اب چونکہ کوئے یار کا پتہ نہیں رہا۔ میں اپنے سے بھی بے خبر ہوں لہذا یہی میری بے خودی ہے۔

(۹) "دلپذیر" پسندیدہ اور قابلِ قدر۔ یعنی میں جنسِ ہنر سے متوقع ہوں کہ اسی میں مقبولیت عامہ۔ گویا اہلِ دنیا کو بھی اپنے جیسا سمجھتا ہوں۔ (دوراں حالے کہ معاملہ اس کے برعکس ہے)

۱	ذکر میرا بہ بدی بھی اسے منظور نہیں	غیر کی بات بگڑ جائے تو کچھ دور نہیں
۲	وعدۂ سیرِ گلستاں ہے خوشا طالعِ شوق	مژدۂ قتل مقدّر ہے جو مذکور نہیں
۳	شاہدِ ہستیٔ مطلق کی کمر ہے عالم	لوگ کہتے ہیں کہ ہے پر ہمیں منظور نہیں
۴	قطرہ اپنا بھی حقیقت میں ہے دریا لیکن	ہم کو تقلیدِ تنک ظرفیٔ منصور نہیں
۵	حسرت اے ذوقِ خرابی کہ وہ طاقت نہ رہی	عشقِ پر عربدہ کی گوں تنِ رنجور نہیں
۶	میں تو کہتا ہوں کہ ہم لینگے قیامت میں تمہیں	کس رعونت سے وہ کہتے ہیں کہ ہم حور نہیں
۷	ظلم کر ظلم اگر لطف دریغ آتا ہو	تو تغافل میں کسی رنگ سے معذور نہیں
۸	صاف دُردی کشِ پیمانۂ جم ہیں ہم لوگ	وائے وہ بادہ کہ افشردۂ انگور نہیں
۹	ہوں ظہوری کے مقابل میں خفائی غالب میرے دعوے پہ یہ حجت ہے کہ مشہور نہیں	

(۱) یعنی غیر حسبِ دستور میری برائیاں اُن کے سامنے بیان کرتا ہے اور ان کو مجھ سے اس قدر نفرت ہے۔ کہ کسی عنوان سے میرا ذکر سننا منظور نہیں۔ کچھ عجب نہیں کہ رقیب سے بھی وہ ناراض ہو جائیں۔

(۲) "خوشا طالعِ شوق" شوق کی خوش قسمتی، یعنی انہوں نے سیرِ گلستاں کا وعدہ کیا۔ گویا مژدۂ قتل اس وعدہ میں مقدر ہے کیونکہ سوائے ارادۂ قتل اُن وہ سیرِ گلستاں میں میری ہمراہی کیوں پسند

کرنے لگے تھے۔ خوشا طالع شوق کہ آرزوئے قتل پوری ہونے والی ہے۔

(۳) "ہستی مطلق" وجود مطلق، معشوق حقیقی۔ منظور نہیں" یعنی نظر نہیں آتی۔ اس عجیب و غریب فلسفہ اور تصوف میں اُستاد نے شاعری کی روح پھونکی ہے۔ تصوف کا مسئلہ ہے کہ یہ عالم کون و خلق۔ عین ذات و وجود ہے۔ فلسفہ کہتا ہے کہ امکان وجود بین العدمین کا نام ہے۔ یعنی ممکن عدم سے آتا ہے۔ اور عدم کو چلا جائے گا۔ گویا معدوم ہو جائیگا۔ یہ عالم امکان بھی عدم سے ممکن ہوا ہے اور معدوم ہو جانے والا ہے۔ لیکن اگر فنا و عدم اس کی حقیقت ہے تو تصوف کا دعویٰ باطل ہو جاتا ہے۔ کہ عین وجود ذات یا ہمہ اوست یا وحدت الوجود کے لئے عدم لاحق ہوگا۔ غالب کی شاعری اس کا فیصلہ کرتی ہے۔ کہ یہ کائنات ممکن بھی ہے اور واجب بھی عین وجود بھی ہے۔ گویا یہ عالم معشوق حقیقی کی کمر ہے کہ ہے اور نہیں ہے۔ اور ہے تو ایسی ہی ہے۔ کیونکہ شعراء کے یہاں محبوب کی کمر بھی ایسا ہی معمہ ہے۔

(۴) "یعنی منصور کے آوازہ اناالحق جو توحید وجودی کے اصول پر مبنی تھا کے موافق ہم بھی وجود الٰہی سے ہی نسبت رکھتے ہیں۔ لیکن ہم تنگ ظرفی منصور کی تقلید کرنا نہیں چاہتے۔

(۵) عشق پر عربدہ "عشق جنگجو۔ گو ہیں" قابلیت و طاقت۔ تن رنجور۔ جسم بیمار و نزار یعنی اسے فرق بر بادی بخت حسرت و

افسوس ہے کہ عشق پر عربدہ کے قابل میرا جسم نزار نہیں ہے اور
اب وہ قوت مقابلہ اور برداشتِ ستم باقی نہیں۔

(۶) گویا وہ حور کو حور سے بڑھ چڑھ کر سمجھتے ہیں۔ اور پھر کیا معقول برجستہ اور شوخ جواب ہے۔ دوسرا مطلب یہ بھی ہے کہ حوریں معاوضہ طاعت و عبادت الٰہی ہیں اور یہاں خود او عاشق نمائی ہے۔

(۷) "لطف دریغ آتا ہو" لطف کرنے میں اگر دریغ ہے تو ظلم کیجئے۔ اور تغافل سے تو آپ کسی طرح معاف رہی نہیں۔ شہی کرو۔ کر وہ بھی ظلم ہے۔

(۸) "دُردی کش" تلچھٹ پینے والے۔ اور یہاں مقلد مراد ہے۔ "صاف" دُرد کے مقابلہ کا لفظ ہے۔ نیز تاکید و تصریح کے معنی میں آتا ہے "افشردۂ انگور" انگوروں سے نچوڑی ہوئی یا انگوری شراب۔ اُس شراب پر افسوس ظاہر کر کے جو انگوری نہ ہو اپنا مشرب ظاہر کیا ہے۔ کہ ہم بھی جمشید کی طرح انگوری شراب پیتے ہیں۔

(۹) "ظہوری" شاعر مشہور۔ اور لفظ ظہوری کے معنی ظاہر اور شہیر کے ہیں۔ اس کے مقابلہ کا لفظ خفائی (یعنی پوشیدہ وغیرہ نمایاں) ہے۔ مطلب ہے کہ میں اور ظہوری ہم مرتبہ ہیں۔ لیکن وہ چونکہ مشہور ہے اس لئے ظہوری ہے اور میں چونکہ گمنام ہوں اس لئے خفائی۔ اور دلیل تقابل یہ ہے کہ میں مشہور نہیں ہوں۔

نالہ جز حسنِ طلب اے ستم ایجاد نہیں	۱	ہے تقاضائے جفا شکوۂ بیداد نہیں
کم نہیں وہ بھی خرابی میں پہ وسعت معلوم	۲	دشت میں ہے مجھے وہ عیش کہ گھر یاد نہیں
عشق و مزدوریِ عشرت گہِ خسرو کیا خوب	۳	ہم کو تسلیم نکو نامیِ فرہاد نہیں
اہلِ بینش کو ہے طوفانِ حوادث مکتب	۴	لطمۂ موج کم از سیلیِ استاد نہیں
وائے محرومیِ تسلیم و بدا حالِ وفا	۵	جانتا ہے کہ ہمیں طاقتِ فریاد نہیں
رنگِ تمکینِ گل و لالہ پریشاں کیوں ہے	۶	گر چراغانِ سرِ رہگذرِ باد نہیں
سبدِ گل کے تلے بند کرے ہے گلچیں	۷	مژدہ اے مرغ کہ گلزار میں صیاد نہیں
نفی سے کرتی ہے اثبات تراوش گویا	۸	دی ہے جائے دہن اسکو دمِ ایجاد نہیں
کم نہیں جلوہ گری میں ترے کوچے سے بہشت	۹	یہی نقشہ ہے ولے اس قدر آباد نہیں

۱۰

کرتے کس منہ سے ہو غربت کی شکایت غالب
تم کو بے مہریِ یارانِ وطن یاد نہیں

(۱) یعنی اے ستمگر میرا نالہ شکوۂ جفا نہیں ہے بلکہ حسنِ طلب ہے اور جفا کا تقاضا ہے۔

(۲) یعنی گھر بھی اگرچہ صحرا سے ویرانی اور خرابی میں کم نہیں لیکن گھر کی وسعت ہی کیا تھی۔ اس لئے صحرا میں مجھے ایسی آسودگی ہے کہ گھر یاد نہیں آتا۔ اسی مضمون کا ایک شعر اس سے پہلے گذر چکا ہے۔

نقصاں نہیں جنوں میں بلا سے ہو گھر خراب
سو گز زمیں کے بدلے بیاباں گراں نہیں

(۳) "خسرو" فرہاد کا کامیاب رقیب۔ اس شعر میں محل سرائے خسرو و شیریں کی تعبیر سے تلمیح ہے کہ فرہاد کی شہرت ہمارے نزدیک مسلم نہیں۔ کجا عشق۔ کجا عشرتگاہ خسرو کی مزدوری۔

(۴) "اہلِ بینش" صاحبِ بصیرت۔ عقلاء "حوادث" آفاتِ ارضی و سماوی مراد ہیں "لطمہ" تھپڑ "موج" طوفان کی رعایت سے استعمال ہوا ہے "سیلی" تھپڑ۔ یعنی اہلِ عقل کے لئے طوفانِ مصائب بھی گویا مکتبِ عبرت و استقلال ہے۔ جس کی موجوں کے تھپیڑے استاد کی تادیب و تنبیہ کی مثل ہیں۔

(۵) "وائے" افسوس "پدا" کس قدر برا یعنی افسوس ہے تسلیم و رضا کی محرومی پر اور کس قدر برا حال ہے وفاداری کا کہ ہمارے ضبط سے وہ سمجھتا ہے کہ فریاد کرنے کی طاقت نہیں ہے۔

(۶) "تمکین" خود داری۔ اور یہاں مجموعۂ اوراقِ گل و لالہ مراد ہے اور اسی جمعیت برگ و بار کی مناسبت سے "پریشانی" کا لفظ استعمال ہوا ہے "سرِ رہگذر باد" ہوا کی گذرگاہ میں۔ "چراغاں" اور گل و لالہ کی تشبیہ ظاہر ہے۔ اور ہوا چراغ اور خزاں و بہار کے لئے مشترک ہے۔ یعنی اگر یہ پھول وغیرہ ہوا کی رہگذر کے چراغ نہیں ہیں تو گل و لالہ کا رنگ تمکین کیوں پریشاں ہے۔ یا بادِ خزاں سے اوراقِ گل و لالہ کیوں بکھرے پڑے ہیں۔

(۷) "سبدِ گل" پھولوں کی ٹوکری۔ یعنی گلچیں پھولوں کی ٹوکری کے نیچے بند کرتا ہے۔ اور پھولوں سے وصل کا موقع مل جاتا ہے۔ مژدہ اے بلبل کہ باغ میں صیاد نہیں ہے کہ شکار کر کے باغ سے لیجائے۔ اور مبتلائے دام و قفس کر کے پھول سے چھڑا دے۔

(۸) یعنی صانعِ ازل نے اس کو بجائے "دہن" کے لفظ "نہیں" دیدیا

ہے۔ تو گویا یہ نفی یعنی انکار اور نہیں ثابت کرتی ہے کہ معشوق کے دہن ہے کیونکہ اگر دہن نہ ہو تو نہیں کہاں سے نکلے۔

(۹) یعنی عشاق کا ایسا جمگھٹا وہاں نہیں ہے۔

دونوں جہان دیکے وہ سمجھے یہ خوش رہا	۱	یاں آ پڑی یہ شرم کہ تکرار کیا کریں
کیا شمع کے نہیں ہیں ہوا خواہ اہل بزم	۲	ہو غم ہی جانگداز تو غمخوار کیا کریں
تھک تھک کے ہر مقام پہ دو چار رہ گئے	۳	تیرا پتہ نہ پائیں تو ناچار کیا کریں

(۱) "دونوں جہان" دین و دنیا۔ وہ کا اشارہ خدا کی جانب ہے۔

(۲) یعنی اہل بزم تو چاہتے ہیں کہ شمع کو ثبات ہو۔ لیکن جلتے جلتے بالآخر وہ ختم ہو ہی جاتی ہے۔

(۳) گویا معرفت کی منزل مقصود تک رسائی میسر نہ آئی۔

ہو گئی ہے غیر کی شیریں بیانی کارگر		عشق کا اس کو گماں ہم بےزبانوں پر نہیں

(۱) یعنی غیر کی شیریں زبانی کا اثر ہے اور ہم کم گوئی کی وجہ سے محروم ہیں۔

قیامت ہے کہ سن لیلیٰ کا دشت قیس میں آنا
تعجب سے وہ بولا یوں بھی ہوتا ہے زمانے میں (۱)

دل نازک پہ اس کے رحم آتا ہے مجھے غالب
نہ کر سرگرم اس کافر کو الفت آزمانے میں (۲)

(۱) یعنی جذب عشق پر تعجب ہوا۔

(۲) یعنی اپنے جذب و کشش الفت سے اس کے دل نازک پر تکلیفات عشق و وفا عائد ہو جائیں گی۔ اس لئے اس کے دل پر رحم آتا ہے۔

دل لگا کر لگ گیا اُن کو بھی تنہا بیٹھنا
(۱)
بارے اپنی بیکسی کی ہم نے پائی داد یاں

ہیں زوال آمادہ اجزا آفرینش کے تمام
(۲)
مہرِ گردوں ہے چراغِ رہگذارِ باد یاں

(۱) یعنی اب معشوق کو بھی عشق ہوا ہے بشا ہے کہ ہماری بیکسی کی پوری داد ملی کہ خود بدولت بھی تنہا پسند ہو گئے ہیں۔

(۲) "زوال آمادہ" زوال پذیر۔ رُو بہ انحطاط۔ "اجزاء آفرینش" اجزا کائنات "چراغِ رہگذارِ باد" وہ چراغ جو کہ ہوا کے جھونکوں میں جل رہا ہو۔ موجودہ دور کے حکماء آفتاب کو مرکزِ کائنات مانتے ہیں اُن کے عقیدہ میں کرہ ارض اور کرہ ارض کی تمام موجودات کی بقا کا انحصار آفتاب کی حرارت و کشش اور نور وغیرہ پر ہے پھر یہ بھی عقیدہ ہے کہ آفتاب کی حرارت روز بروز کم ہوتی جاتی ہے غالب کا شاعرانہ تخیل اس جدید علمی تحقیق یعنی زوالِ حرارت آفتاب سے زوالِ اجزائے آفرینش پر استدلال کرتا ہے۔ اور علمی اعتبار سے دلیل ایسی راست اور صحیح ہے کہ موصوف کے شاعرانہ تخیل کو اعجاز و کرامت کے مرتبہ تک پہنچا دیتی ہے۔ یعنی اجزائے کائنات زوال پذیر ہیں۔ اور آفتاب بھی گویا ہوا کے جھونکوں میں رکھا ہوا چراغ ہے۔

یہ ہم جو ہجر میں دیوار و در کو دیکھتے ہیں	۱	کبھی صبا کو کبھی نامہ بر کو دیکھتے ہیں
وہ آئیں گھر میں ہمارے خدا کی قدرت ہے	۲	کبھی ہم ان کو کبھی اپنے گھر کو دیکھتے ہیں
نظر لگے نہ کہیں اُن کے دست و بازو کو	۳	یہ لوگ کیوں مرے زخمِ جگر کو دیکھتے ہیں

(۴) ترے جواہرِ طرفِ کلہ کو کیا دیکھیں
ہم اوجِ طالعِ لعل و گہر کو دیکھتے ہیں

(۱) صبا کے لئے دیوار اور نامہ بر کے لئے در۔
(۲) غیر معتو قدم آمد۔ خدا کی قدرت ہے اور مصرعۂ ثانی میں جمع اضداد پیرا اظہار تعجب ہے۔
(۳) یعنی زخم کے کاری ہونے پر اُن کے ہاتھ اور قوت کو نظر نہ لگ جائے۔
(۴) یعنی ہم جواہرات کو کب دیکھتے ہیں۔ ہم تو یہ دیکھ رہے ہیں کہ اُن کا نصیبہ ہے کہ تیرے سر تک پہنچ گئے۔

۱ شبِ فراق سے روزِ جزا زیاد نہیں — نہیں کہ مجھ کو قیامت کا اعتقاد نہیں
۲ بلا سے آج اگر دن کو ابر و باد نہیں — کوئی کہے کہ شبِ مہ میں کیا برائی ہے
۳ جو جاؤں واں سے کہیں کو، تو خیر باد نہیں — جو آؤں سامنے اُن کے تو مرحبا نہ کہیں
۴ کہ آج بزم میں کچھ فتنہ و فساد نہیں — کبھی جو یاد بھی آتا ہوں میں، تو کہتے ہیں
۵ گدائے کوچۂ میخانہ نامراد نہیں — علاوہ عید کے ملتی ہے اور دن بھی شراب
۶ دیا ہے ہم کو خدا نے وہ دل کہ شاد نہیں — جہاں میں ہو غم و شادی بہم ہمیں کیا کام

(۷) تم اُن کے وعدے کا ذکر اُن سے کیوں کرو غالب
یہ کیا کہ تم کہو اور وہ کہیں کہ یاد نہیں

(۱) یعنی میں جو شبِ فراق کی طوالت اور تکالیف بیان کرتا ہوں تو اُس کا یہ مطلب نہیں کہ قیامت کا منکر ہوں۔ لیکن ہاں شبِ فراق کے طول اور مصائب سے روزِ جزا کی طوالت اور پریشانی زیادہ نہیں۔

(۲) یعنی دن کو ہوا دابر نہ تھے۔ تو ظاہر ہے کہ چاندنی زیادہ صاف ہوگی۔ اس لئے مے کے لئے محض ابر و باد کا التزام صحیح نہیں شب ماہ بھی مےخوری کے لئے موزوں ہے۔

(۳) یعنی میرے آنے اور بزم میں رہنے نہ رہنے کی وہ کچھ پرواہ ہی نہیں کرتے۔

(۴) گویا مجھ کو کس بڑائی اور شوخی سے یاد کرتے ہیں۔

(۵) یعنی گر لے میخانہ عام دریوزہ گروں کی طرح نامراد نہیں ہے کہ خاص خاص ہی موقع پر کچھ ملے۔

(۶) یعنی دنیا میں باری باری کبھی غم کبھی خوشی تبدیلیاں ہوتی رہتی ہیں۔ لیکن ہمیں اس سے کیا فایدہ۔ ہمارے پاس تو وہی ایک دل محزوں ہے جسکو خوشی سے کوئی سروکار ہی نہیں۔

(۷) یہ تو ظاہر ہے کہ وعدہ خلافیاں ہوئیں لیکن اب اس کا ذکر ان سے عبث ہے۔ اس سے فائدہ ہی کیا۔ کہ وہ "یاد نہیں" کہکہ مکر جائیں تو یہ حجاب بھی باقی نہ رہے گا۔ پھر وہ اوّل تو وعدہ ہی نہ کرینگے اور کر بھی لیں گے تو دلیری اور بیباکی سے وعدہ خلافی کر گزریں گے۔

تیرے توسن کو صبا باندھتے ہیں	۱	ہم بھی مضمون کی ہوا باندھتے ہیں
آہ کا کس نے اثر دیکھا ہے	۲	ہم بھی اک اپنی ہوا باندھتے ہیں
تیری فرصت کے مقابل اے عمر	۳	برق کو پا بہ حنا باندھتے ہیں
قید ہستی سے رہائی معلوم!	۴	اشک کو بے سر و پا باندھتے ہیں
نشۂ رنگ سے ہے واشدِ گل	۵	مست، کب بندِ قبا باندھتے ہیں

غلطیہائے مضامیں مت پوچھ	۶	لوگ نالے کو رسا باندھتے ہیں		
اہلِ تدبیر کی واماندگیاں	۷	آبلوں پر بھی حنا باندھتے ہیں		
۸	سادہ پُرکار ہیں خوباں غالبؔ ہم سے پیمانِ وفا باندھتے ہیں			

(۱) شاعرانہ قافیہ پیمائی ہے "صبا باندھنا" اور ہوا باندھنے کا ثبوت ہے۔

(۲) یعنی یہ تو معلوم ہے کہ آہ میں اثر نہیں ہوتا۔ مگر معشوق پر ہوا باندھتے ہیں۔ کہ شاید وہ دھوکے میں آ جائے۔

(۳) "برق پا بہ حنا" یعنی جس کی سرعتِ رفتار تھوڑی دیر کے لئے موقوف ہو گئی ہو وہی حال وقفہ مدتِ عمر کا ہے۔

(۴) "قیدِ ہستی" مصائب و آلامِ زندگی سے استعارہ ہے۔ اور گریہ و اشک بھی لوازمِ رنج و غم سے ہیں "قید" اور باندھنے میں رعایتِ لفظی ہے "بے سروپا" جس کی ابتدا و انتہا اور جو انتقال و انقلاب کی گنجائش سے محروم ہو۔ یا عقدۂ لاینحل لیکن شعراء اشک کو بے سروپا لکھا کرتے ہیں۔ مطلب ہے کہ جس طرح اشک بے سروپا ہے اسی طرح قیدِ ہستی۔ مصائبِ زندگی جو اسبابِ اشک ریزی ہیں۔ وہ بھی بے سروپا اور غیر انقلاب پذیر ہونے چاہئیں۔ یا قیدِ ہستی بھی اشک بے سروپا کی طرح عقدۂ لاینحل ہے۔

(۵) "واشد" کھل جانا۔ گویا رنگ کے نشہ سے گریبانِ گل چاک ہو گیا ہے۔ کیونکہ مست بندِ قبا نہیں باندھا کرتے۔ یعنی رنگ، شوق وغیرہ کی شدّت باعثِ شگفتگی ہے۔

(۶) یعنی بھلا نالہ رسا کہاں ہوتا ہے۔ اس کو رسا یا ندھنا مضمون کی غلطی ہے۔

(۷) "درماندگیاں" مجبوریاں۔ یعنی اہلِ عقل کی مجبوری تو دیکھو اوّل تو آبلے خود چلنے سے مانع ہوتے ہیں۔ اُن پر حنا باندھنا ایک مانع رفتار اور اضافہ کر لیتے ہیں۔ جس سے چلنے کے لائق ہی نہیں رہتے۔ اہلِ جنوں کو دیکھو کہ اُن کے آبلوں کا علاج کانٹوں پر دوڑنا ہے۔ اور ذرا مجبور و پابند نہیں ہوتے۔

(۸) "سادہ" عقلی طور پر نشیب و فراز سے ناواقف "پرُکار" "چالاک و پرُ فریب" یعنی معشوق لوگ چالاکی تو کرتے ہیں لیکن عقلمندی اور ہوشیاری سے نہیں کرتے۔ کہ ہم سے عہد وفا کرتے ہیں اور دل میں یہ جانتے ہیں کہ ہم نے جھوٹ موٹ عہد کیا ہے۔ اور یہ سچ سمجھا ہے یا یہ کہ اس عہد کو پورا کون کرتا ہے۔ اور یہ نہیں سمجھتے کہ ہم خود ان کو بدعہد جانتے ہیں۔ یا اُن پر تقاضہ کرتے کرتے پیمانِ وفا کو پورا ہی کرا لیں گے۔

زمانہ سخت کم آزار ہے بجانِ اسد | | وگرنہ ہم تو توقع زیادہ رکھتے ہیں

(۱) یعنی ہم تو زمانہ کو اس سے بھی زیادہ مصائب و آلام کا مجموعہ سمجھتے ہیں۔

دائم پڑا ہوا ترے در پر نہیں ہوں میں | ۱ | خاک ایسی زندگی پہ کہ پتھر نہیں ہوں میں

کیوں گردشِ مدام سے گھبرا نہ جائے دل | ۲ | انسان ہوں پیالہ و ساغر نہیں ہوں میں

یارب زمانہ مجھ کو مٹاتا ہے کس لیے | ۳ | لوحِ جہاں پہ حرفِ مکرر نہیں ہوں میں

۴	حد چاہیے سزا میں عقوبت کے واسطے	آخر گنہگار ہوں کافر نہیں ہوں میں
۵	کس واسطے عزیز نہیں جانتے مجھے	لعل و زمرد و زر و گوہر نہیں ہوں میں
۶	رکھتے ہو تم قدم مری آنکھوں سے کیوں دریغ	رتبے میں مہر و ماہ سے کمتر نہیں ہوں میں
۷	کرتے ہو مجھ کو منع قدم بوس کس لئے	کیا آسمان کے بھی برابر نہیں ہوں میں

غالب وظیفہ خوار ہو، دو شاہ کو دعا
وہ دن گئے کہ کہتے تھے نوکر نہیں ہوں میں

(۱) یعنی کاش میں پتھر ہوتا تاکہ سنگِ آستانِ یار ہونے کی امید ہو جاتی۔

(۲) "گردش مدام" متواتر بدنصیبیوں کا ظہور اور گردش پیالہ و ساغر ہی کے لئے ہے۔ انسان کیوں نہ گھبرائے۔

(۳) "حرف مکرر" جو حرف غلطی سے دو مرتبہ تحریر میں آ گیا ہو جسکو مٹا دیا جاتا ہے۔ یعنی زمانہ مجھے عبث مٹاتا ہے۔

(۴ تا ۷) "حد" یعنی تعیّن و اندازہ شرعی اصطلاح میں سزا کو حد کہتے ہیں "عقوبت" تکلیف و عذاب۔ قرینہ سے معلوم ہوتا ہے کہ ان چاروں اشعار میں بارگاہِ رسالت سے تخاطب ہے۔

(۵) حضور سرورِ کائنات نے دولت و اسباب جاہ کی تحقیر فرمائی ہے تو اُستاد کہتے ہیں کہ میں لال و جواہر نہیں پھر مجھ پر کرم کیوں نہیں فرمایا جاتا۔

(۶) آنکھوں اور مہر و ماہ میں تشبیہ ہے۔ پھر انسان کے مرتبہ کی ترجیح شعر میں بیان کی گئی ہے۔

(۷) یعنی آپ نے آسمان کو تو شبِ معراج پامالی کی عزت بخشی تھی، پھر

آرزوئے قدم‌بوسی کیوں محروم ہے۔

(۸) بادشاہ کا اشارہ شاہ دہلی کی جانب ہے۔

---

(۱)
سب کہاں کچھ لالہ و گل میں نمایاں ہو گئیں
خاک میں کیا صورتیں ہوں گی کہ پنہاں ہو گئیں

(۲)
یاد تھیں ہم کو بھی رنگا رنگ، بزم آرائیاں
لیکن اب نقش و نگارِ طاقِ نسیاں ہو گئیں

(۳)
تھیں بنات النعش گردوں، دن کو پردے میں نہاں
شب کو ان کے جی میں کیا آئی کہ عریاں ہو گئیں

(۴)
قید میں یعقوبؑ نے لی گو نہ یوسفؑ کی خبر
لیکن آنکھیں روزنِ دیوارِ زنداں ہو گئیں

(۵)
سب رقیبوں سے ہوں ناخوش پر زنانِ مصر سے
ہے زلیخا خوش کہ محوِ ماہِ کنعاں ہو گئیں

(۶)
جوئے خوں آنکھوں سے بہنے دو کہ ہے شامِ فراق
میں یہ سمجھوں گا کہ شمعیں، دو فروزاں ہو گئیں

(۷)
ان پری زادوں سے لیں گے خلد میں ہم انتقام
قدرتِ حق سے یہی حوریں اگر واں ہو گئیں

(۸)
نیند اُس کی ہے دماغ اُس کا ہے راتیں اُسکی ہیں
تیری زلفیں جس کے بازو پر پریشاں ہو گئیں

(۹)
میں چمن میں کیا گیا، گویا دبستاں کھل گیا
بلبلیں سن کر مرے نالے غزل خواں ہو گئیں

(۱۰)
وہ نگاہیں کیوں ہوئی جاتی ہیں یارب دل کے پار

جو مری کوتاہیٔ قسمت سے مژگاں ہو گئیں

بسکہ روکا میں نے اور سینے میں ابھریں پے بہ پے
میری آہیں بخیۂ چاکِ گریباں ہو گئیں (۱۱)

واں گیا بھی میں، تو اُن کی گالیوں کا کیا جواب
یاد تھیں جتنی دعائیں صرفِ درباں ہو گئیں (۱۲)

جاں فزا ہے بادہ، جس کے ہاتھ میں جام آ گیا
سب لکیریں ہاتھ کی گویا رگِ جاں ہو گئیں (۱۳)

ہم موحد ہیں ہمارا کیش ہے ترکِ رسوم
ملتیں جب مٹ گئیں اجزائے ایماں ہو گئیں (۱۴)

رنج سے خوگر ہوا انساں تو مٹ جاتا ہے رنج
مشکلیں اتنی پڑیں مجھ پہ کہ آساں ہو گئیں (۱۵)

یوں ہی گر روتا رہا غالب، تو اے اہلِ جہاں
دیکھنا اِن بستیوں کو تم، کہ ویراں ہو گئیں (۱۶)

---

(۱) یعنی خدا جانے وہ کیسی صورتیں ہونگی جو خاک میں پنہاں ہوئیں اور سب کی سب لالہ و گل بنکر ظاہر ہوتی ہیں یا لالہ و گل حسینوں کی خاک سے پیدا ہوتے ہیں۔ خدا جانے وہ کیسے حسین ہونگے جن کی خاک ایسے گل کھلاتی ہے۔

(۲) "رنگا رنگ" "طرح طرح کی" "بزم آرائیاں" احباب کی صحبتیں اور عیش و نشاط کی محفلیں برپا کرنا۔ بزم کی رعایت سے نسیاں کو طاق سے ترکیب دیا اور رنگ کی رعایت سے نقش و نگار لکھا ہے یعنی کبھی ہم بھی محفل آرائی کرتے تھے مگر اب سب بھول گئے۔

(۳) "بنات النعش" شمال کی جانب سات ستارے ہیں جن کا یہ عربی نام ہے یعنی دن میں ستارے خدا جانے کہاں چلے جاتے ہیں اور رات کو نکل آتے ہیں۔ بنات النعش کی رعایت سے "عُریاں" خوب استعمال کیا ہے۔

(۴) "روزنِ دیوار" اور آنکھوں میں تشبیہ ہے۔ روزن خالی ہوتا ہے۔ آنکھوں کا روزنِ دیوار ہو جانا۔ آنکھوں کا بے نور ہو جانا مراد ہے۔

(۵) جس طرح محبت میں جوشِ رقابت اس درجہ ہوتا ہے۔ کہ دنیا کی ہر شے رقیب۔ مخل۔ اور باعثِ وہم و بدگمانی ہوتی ہے حتیٰ کہ خود بھی ناگوار ہو جاتی ہے بقول اُستاد ؎

دیکھنا قسمت کہ آپ اپنے پہ رشک آجائے ہے
میں اُسے دیکھوں بھلا کب مجھ سے دیکھا جائے ہے

اسی طرح یہ بھی جذبہ ہوتا ہے کہ محبوب کو کائنات کی ہر شے محبوب رکھتی ہو۔ اور یہ اس قدر ترقی کر جاتا ہے کہ خودی اور غیر بیچ میں ایک ہی جلوۂ حبیب ہو جاتی ہیں۔ پس زنانِ مصر کی محویت سے زلیخا کی خوشی ظاہر ہے۔

(۶) آنکھ اور شمع میں مشترک لَو ہے۔ خونفشانیٔ چشم اور نورِ شمع میں وجہ شبہ رنگ ہے۔ شمع سے موج در موج روشنی نکلنے اور آنکھوں سے خون بہنے میں روانی وجہ شبہ ہے۔

(۷) یعنی اُن کی جفاؤں کی تلافی کرالیں گے۔

(۸) (اس شعر کا مفہوم صاف اور خیال ذہن بش اعجاز ہے)۔

(۹) "دبستان" دبستاں۔ مکتب یا مدرسہ۔

(۱۰) نگاہوں کا مژگاں ہونا "نگاہوں کا اس قدر کوتاہ ہو جانا کہ مژگان سے باہر نہ گذریں اور یہ شرمیلی نگاہوں کے لئے استعارہ ہے پھر ان شرمیلی نگاہوں کو لفظی رعایت سے اپنی کوتاہیٔ قسمت پر محمول کیا ہے جس سے نگاہیں پیدا ہونے کی حسرت ٹپکتی ہے۔ اور کمال یہ ہے کہ اپنی بدقسمتی کے اظہار اور شرمیلی نگاہوں کے تذکرے کے ساتھ کس انداز بیساختہ سے اُن کی آتش فشانی کی ہے کہ دل کے پار کیوں ہو جاتی ہیں۔

(۱۱) آہوں کو رشتۂ (تاگے) سے تشبیہ دے کر ان کے اُبھرنے کو سینۂ چاک گریبان سے تمثیل کر دیا ہے۔

(۱۲) یعنی معشوق کی گالیوں کا جواب، تو صرف دعائیں ہو سکتی ہیں اور دعائیں جتنی تھیں وہ سب دربان کی خوشامد میں صرف ہو چکیں۔ اب اگر دربان نے اندر جانے کی اجازت بھی دے دی تو اُن کی گالیوں کا کیا جواب دوں گا۔

(۱۳) ہاتھ کی لکیروں کو رگوں سے تشبیہ دی ہے۔ اور شراب کے جانفزا ہونے کی رعایت سے رگ جان لکھا ہے۔

(۱۴) ترکِ رسوم اور عقائد متعددہ کے مٹنے سے ہی توحید کامل حاصل ہوتی ہے۔

(۱۵) یعنی متواتر حوادث اور پیہم مصائب سے تحمل کی عادت ہو جاتی ہے۔

(۱۶) (شعر اس لئے کہ یہ ہمیشہ طوفان خیز ہوتا ہے)

دیوانگی سے دوش پہ زنار بھی نہیں ۱ یعنی ہماری جیب میں اک تار بھی نہیں

دل کو نیاز حسرت دیدار کر چکے ۲ دیکھا تو ہم میں طاقت دیدار بھی نہیں

ملنا ترا اگر نہیں آساں تو سہل ہے ۳ دشوار تو یہی ہے کہ دشوار بھی نہیں

بے عشق عمر کٹ نہیں سکتی ہے اور یہاں ۴ طاقت بقدر لذت آزار بھی نہیں

شوریدگی کے ہاتھ سے سر ہے وبال دوش ۵ صحرا میں اے خدا کوئی دیوار بھی نہیں

گنجائش عداوت اغیار اک طرف ۶ یاں دل میں ضعف سے ہوس یار بھی نہیں

ڈر نالہائے زار سے میرے خدا کو مان ۷ آخر نوائے مرغ گرفتار بھی نہیں

دل میں ہے یار کی صف مژگاں سے روکشی ۸ حالانکہ طاقت خلش خار بھی نہیں

اس سادگی پہ کون نہ مر جائے اے خدا ۹ لڑتے ہیں اور ہاتھ میں تلوار بھی نہیں

۱۰ دیکھا اسد کو خلوت و جلوت میں بارہا
دیوانہ گر نہیں ہے تو ہشیار بھی نہیں

(۱) یعنی دیوانگی اور جوش جنوں میں گریبان و جیب کے پرزے اڑاتے اڑاتے رشتۂ بقدر زنار تک باقی ہے۔

(۲) یعنی دل تو حسرت و ارمان دید ہی میں صرف ہو گیا اب معلوم ہوا کہ ہم میں دیدار کی طاقت بھی نہیں۔

(۳) یعنی اگر تیرا ملنا آسان نہیں تو یہ امر مجھ پر آسان ہے۔ تیرا ملنا آسان نہیں نہ سہی۔ نہ ہم مل سکیں گے نہ کوئی اور مل سکیگا۔ مشکل تو یہ ہے کہ وہی تیرا ملنا دشوار بھی نہیں یعنی جس سے تو چاہتا ہے مل بھی سکتا ہے۔ ہجر کو تو ہم نے سہل سمجھ لیا تھا۔ مگر رشک کو اپنے اوپر آسان نہیں کر سکتے (از مکتوب غالب موسومہ قاضی عبدالجمیل صاحب بریلوی)

(۴) بے عشق بھی نہیں کٹتی۔ اور ستم کے مزے لینے کی طاقت بھی نہیں۔ سخت کشمکش ہے۔

(۵) ہیجان و اضطراب جنوں یا جوش دیوانگی سے سر دوش پر وبال ہو گیا ہے۔ خدایا صحرا میں کوئی دیوار بھی نہیں ہے۔ کہ پھوڑ ہی ڈالیں۔

(۶) رقیبوں کی عداوت کی گنجائش کجا۔ یہاں دل میں اشتیاقِ حبیب کی بھی تاب نہیں

(۷) یعنی میرے نالہ ہائے الم سے ڈر۔ یہ مرغانِ اسیر کے چہچہے نہیں ہیں۔ خدا کو مان وہ ستم زدوں کی فریاد سنتا ہے۔

(۸) "زدکشی" "مقابلہ"۔ یعنی طاقت تو ایک کانٹے کی خلش کی بھی نہیں اور مژگان کی صف کی صف سے مقابلہ۔

(۹) (کیا ادائے ناز ہے)

(۱۰) "خلوت" "تنہائی" "جلوت" "مصاحبت"۔

نہیں ہے زخم کوئی بخیہ کے درخور مرے تن میں
(۱)
ہوا ہے تارِ اشکِ یاس، رشتہ چشمِ سوزن میں

ہوئی ہے مانعِ ذوقِ تماشا خانہ ویرانی
(۲)
کفِ سیلاب باقی ہے برنگِ پنبہ روزن میں

ودیعت خانۂ بیدادِ کاوش ہائے مژگاں ہوں
(۳)
نگینِ نامِ شاہد ہے، مرے ہر قطرہ خوں تن میں

بیاں کس سے ہو ظلمت گستری میرے شبستاں کی
(۴)
شبِ مہ ہو جو رکھ دیں پنبہ دیواروں کے روزن میں

نکوہش مانعِ بے ربطیِ شورِ جنوں آئی (۵)
ہوا ہے خندۂ احباب بخیہ جیب و دامن میں

ہوئے اُس مہروش کے جلوۂ تمثال کے آگے (۶)
پرافشاں جوہر آئینہ میں مثلِ ذرہ روزن میں

نجانوں نیک ہوں یا بد ہوں پر صحبت مخالف ہے (۷)
جو گل ہوں تو ہوں گلخن میں جو خس ہوں تو ہوں گلشن میں

ہزاروں دل دیئے جوشِ جنونِ عشق نے مجھ کو (۸)
سیہ ہوکر سویدا ہو گیا ہر قطرہ خوں تن میں

اسد زندانیٔ تاثیرِ الفت ہائے خوباں ہوں (۹)
خمِ دستِ نوازش ہو گیا ہے طوق گردن میں

(۱) "تارِ اشک" آنسوؤں کے تار۔ تار و رشتہ (تاگا) میں تشبیہ ہے اور اسی مناسبت سے سوزن کے ساتھ زخم سوزن کہا ہے۔ یعنی میرے جسم میں کوئی زخم ٹانکوں کے قابل نہیں ہے گویا ناامیدی کے آنسوؤں کا تار چشمِ روزن کا ڈورا ہے یعنی زخم سلنے سے ناامیدی ہے۔

(۲) روزن سے بیرونی سیر و تماشا کر لیا کرتے ہیں "کفِ سیلاب" کے قرینہ سے معلوم ہوتا ہے کہ سیلِ گریہ باعثِ خانہ خرابی ہوا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ رونے سے گھر تو برباد ہوا ہی تھا وہ بربادی بیرونی تماشا اور سیر سے بھی باز رکھتی ہے کیونکہ کفِ سیلاب نے روزن کو بند کر دیا ہے جیسے روئی وغیرہ سے بند ہو جاتا ہے

(۳) "ودیعت خانہ" وہ مکان جس میں امانتیں رکھی ہوں "بیداد" ظلم

یہاں کاوش بیجا، مراد ہے "نگین" نگینہ "شاہد" معشوق۔ یعنی

ایک ایک قطرہ کا مجھے دینا پڑا حساب
خونِ جگر ودیعتِ مژگانِ یار تھا

(۴) "ظلمت گستری" چھائی ہوئی تاریکی "شبستان" ہیں شب کی رعایت ملحوظ رکھتے ہوئے سیاہ خانہ معنی ہو جاتے ہیں اسی مضمون کا شعر یہ ہے:۔

کیا کہوں تاریکیٔ زندانِ غم اندھیر ہے
پنبہ نورِ صبح سے کم جس کے روزن میں نہیں

(۵) "نکوہش" طنز و ملامت۔ "بے ربطی" بے ترتیبی۔ یعنی شورش جنوں کی بے ربطی کے لئے احباب کی ملامت مانع ہوئی اور اُن کا خندۂ ملامت گویا بخیۂ جیب و دامن ہو گیا۔

(۶) "مہروش" آفتاب جمال "تمثال" عکس مراد ہے "پر افشاں" پر تولنا۔ "نازگی" اس مہروش کے جمال سے آئینہ میں جوہر مائل پرواز ہیں جس طرح شعاع آفتاب سے ذرے۔

(۷) یعنی اپنے متعلق اچھائی اور برائی کا ثبوت تو نہیں دیا جاتا تاہم گردو پیش اور صحبت مخالفت ہے۔ اگر گل ہوں تو گلخن میں ہوں اور اگر تنکا ہوں تو گلستاں میں ہوں۔

(۸) یعنی جنونِ عشق کے جوش و گرمی سے ہر قطرہ خون سیاہ ہو کر سویدا کے شکل ہو گیا ہے۔ گویا ہزاروں سویدائے دل بن گئے ہیں۔

(۹) "زندانی" قیدی۔ گرفتار۔ "خم دستِ نوازش" گلے میں باہیں مراد ہیں۔ اور ان ہاتھوں کی طوق سے تشبیہ دے کر زندانی الفتِ خوباں

ہونے کا ثبوت دیا ہے۔

مرے جہان کے اپنی نظر میں خاک نہیں	۱	سوائے خونِ جگر، سو جگر میں خاک نہیں
مگر غبار ہوئے پر ہوا اُڑا لے جائے	۲	وگرنہ تاب و تواں بال و پر میں خاک نہیں
یہ کس بہشت شمائل کی آمد آمد ہے	۳	کہ غیرِ جلوۂ گل رہ گزر میں خاک نہیں
بھلا اُسے نہ سہی کچھ مجھی کو رحم آتا	۴	اثر مرے نفسِ بے اثر میں خاک نہیں
خیالِ جلوۂ گل سے خراب ہیں مے کش	۵	شراب خانہ کی دیوار و در میں خاک نہیں
ہوا ہوں عشق کی غارتگری سے شرمندہ	۶	سوائے حسرتِ تعمیر گھر میں خاک نہیں

۷

ہمارے شعر ہیں اب صرف دل لگی کے اسدؔ
کھلا کہ فائدہ عرض و ہنر میں خاک نہیں

(۱) مرے کے لفظ سے "سوائے خونِ جگر" کا مطلب ادا ہو جاتا ہے کہ سوائے خونِ جگر کھانے کے جگر میں خاک نہیں۔

(۲) یعنی مرنے کے بعد خاک کو شاید ہوا اُڑا لے جائے، ہمیں تو طاقتِ پرواز سے نہیں۔

(۳) "بہشت شمائل" کی ترکیب نہایت اعلیٰ اور پُر کیفیت ہے۔ یعنی راہ میں صرف پرتو جمال ہے، خاک باقی نہیں۔

(۴) یعنی معشوق کو نہ سہی ہمیں ہی آہوں پر تاثیر پیدا کر کے اپنے اوپر رحم کرتا۔

(۵) "خراب" مے اور میکشی کے ساتھ اس لفظ کے معنی مستی و نشاط ہوتے ہیں۔ یعنی خیالِ جلوۂ گل سے نشاط ہے ورنہ میخانہ کی در و دیوار میں کیا رکھا ہے۔ "خراب" "دیوار و در" اور "خاک" رعایاتِ لفظی ہیں۔

(۶) یعنی گھر میں سوائے حسرت و تعمیر کے اور کچھ باقی نہیں یہی شرمندگی ہے کہ عشق کی بربادی کے لئے کچھ باقی نہیں۔

(۷) "عرض ہنر" اظہار ہنر۔ سخن سنجی۔ یعنی لوگ کمال کا مضحکہ کرتے ہیں بھلا ہنر سے فائدہ ہی کیا۔

دل ہی تو ہے نہ سنگ و خشت درد سے بھر نہ آئے کیوں
(۱)
روئیں گے ہم ہزار بار کوئی ہمیں ستائے کیوں

دیر نہیں حرم نہیں، در نہیں آستاں نہیں
(۲)
بیٹھے ہیں رہ گذر پہ ہم کوئی ہمیں اٹھائے کیوں

جب وہ جمال دلفروز، صورت مہر نیمروز
(۳)
آپ ہی ہو نظارہ سوز، پردہ میں منہ چھپائے کیوں

دشنۂ غمزہ جانستاں، ناوک ناز بے پناہ
(۴)
تیرا ہی عکس رخ سہی، سامنے تیرے آئے کیوں

قید حیات و بند غم اصل میں دونوں ایک ہیں
(۵)
موت سے پہلے آدمی، غم سے نجات پائے کیوں

حسن اور اس پہ حسن ظن، رہ گئی بوالہوس کی شرم
(۶)
اپنے پہ اعتماد ہے غیر کو آزمائے کیوں

ہاں وہ نہیں خدا پرست، جاؤ وہ بے وفا سہی
(۷)
جس کو ہو دین و دل عزیز اس کی گلی میں جائے کیوں

واں وہ غرور عز و ناز یاں یہ حجاب پاس وضع
(۸)
راہ میں ہم ملیں کہاں، بزم میں وہ بلائے کیوں

غالبِ خستہ کے بغیر کون سے کام بند ہیں (۹)

روئیے زار زار کیا، کیجیے ہائے ہائے کیوں

(۱) پیرایۂ بیان اور اصرار گریہ کیا خوب ہے)

(۲) (اپنی خاک افتادگی کے حق کو ثابت کیا ہے)

(۳) "جمالِ دلفروز" دل منور کر دینے والا حُسن اور یہ حُسن الٰہی کی شان خاص ہے "مہر نیمروز" کا الشمس فی نصف النہار۔ "نظارہ سوز" خیرگی نظر مراد ہے یعنی جب شدتِ تابِ حُسن سے نگاہیں خیرہ ہو جاتی ہیں تو یہ خیرگی خود حجاب و پردہ کا کام کرتی ہے۔ پھر اُس کو منہ چھپانے کی کیا ضرورت ہے۔ یعنی جب اُس برقِ جمال کو دعوئے لن ترانی ہے تو چھپنے کی کیا ضرورت ہے۔

(۴) "دشنۂ غمزہ" خنجر گردش چشم "ناوک" تیر۔ یعنی جب غمزہ اور ناز کا یہ عالم ہے تو آئینہ میں عکس کس طرح مقابل ہو سکتا ہے۔

(۵) گویا اس ہستی کی حقیقت موجود ہی غم ہے۔

(۶) حسن عارض اور حسن ظن دو صفتیں محبوب میں جمع ہیں۔ یعنی صورت اچھی ہے اور گمان اس کا صحیح ہے کبھی خطا نہیں کرتا اور یہ گمان اس کو بہ نسبت اپنے ہے۔ کہ میرا مارا کبھی بچتا نہیں اور میرا تیر غمزہ کبھی خطا نہیں کرتا پس جب اس کو اپنے پر ایسا بھروسہ ہے تو رقیب کا امتحان کیوں کرے۔ اس حُسن ظن نے رقیب کی شرم رکھ لی۔ ورنہ یہاں معشوق نے مغالطہ کھایا تھا۔ رقیب عاشق صادق نہ تھا۔ ہوسناک آدمی تھا اگر یہ امتحان درمیان آتا تو حقیقت کھل جاتی (ماخوذ از مکتوبات غالب)۔

(۷) خدا پرستی کے لئے دین اور بے وفائی کے لئے دل استعمال ہوا ہے۔

(۸) یعنی افسوس بے وجہ ہے۔

---

(۱)
غنچۂ ناشگفتہ کو دور سے مت دکھا کہ یوں
بوسہ کو پوچھتا ہوں میں، منہ سے مجھے بتا کہ یوں

(۲)
پرسشِ طرزِ دلبری، کیجئے کیا کہ بن کہے
اس کے ہر اک اشارہ میں نکلے ہے یہ ادا کہ یوں

(۳)
رات کے وقت مے پیئے ساتھ رقیب کو لئے
آئے وہ یاں خدا کرے پر نہ کرے خدا کہ یوں

(۴)
غیر سے رات کیا بنی، یہ جو کہا تو دیکھئے
سامنے آن بیٹھنا، اور یہ دیکھنا کہ یوں

(۵)
بزم میں اس کے روبرو کیوں نہ خموش بیٹھئے
اس کی تو خامشی میں بھی، ہے یہی مدعا کہ یوں

(۶)
میں نے کہا کہ بزمِ ناز چاہیئے غیر سے تہی
سن کے ستم ظریف نے مجھ کو اٹھا دیا کہ یوں

(۷)
مجھ سے کہا جو یار نے، جاتے ہیں ہوش کس طرح
دیکھ کے میری بیخودی چلنے لگی ہوا کہ یوں

(۸)
کب مجھے کوئے یار میں رہنے کی وضع یاد تھی
آئینہ دار بن گئی، حیرتِ نقشِ پا کہ یوں

(۹)
گر ترے دل میں ہو خیال، وصل میں شوق کا زوال
موجِ محیطِ آب میں مارے ہے دست و پا کہ یوں

	جو یہ کہے کہ ریختہ کیونکہ ہو رشک فارسی گفتۂ غالبؔ ایک بار پڑھ کے اُسے سنا کہ یوں	(۱۰)

(۱) "غنچۂ ناشگفتہ" کی تشبیہ دہن محبوب سے ظاہر ہے۔ یعنی دور سے نظارہ تو کرا دیتے ہیں مگر بوسۂ لب کی اجازت زبان سے نہیں دیتے۔

(۲) "پرسش طرز دلبری" دل لینے کا طریقہ معلوم کرنا۔ یعنی ہر انداز کہتا ہے کہ یوں دل لے لیتے ہیں۔

(۳) یعنی خدا کرے وہ آئے ضرور لیکن نشہ میں رقیب کو ساتھ لے کر نہ آئے۔

(۴) یعنی یہ پوچھا تو سامنے آ بیٹھے۔ اور غصہ سے دیکھ کر فرمانے لگے کہ ہاں آپ کی یہ جرأت ہوئی کہ ہماری پرسش حال کریں۔

(۵) یعنی اُس کی خاموشی خاموشی کا اشارہ کرتی ہے۔

(۶) "ستم ظریف" ہنسی میں قیامت ڈھانے والا۔ میں نے غیر کے متعلق کہا تھا انھوں نے مجھے محفل سے اُٹھا کر تعمیل کیا۔

(۷) شاعرانہ خیال ہے کہ بے خودی دیکھ کر ہوا بھی چلنے لگی اور ہوا سے ظاہر ہوا کہ ہوش بھی اسی طرح اُڑتے ہیں۔

(۸) "آئینہ وار" مثل یا ہم مراد ہے۔ یعنی حیرت نقش پا کی طرح بزم یار میں غیر متحرک و خاموش بیٹھنا چاہئے۔

(۹) "وصل" فنا "شوق" طلب۔ محیط آب سے دریائے بے پایاں مراد ہے۔ مطلب یہ ہے کہ بحر معرفت میں فنا ہونے سے طلب بھی اس طرح فنا ہو جاتی ہے جیسے موجیں ہاتھ پیر مارتے مارتے

سطح آب میں غائب ہو جاتی ہیں۔

(۱۰) "ریختہ" اردو شاعری "گفتہ غالب" اشعار غالب یعنی جو شخص کہے کہ اردو شاعری فارسی سے بہتر کیسے ہو سکتی ہے اسکو غالب کے اشعار سنا کر کہدو کہ اس طرح ہو سکتی ہے۔

حسد سے دل گر افسردہ ہے گرم تماشا ہو
(۱)
کہ چشم تنگ شاید کثرت نظارہ سے وا ہو

بقدر حسرت دل چاہئے ذوق معاصی بھی
(۲)
بھروں یک گوشۂ دامن گر آب ہفت دریا ہو

اگر وہ سرو قد گرم خرام ناز آجاوے
(۳)
کف ہر خاک گلشن شکل قمری نالہ فرسا ہو

(۱) یعنی حسد سے اگر تنگ دلی ہو تو احوال عالم پر غور کرنا چاہئے تاکہ کثرت نظارہ سے نگاہوں میں وسعت پیدا ہو۔ یہ شعر فلسفۂ نفس سے متجاوز ہو کر حکمت تبلیغی کی شان تک پہنچ گیا ہے
(۲) گنہگاری کو تردامنی لکھتے ہیں اور آلودگی دامن بھی اسی معنی میں آتا ہے۔ مصرعہ ثانی میں گوشۂ دامن بھرنے سے یہی مراد ہے۔ اور اسی رعایت سے ہفت دریا بمعنی سارے جہان کے گناہ استعمال ہوا ہے
(۳) "سرو قد" محبوب مراد ہے "گرم خرام ناز" نازو انداز سے چلتا ہوا "کف ہر خاک گلشن" گلشن کی ہر مشت خاک اپنے زیر قدم میں نالہ ہائے عشق پیدا ہو جائیں۔

کعبے میں جا رہا، تو نہ دو طعنہ کیا کہیں	١	بھولا ہوں حقِ صحبتِ اہلِ کنشت کو
طاعت میں تا رہے نہ مے و انگبیں کی لاگ	٢	دوزخ میں ڈال دو کوئی لے کر بہشت کو
ہوں منحرف نہ کیوں رہ و رسمِ ثواب سے	٣	ٹیڑھا لگا ہے قط، قلمِ سرنوشت کو
٤	غالب کچھ اپنی سعی سے لہنا نہیں مجھے خرمن جلے اگر نہ ملخ کھائے کشت کو	

(١) "اہلِ کنشت" اہلِ بتخانہ۔ یعنی میں کعبہ میں رہ پڑا، تو طعنہ نہ دو کیونکہ میں حقِ صحبت اہلِ کنشت کو کب بھولا ہوں۔

(٢) "طاعت" عبادت الٰہی "مے و انگبیں" جنت کی شہد و شراب کی نہریں مراد ہیں۔ یعنی عبادت الٰہی میں نعمائے جنت کے لالچ کی شرکت نفس میں باقی نہ رہے۔ ایسی جنت جو نفس کو نفسِ عبادت سے اس طرف متوجہ کرے دوزخ میں جھونک دینے لائق ہے تاکہ عبادات میں صرف خلوص اور حسنِ للّٰہیت باقی رہ جائیں۔

(٣) "سرنوشت" قسمت۔ ٹیڑھے قط سے انحراف راہِ صواب کی توجیہ کی ہے گویا قسمت ہی میں یوں لکھا ہے۔

(٤) "لہنا" مستفید ہونا "ملخ" ٹیڑی "کشت" کھیتی۔ یعنی بہر حال مجھے برباد ہونا ہے۔

وارستہ اس سے ہیں کہ محبت ہی کیوں نہ ہو	١	کیجے ہمارے ساتھ عداوت ہی کیوں نہ ہو
چھوڑا نہ مجھ میں ضعف نے رنگ اختلاط کا	٢	ہے دل پہ بار نقشِ محبت ہی کیوں نہ ہو
ہے مجھ کو تجھ سے تذکرۂ غیر کا گلہ	٣	ہر چند بر سبیلِ شکایت ہی کیوں نہ ہو
پیدا ہوئی ہے کہتے ہیں ہر درد کی دوا	٤	یوں ہو تو چارۂ غمِ الفت ہی کیوں نہ ہو

ڈالا نہ بیکسی نے کسی سے معاملہ	۵	اپنے سے کھینچتا ہوں خجالت ہی کیوں نہ ہو
ہے آدمی بجائے خود اک محشرِ خیال	۶	ہم انجمن سمجھتے ہیں خلوت ہی کیوں نہ ہو
ہنگامۂ زبونیِ ہمت ہے انفعال	۷	حاصل نہ کیجیے دھر سے عبرت ہی کیوں نہ ہو
وارستگی بہانۂ بیگانگی نہیں	۸	اپنے سے کر نہ غیر سے وحشت ہی کیوں نہ ہو
مٹتا ہے فوتِ فرصتِ ہستی کا غم کہیں	۹	عمرِ عزیز صرفِ عبادت ہی کیوں نہ ہو
۱۰	اس فتنہ خو کے در سے اب اُٹھتے نہیں اسد اس میں ہمارے سر پہ قیامت ہی کیوں نہ ہو	

(۱) "وارستہ" آزاد یعنی اس ضد اور خیال سے آزاد ہیں کہ آپ ہمارے ساتھ محبت ہی کریں۔ نہیں بلکہ آپ کو کچھ کرنا ضرور چاہیئے۔ عداوت ہی کیوں نہ ہو۔

ترک کیجئے نہ تعلق ہم سے — کچھ نہیں ہے تو عداوت ہی سہی

(۲) ضعف سے رنگ اُڑ جانا عام بات ہے۔ اسی رعایت سے اختلاط (محبت) کا رنگ لکھا ہے پھر رنگ کی مناسبت سے نقش لاتے ہیں۔

(۳) اس خیال کا دوسرا رُخ یہ ہے کہ

ذکر میرا بہ بدی بھی اُسے منظور نہیں — غیر کی بات بگڑ جائے تو کچھ دور نہیں

وہاں انکا ذکر انہیں نا منظور تھا۔ یہاں غیر کے ذکر کا ان کو گلہ ہے۔

(۴) یعنی یہ جو کہتے ہیں کہ ہر درد کی دوا ہے۔ غلط ہے۔ اگر ایسا ہوتا تو غمِ الفت کا بھی علاج ہوتا۔ حالانکہ اُس کی کوئی دوا نہیں۔

(۵) گویا اپنے آپ ہی منفعل ہو لیتا ہوں۔

(۶) خود آدمی کے داخل و باطن میں خیالات و تصورات کے ہنگامے

موجود ہیں۔ اور خارجی اشکال وصورت کی ضرورت ہی نہیں اس کی خلوت بھی انجمن ہے۔

(۷) "دونی ہمت" پستی ہمت۔ یعنی پست ہمتی شرم کی باعث ہے اور کچھ حاصل نہ ہوتا ہو تو مٹے ہوئے آثار سے عبرت ہی حاصل کر لو۔ یعنی اگر بنانے اور سنوارنے اور ایجاد و تعمیر پہ قابو نہ ہو تو بگڑنے اور تخریب سے ہی بصیرت پیدا کرو۔

(۸) بیگانگی اور اجنبیت کا بہانہ وارستگی (آزادی) نہیں ہے اگر بیگانگی اور آزادی کا دعوے ہے تو اپنے نفس سے بے خبر اور آزاد بننا چاہیئے۔

(۹) یعنی عمر کے گذرنے کا غم نہیں جایا کرتا۔ چاہے کیسے ہی اچھے کاموں میں دن کیوں نہ گذرے ہوں۔

(۱۰) "فتنہ خو" کی رعایت سے قیامت گذر جانا استعمال کیا ہے۔

قفس میں ہوں، گر اچھا بھی نہ جانیں میرے شیون کو
میرا ہونا بُرا کیا ہے، نوا سنجانِ گلشن کو (۱)

نہیں گر ہمدمی آساں، نہ ہو، یہ رشک کیا کم ہے
نہ دی ہوتی خدایا آرزوئے دوست دشمن کو (۲)

نہ نکلا آنکھ سے تیری اک آنسو اس جراحت پر
کیا سینہ میں جس نے خونچکاں مژگانِ سوزن کو (۳)

خدا شرمائے ہاتھوں کو کہ رکھتے ہیں کشاکش میں
کبھی میرے گریباں کو، کبھی جاناں کے دامن کو (۴)

ابھی ہم قتل گہ کا دیکھنا آساں سمجھتے ہیں (۵)

نہیں دیکھا شناور جوئے خوں میں تیرے توسن کو

(۶)
ہوا چرچا، جو میرے پاؤں کی زنجیر بننے کا
کیا بیتاب کاں میں جنبشِ جوہر نے آہن کو

(۷)
خوشی کیا کھیت پر میرے اگر سو بار ابر آئے
سمجھتا ہوں کہ ڈھونڈے ہے ابھی سے برق خرمن کو

(۸)
وفاداری بشرطِ استواری اصل ایماں ہے
مرے بتخانہ میں تو کعبہ میں گاڑو برہمن کو

(۹)
شہادت تھی مری قسمت میں جو دی تھی یہ خو مجھ کو
جہاں تلوار کو دیکھا جھکا دیتا تھا گردن کو

(۱۰)
نہ لُٹتا دن کو تو کب رات کو یوں بے خبر سوتا
رہا کھٹکا نہ چوری کا دعا دیتا ہوں رہزن کو

(۱۱)
سخن کیا کہہ نہیں سکتے کہ جویا ہوں جواہر کے
جگر کیا ہم نہیں رکھتے کہ کھودیں جا کے معدن کو

(۱۲)
مرے شاہ سلیماں جاہ سے نسبت نہیں غالب
فریدون و جم و کیخسرو و داراب و بہمن کو

(۱) "قفس" قیدِ آلام سے استعارہ ہے۔ اسی رعایت سے خوش حالانِ زمانہ نواسنجانِ گلشن سے تعبیر کیا گیا ہے۔ مطلب یہ کہ میں تو قیدیِ آلام ہوں۔ میرے نالہ و شیون کو اگر وہ اچھا بھی نہ سمجھیں تاہم میرے وجود سے کیوں نفرت کرتے ہیں۔ میں اُن کی خوش حالیوں میں دخل در معقولات کے لئے آزادی ہی نہیں رکھتا۔

(۲) یعنی اگرچہ رقیب کے لئے معشوق کی ہمدمی مشکل ہے تاہم میرے لئے یہ رشک کیا کم ہے کہ خود اُس کے دل میں محبوب کی آرزو تو موجود ہے۔

(۳) یعنی جس زخم نے سوزنِ فولاد کو خونفشاں بنا دیا اُس پر تیری آنکھ سے ایک اشکِ ہمدردی نہ نکلا۔

(۵) یعنی چونکہ ہم نے تیرے گھوڑے کو دریائے خون میں تیرتے نہیں دیکھا ہے اِس لئے قتل گاہ کا دیکھنا ہم آسان بات سمجھ رہے ہیں۔ گھوڑے کے دریائے خون میں تیرنے سے معشوق کی قتل عام کی جانب اشارہ ہے۔

(۶) یعنی معدن سے جوہرِ آہن کو میری زنجیر بننے کا شوق کھینچ لایا۔

(۷) یعنی ابر کے بار بار آنے سے باران کا یقین نہیں بلکہ یہ گمان ہے کہ پردۂ ابر میں برق میرے کھیت کو تلاش کرتی پھرتی ہے۔

(۸) "اُستواری" اِستقلال وثبات۔ یعنی وفا ایسی اعلیٰ صفت ہے کہ اگر برہمن سے بھی سرزد ہو تو اس کا پورا احترام کرنا چاہئے۔

(۹) یعنی میری خلقت وجبلت میں یہ اہلیت اسی لئے شامل کر دی گئی تھی۔

(۱۰) یعنی اچھا ہوا کہ بخت نے یا فلک نے عیش دنیوی مجھ سے چھین لیا اگر ایسا نہ ہوتا تو ترکِ علائق کی راحت کیسے میسر آتی۔

(۱۱) یعنی ہم کلام ہی کو جوہر سمجھتے ہیں۔ سنگریزوں کی تلاش سے دماغی کمال بہتر ہے۔

(۱۲) شہزادے کی مدح ہے۔

دھوتا ہوں جب میں پینے کو اُس سیمتن کے پانوٗ
(۱)
رکھتا ہے ضد سے کھینچ کے باہر لگن کے پانوٗ

دی سادگی سے جان پڑوں کوہکن کے پانوٗ
(۲)
ہیہات! کیوں نہ ٹوٹ گئے پیرزن کے پانوٗ

بھاگے تھے ہم بہت سو اُسی کی سزا ہے یہ
(۳)
ہوکر اسیر دابتے ہیں راہزن کے پانوٗ

مرہم کی جُستجو میں پھرا ہوں جو دُور دُور
(۴)
تن سے سوا فگار ہیں اس خستہ تن کے پانوٗ

اللہ رے ذوقِ دشت نوردی کہ بعدِ مرگ
(۵)
ہلتے ہیں خود بخود مرے اندر کفن کے پانوٗ

ہے جوشِ گل بہار میں یاں تک کہ ہر طرف
(۶)
اُڑتے ہوئے اُلجھتے ہیں مُرغِ چمن کے پانوٗ

شب کو کسی کے خواب میں آیا نہ ہو کہیں
(۷)
دُکھتے ہیں آج اُس بُتِ نازک بدن کے پانوٗ

غالبؔ مرے کلام میں کیونکر مزا نہ ہو
(۸)
پیتا ہوں دھو کے خسروِ شیریں سخن کے پانوٗ

(۶) یعنی قوتِ نامیہ ہوا میں دامِ رگ ہائے گل بن گئی ہے۔

واں اُس کو ہولِ دل ہے تو یاں میں ہوں شرمسار
(۱)
یعنی کہ میری آہ کی تاثیر سے نہ ہو

اپنے کو دیکھتا نہیں، ذوقِ ستم تو دیکھ
(۲)
آئینہ تاکہ دیدۂ نخچیر سے نہ ہو

(۱) "ہول دل" دلِ نازک کا ڈرنا مراد ہے۔

(۲) "نخچیر" تیر میں چھدا ہوا شکار۔ "دیدۂ نخچیر" آئینہ اور نگاہ میں تشبیہ ہے وجہ شبہ انعکاس صور و اشکال ہے مطلب یہ کہ اس کے ذوقِ ستم کی یہ کیفیت ہے کہ اپنی صورت اُس وقت تک نہیں دیکھتا جب تک کہ دیدۂ نخچیر کا آئینہ نہ بنا لے یا جب تک کسی کو اپنے تیرِ نظر میں نخچیر نہ کر لے آرائشِ جمال نہیں کرتا۔

واں پہنچ کر جو غش آتا پئے ہم ہے ہم کو	۱	صدرہ آہنگِ زمیں بوسِ قدم ہے ہم کو
دل کو میں اور مجھے دل محوِ وفا رکھتا ہے	۲	کس قدر ذوقِ گرفتاریٔ ہم ہے ہم کو
ضعف سے نقشِ پئے مور ہے طوقِ گردن	۳	تیرے کوچے سے کہاں طاقتِ رم ہے ہم کو
جان کر کیجے تغافل کہ کچھ امید بھی ہو	۴	یہ نگاہِ غلط انداز تو سم ہے ہم کو
رشکِ ہم طرحی و دردِ اثرِ بانگِ حزیں	۵	نالۂ مرغِ سحر تیغِ دو دم ہے ہم کو
سر اڑانے کے جو وعدہ کو مکرر چاہا	۶	ہنس کے بولے کہ ترے سر کی قسم ہے ہم کو
دل کے خوں کرنے کی کیا وجہ و لیکن ناچار	۷	پاسِ بے رونقیٔ دیدہ اہم ہے ہم کو
تم وہ نازک کہ خموشی کو فغاں کہتے ہو	۸	ہم وہ عاجز کہ تغافل بھی ستم ہے ہم کو
لکھنؤ آنے کا باعث نہیں کھلتا یعنی	۹	ہوسِ سیر تماشا سو وہ کم ہے ہم کو
مقطعِ سلسلۂ شوق نہیں ہے یہ شہر	۱۰	عزمِ سیرِ نجف و طوفِ حرم ہے ہم کو
۱۱	لئے جاتی ہے کہیں ایک توقع غالبؔ جادۂ رہ کششِ کافِ کرم ہے ہم کو	

(۱) "صدرہ" سینکڑوں طریقوں سے۔ "آہنگ" ارادہ۔ یعنی وہاں پہنچ کر جو مجھے بار بار غش آتے ہیں گویا اپنے قدم چومتا ہوں۔ کہ انہوں نے

یہاں تک پہنچا دیا۔ یا اُن کی قدمبوسی کا بہانہ مل جاتا ہے۔
(۲) مصرعہ ثانی میں "ہم" بمعنی غم والم ہے۔ یعنی دل اور میں، ہم دونوں آپس میں ایک دُوسرے کو تعزیت فادیتے رہتے ہیں۔
(۳) "نقش پئے مور" چیونٹی کا نقشِ پا۔ تمام شعر میں، مبالغۂ اظہارِ ضعف ہے۔
(۴) یعنی جان کر تغافل کیجیے۔ کہ جس سے لگاوٹ معلوم ہوتی ہے بیگانہ وش نگاہیں اچھی نہیں۔
(۵) "ہم طرحی" ہم آوازی مُراد ہے۔ ہم طرحی کے رشک اور شگفتگیِ آواز کے درد واثر سے تیغِ نالہ کا دو دم ہونا ثابت کیا ہے۔
(۶) سر اُڑانے کے وعدہ پر سر کی قسم کھانا کیسی بیباختگی ہے۔
(۷) "اہم" زیادہ ضروری وعرجح یعنی آنکھیں بغیر اشک ہائے خونیں سکے بے رونق معلوم ہوتی ہیں۔
(۸) دونوں جانب شدت ہے یعنی وہ تو خاموشی کو فغاں سمجھتے ہیں اور بات کرنا بھی قیامت ہے۔ اور ہم اس قدر عاجز ہیں کہ تغافل بھی ستم معلوم ہوتا ہے۔
(۱۰) "مقطع" خاتمہ۔ کوشش کافِ کرم" سے جادۂ راہ کی تشبیہ ہے۔

تم جانو، غیر سے جو تمہیں رسم وراہ ہو	۱	مجکو بھی پُوچھتے رہو تو کیا گناہ ہو
بچتے نہیں مواخذۂ روزِ حشر سے	۲	قاتل اگر رقیب ہے تو تم گواہ ہو
کیا وہ بھی بیگناہ کش و ناحق شناس ہیں	۳	مانا کہ تم بشر نہیں خورشید وماہ ہو
اُبھرا ہُوا نقاب میں ہے اُنکے ایک تار	۴	مرتا ہوں میں کہ یہ نہ کسی کی نگاہ ہو
جب میکدہ چُھٹا، تو پھر اب کیا جگہ کی قید	۵	مسجد ہو، مدرسہ ہو، کوئی خانقاہ ہو

سنتے ہیں جو بہشت کی تعریف سب درست	٦	لیکن خدا کرے وہ تری جلوہ گاہ ہو
	۷	غالب بھی گر نہ ہو تو کچھ ایسا ضرر نہیں دنیا ہو یا رب اور مرا بادشاہ ہو

(۱) یعنی کسی نہ کسی عنوان سے آپ سے میرے مظالم کا مواخذہ ضرور ہوگا۔

(۳) یعنی تم باعتبارِ حسن کے ماہتاب و آفتاب ہو، اور ہم مانے لیتے ہیں کہ تم بشر نہیں ہو، لیکن کیا خورشید و ماہ بھی بیگناہ کش اور حق ناشناس ہیں، کیونکہ تم میں تو یہ دونوں صفتیں موجود ہیں۔

(۴) تارِ نقاب اور تارِ نگہ میں تشبیہ ہے۔ رشک یہ ہوتا ہے کہ کسی غیر کا تارِ نگہ تو نہیں ہے۔

(۵) سچ ہے جب کعبۂ مقصود ہی چھٹ گیا، تو پھر کہیں بھی (ہیں) کوئی امتیازِ مقام باقی نہیں۔

(٦) نعمائے جنت میں سب سے بڑی نعمت دیدارِ الٰہی ہے۔ "جلوہ گاہ" سے بھی اسی کی طرف اشارہ ہے۔ خدا سے خدا کے دیدار کی استدعا دلپذیری بیان ہے۔

گئی وہ بات کہ ہو گفتگو تو کیونکر ہو	۱	کہے سے کچھ نہ ہوا پھر کہو تو کیونکر ہو
ہمارے ذہن میں اس فکر کا ہے نام وصال	۲	کہ گر نہ ہو تو کہاں جائیں، ہو تو کیونکر ہو
ادب ہے اور یہی کشمکش تو کیا کیجے	۳	حیا ہے اور یہی گومگو تو کیونکر ہو
تمہی کہو کہ گزارا صنم پرستوں کا	۴	بتوں کی ہو اگر ایسی ہی خو تو کیونکر ہو
الجھتے ہو تم، اگر دیکھتے ہو آئینہ	۵	جو تم سے شہر میں ہوں ایک دو تو کیونکر ہو
جسے نصیب ہو روزِ سیاہ میرا سا	٦	وہ شخص دن نہ کہے رات کو تو کیونکر ہو

ہمیں پھر اُن سے اُمید، اور اُنہیں ہماری قدر	۷	ہماری بات ہی پُوچھیں نہ وہ تو کیونکر ہو
غلط نہ تھا ہمیں خط پر گماں تسلی کا	۸	نہ مانے دیدۂ دیدار جُو تو کیونکر ہو
بتاؤ اس مژہ کو دیکھ کر کہ مجھ کو قرار	۹	یہ نیش ہو رگِ جاں میں فرو تو کیونکر ہو
۱۰	مجھے جنوں نہیں غالب ولے بقول حضور فراقِ یار میں تسکین ہو تو کیونکر ہو	

(۱) یعنی آپ اُن سے گفتگو کا ارمان بھی نہ رہا۔ کیونکہ کہنے سے کچھ ہوتا ہی نہیں۔ تو پھر کس توقع پر کہا جائے۔

(۲) یعنی ہم تو اسی کشمکشِ خیال کو وصال سمجھتے ہیں۔ کہ نہ ہو تو کیا کریں اور ہو تو کس طرح ہو۔

(۳) یعنی ہمیں گستاخ دیتیوں میں ادب مانع ہے اور انہیں کچھ کہتے ہوئے حیا روکتی ہے۔ دیکھئے آرزو کس طرح نکلے۔

(۴) یعنی اگر سب کے معشوق ایسے ہی نامہربان ہوں جیسے آپ ہیں تو کام کس طرح چلے۔

(۵) یعنی تمہیں اپنے عکس کا مقابلہ جمال گوارا نہیں اگر شہر میں دو چار آپ جیسے ہوں تو قیامت خونریزیاں ہو جائیں۔

(۶) "روزِ سیاہ" بدقسمتی سے تاریکی شب کی لفظی توجیہ ہے۔

(۷) یعنی ہمیں اُن سے اُمید کیونکر ہو اور یہ کس طرح معلوم ہو کہ اُنہیں ہماری قدر ہے جب وہ ہماری بات ہی نہ پُوچھیں۔

(۸) یعنی خط پر دل کی تسلی کا گمان غلط نہ تھا۔ لیکن آنکھیں بھی دیدار طلب ہیں جن کی تسلی بغیر نظارۂ جمال ناممکن ہے۔

(۹) "نیش" نشتر مُراد ہے۔ رگِ جاں میں فرو ہونا۔ رگِ جاں میں اُترنا

یعنی اُس کی مژگاں دیکھ کر بتاؤ کہ جب ایسا نشترِ رگِ جاں میں
اُتر جائے تو مجھ کو کیونکر قرار ہو۔
(۱۰) مصرعۂ ثانی غالباً بادشاہ کا دیا ہوا مصرعہ طرح ہو گا۔

(۱)
کسی کو دے کے دل کوئی نوا سنجِ فغاں کیوں ہو
نہ ہو جب دل ہی پہلو میں تو پھر مُنہ میں زباں کیوں ہو

(۲)
وہ اپنی خُو نہ چھوڑیں گے ہم اپنی وضع کیوں بدلیں
سُبک سر بن کے کیا پوچھیں کہ ہم سے سرگراں کیوں ہو

(۳)
کیا غمخوار نے رُسوا لگے آگ اس محبت کو
نہ لادے تاب جو غم کی وہ میرا رازداں کیوں ہو

(۴)
وفا کیسی کہاں کا عشق جب سر پھوڑنا ٹھیرا
تو پھر اے سنگدل تیرا ہی سنگِ آستاں کیوں ہو

(۵)
قفس میں مجھ سے رودادِ چمن کہتے نہ ڈر ہمدم
گری ہے جس پہ کل بجلی وہ میرا آشیاں کیوں ہو

(۶)
یہ کہہ سکتے ہو ہم دل میں نہیں ہیں پر یہ بتلاؤ
کہ جب دل میں تمہیں تم ہو تو آنکھوں سے نہاں کیوں ہو

(۷)
غلط ہے جذبِ دل کا شکوہ دیکھو جرم کس کا ہے
نہ کھینچو گر تم اپنے کو کشاکش درمیاں کیوں ہو

(۸)
یہ فتنہ آدمی کی خانہ ویرانی کو کیا کم ہے
ہوئے تم دوست جسکے دشمن اُس کا آسماں کیوں ہو

(۹)
یہی ہے آزمانا تو ستانا کس کو کہتے ہیں
عدو کے ہو لئے جب تم تو میرا امتحاں کیوں ہو

(۱۰)
کہا تم نے کہ کیوں ہو غیر کے ملنے میں
بجا کہتے ہو، سچ کہتے ہو، پھر کہیو کہ ہاں کیوں ہو

(۱۱)
نکالا چاہتا ہے کام کیا طعنوں سے تو غالب
ترے بے مہر کہنے سے وہ تجھ پر مہرباں کیوں ہو

(۱) "نوا سنج فغاں" صدا ہائے درد یا بیانِ درد مُراد ہے یعنی دل دے چکنے کے بعد فغاں کیسی؟ اور جب پہلو خالی ہو تو زبان ہی کیوں باقی رہے۔

(۲) "سبک سر بن کے" حقیر و ذلیل ہو کر۔ "سرگراں" خفا۔ سبک اور گراں میں رعایت لفظی ہے۔ یعنی یہ یقین کہ اُن کی عادت یہی رہے گی، پھر برہمی کا سبب پوچھ کر کیوں ناحق ذلیل ہوں۔

(۳) یعنی غمخوار کو میرے غمِ عشق کی تاب نہ ہوئی اور سارے زمانہ میں تعجب و رنج سے میرا واقعہ بیان کرتا پھرا۔ غرض کہ خوب رُسوا کیا۔ وہ میرا رازداں ہی کیوں ہو جسے خود غم کی تاب نہ ہو۔

(۴) "وفا کیسی" "کہاں کا عشق" یہ معشوق کے کہے ہوئے الفاظ ہیں۔ جن کو استفہاماً دُہرایا ہے۔ مطلب ہے کہ آپ جو فرماتے ہیں کہ کیسی وفا اور کہاں کا عشق تو اگر میں وفادار نہیں ہوں اور مجھے عشق نہیں ہے بلکہ خواہ مخواہ اور بے وجہ سر پھوڑتا ہوں تو اس میں آپ ہی کے سنگ آستاں کی کیا خصوصیت تھی۔ ہر پتھر اور ہر دیوار سے سر پھوڑا جا سکتا تھا۔ حضور عالی آپ ہی کے سنگِ آستاں سے سر مارا جانا تو اسی کی دلیل ہے کہ مجھے آپ ہی سے

عشق ہے اور میں وفادار ہوں۔

(۵) یعنی میں تو قفس میں ہوں۔ یہی میرا نشیمن ہے۔ کل جس پر بجلی گری ہے وہ میرا آشیاں کیوں ہونے لگا۔ پس اے ہمدم روئداد چمن کہتے ہوئے مجھ سے نہ ڈر۔

(۶) یعنی یہ اور بات ہے کہ آپ دل میں رہنے ہی سے انکار کر دیں۔ مگر جب تک یہ انکار نہیں ہے تو یہ بتلاؤ کہ جب دل میں تم ہی تم ہو اور دعوے نَحْنُ اَقْرَبُ اِلَيْهِ مِنْ حَبْلِ الْوَرِيْدِ ۞ وَفِيْٓ اَنْفُسِكُمْ اَفَلَا تُبْصِرُوْنَ ۞ ہے تو آنکھوں سے کیوں اور کس طرح پنہاں ہو۔

(۷) یعنی جانبین کی کشمکش میں کشاکش کی ضرورت ہے۔ محض میرے جذب دل سے کشمکش پیدا نہیں ہو سکتی۔ پس اگر آپ کھینچنا چھوڑ دیں تو میں کھینچنا چھوڑ دوں اور یہ کشمکش جاتی رہے۔

(۸) "یہ فتنہ" عشق کی جانب اشارہ ہے۔ یعنی آپ جس کے معشوق بن گئے آسمان کو اُس سے دشمنی کی ضرورت نہیں ہی چونکہ آپ ہی کا عشق خانہ ویراں ساز بربادی کے لئے کچھ کم نہیں۔

(۹) عدو کے ہو جانے کے بعد میری آزمایش فضول ہے اور ستاتا ہے۔

(۱۰) سبحان اللہ اردو شاعری ایسے اشعار پر جس قدر فخر کرے کم ہے۔

(۱۱) یعنی وہ بے مہر کہنے سے مہربان نہ ہوں گے۔

ہم سخن کوئی نہ ہو اور ہمزباں کوئی نہ ہو	۱	رہیئے اب ایسی جگہ چل کر جہاں کوئی نہ ہو
کوئی ہمسایہ نہ ہو اور پاسباں کوئی نہ ہو	۲	بے در و دیوار سا اک گھر بنایا چاہیئے

پڑیئے گر بیمار تو کوئی نہ ہو تیمار دار	۲	اور اگر مر جائیے تو نوحہ خواں کوئی نہ ہو

(۱) شاعر ایک تنہا اور بے کس زندگی کی آرزو کرتا ہے اور خوب کرتا ہے۔

از مہر تا بہ ذرّہ دل و دل ہے آئینہ	۱	طوطی کو شش جہت سے مقابل ہے آئینہ

(۱) "دل و دل" کے درمیان واؤ عطف ہے "طوطی" استعارہ ہے نظارگی اور دیکھنے والے سے "شش جہت" اطرافِ عالم۔ مطلب ہے کہ ذرّہ سے لے کر آفتاب تک جو کچھ ہے دل ہے اور دل گویا آئینہ ہے، تو تمام عالم ایک آئینہ ہے۔ اب دیکھنے والا جدھر دیکھتا ہے آئینہ مقابل پاتا ہے، اور ہر طرف اپنے ہی آپ کو منعکس پاتا ہے۔

ہے سبزہ زار ہر در و دیوارِ غم کدہ	۱	جس کی بہار یہ ہو پھر اُسکی خزاں نہ پوچھ
ناچار بیکسی کی بھی حسرت اُٹھائیے	۲	دُشوارئ رہ و ستمِ ہمرہاں نہ پوچھ

(۱) گھر میں گھانس نکل آنا آثار ویرانی میں سے ہے "غمکدہ" اپنے گھر سے استعارہ ہے۔ مطلب ہے کہ موسم بہار میں ویرانی کا جب یہ عالم ہے تو خزاں میں نہ معلوم کیا حال ہوگا۔ یعنی جب اچھا موسم ہمارے گھر کے لئے بربادیاں فراہم کرتا ہے تو خدا جانے بُرے دن کیا کچھ نہ کریں گے۔

(۲) یعنی ساتھیوں کی بے حوصلگی یا کم ذوقی سے مجبوراً بیکسی کی حسرت اُٹھائی جس سے راہ اور بھی دُشوار ہو گئی۔

صد جلوہ رو برو ہے جو مژگاں اُٹھائیے	۱	طاقت کہاں کہ دید کا احساں اُٹھائیے
ہے سنگ پر براتِ معاشِ جنونِ عشق	۲	یعنی ہنوز منّتِ طفلاں اُٹھائیے

دیوار بارِ منّتِ مزدور سے ہے خم	٣	اے خانماں خراب نہ احساں اُٹھائیے
یا میرے زخمِ رشک کو رُسوا نہ کیجئے	٤	یا پردۂ تبسّمِ پنہاں اُٹھائیے

(١) "صد جلوہ" سے بے تعداد مظاہرِ فطرت مُراد ہیں۔ کہاں تک کوئی دیکھ سکتا ہے۔

(٢) "براتِ معاش" وثیقۂ معاش اصطلاح ہے۔ یعنی جنون کا گزارہ پتھروں پر ہے اس لئے لڑکوں کا احسان اُٹھانا پڑے گا۔

(٣) یعنی تعمیر ہی باعثِ تخریب ہے۔ یا منت پذیری فائدہ مند نہیں، بلکہ احسان کے بعد احساسِ احسانمندی ہی ایک مصیبت ہے۔

(٤) "رُسوا نہ کیجئے" الزام نہ دیجئے مُراد ہے یعنی یا مجھ پر زخمِ رشک کی تہمت نہ رکھئے یا تبسّمِ پنہاں کا پردہ اُٹھا دیجئے۔ یا اغیار سے پردہ میں ہنسنا بولنا چھوڑ دیجئے۔

مسجد کے زیرِ سایہ خرابات چاہیئے	١	بھَوں پاس آنکھ قبلۂ حاجات چاہیئے
عاشق ہوئے ہیں آپ بھی اک اور شخص پر	٢	آخر ستم کی کچھ تو مکافات چاہیئے
سیکھے ہیں مہ رخوں کے لئے ہم مصوری	٣	تقریب کچھ تو بہرِ ملاقات چاہیئے
مے سے غرض نشاط ہے کس رو سیاہ کو	٤	اک گونہ بیخودی مجھے دن رات چاہیئے
ہے رنگِ لالہ و گل و نسریں جُدا جُدا	٥	ہر رنگ میں بہار کا اثبات چاہیئے
سر پائے خُم پہ چاہیئے ہنگامِ بیخودی	٦	رُو سوئے قبلہ وقتِ مناجات چاہیئے
یعنی بحسبِ گردشِ پیمانۂ صفات	٧	عارف ہمیشہ مستِ مئے ذات چاہیئے

٨	نشو و نما ہے اصل سے غالبؔ فروع کو خاموشی ہی سے نکلے ہے جو بات چاہیئے

(١) "قبلۂ حاجات" یہ کلمہ ہے جو اپنے سے زیادہ مرتبہ کے لوگوں سے

تخاطب میں مستعمل ہے۔ یہاں لفظی مناسبت بھی پیدا ہوتی ہے۔ "ابرو" کو محراب سے تشبیہ دیا کرتے ہیں اور "محراب" "مسجد" سے تعلق رکھتی ہے اس لئے ابرو کو مسجد کہا گیا ہے اور محبوب کی نشیلی آنکھوں کو خرابات (مے خانہ) جو عام طور پر مستعمل ہے۔

(۲) "مکافات" تلافی مطلب ہے کہ جی لگا کر اُن کو بھی تنہائی سے واسطہ ہو ہی گیا اور ہم نے اپنی بیکسی کا بدلہ اس طرح پایا کہ اُن کا حال بھی ہمارا سا ہو گیا۔ یا ہمارا صبر پڑا کہ وہ بھی مُبتلائے عشق ہو گئے۔

(۳) "دل حسرت پرست کی داد دے" کچھ حسرتیں پوری کر دے، "مافات" گزشتہ۔

(۵) یعنی سرورِ عیش کے لئے نہیں بلکہ بے خبری اور افکار فراموشی کے لئے میں مے نوشی کرتا ہوں۔

(۶ تا ۸) "اصل" جڑ۔ اصطلاحی لفظ ہے۔ "فرع" شاخیں۔ یہ بھی مصطلح لفظ ہے۔ "اثبات" ثابت کرنا۔ "ہنگام بیخودی" بیخودی کے وقت۔ "پیمانہ" "ساغر" "مست" مے وغیرہ رعایتی الفاظ ہیں "عارف" صاحب عرفان۔ "ذات" سے ذات الٰہی مُراد ہے۔ مطلب ہے کہ فرع اصل سے پیدا ہوتی ہیں۔ گفتگو فرع ہے۔ خاموشی مبدءِ گفتگو ہے۔ اور خاموشی بھی منتہا ہے امکان عدم ہی سے نشو ونما حاصل کرتا ہے۔ یعنی غیب ہی سے ظہور پیدا ہوتا ہے۔ کثرتِ مظاہر والوں سے تعدد ذات کا دھوکا نہ ہونا

چاہیئے۔ یا ذات کا بوجہ غلیوبیت انکار نہ کرنا چاہیئے لالہ و گل اور نسرین مظاہر متنوعہ ہیں اور مختلف الالوان ہیں۔ بہار یا نامیہ غیر مرئی اور غیب ہے، تاہم ثابت ہے۔ اور یہ تمام گلکاریاں اسی کی ہیں اور یہ مختلف رنگ ایک ہی بہار نے عارض کر دیئے ہیں۔ غرضکہ ہر بات اپنے اپنے موقع اور محل سے ہونی چاہیئے۔ بیخودی میں اگر سر پائے خم پہ ہو تو مناجات میں منہ جانب قبلہ ہونا چاہیئے۔ اور اس طرح ہر رنگ اور ہر عمل میں وحدتِ خیال مدنظر ہونی چاہیئے اور تمام صفات الٰہی سے متصف ہونے کی کوشش کرنی چاہیئے۔ مظاہر کی کثرت اور بوقلمونی میں وحدتِ ذات کی حقیقت کو کھونا نہ چاہیئے۔

(۱)
بساطِ عجز میں تھا ایک دل یک قطرہ خوں وہ بھی
سو رہتا ہے باندازِ چکیدن سرنگوں وہ بھی

(۲)
رہے اُس شوخ سے آزردہ ہم چندے تکلف سے
تکلف برطرف تھا ایک اندازِ جنوں وہ بھی

(۳)
خیالِ مرگ کب تسکیں دلِ آزردہ کو بخشے
مرے دامِ تمنا میں ہے اک صیدِ زبوں وہ بھی

(۴)
نہ کرتا کاش نالہ مجھ کو کیا معلوم تھا ہمدم
کہ ہوگا باعثِ افزایشِ دردِ دروں وہ بھی

(۵)
نہ اتنا بُرشِ تیغِ جفا پر ناز فرماؤ
مرے دریائے بیتابی میں ہے اک موجِ خوں وہ بھی

(۶)
مئے عشرت کی خواہش ساقیِ گردوں سے کیا کیجے

لئے بیٹھا ہے اِک دو چار جامِ واژگوں وہ بھی

مرے دل میں ہے غالبؔ شوقِ وصل و شکوۂ ہجراں
خدا وہ دن کرے جو اُس سے میں یہ بھی کہوں وہ بھی (۷)

(۱) "بساطِ عجز" یعنی عاشق مُراد ہے۔ "سرنگوں" (سر جھکائے ہوئے) عجز کی رعایت سے استعمال ہوا ہے۔ "چکیدن" ٹپکنا۔ سرنگوں اور اندازِ چکیدن سے قلبِ انسانی کی صورتِ وضعی یا ہیئتِ تعلیقی کی جانب اشارہ ہے۔ مطلب ہے کہ عاشق کے پاس ایک دل ہے۔ جو ایک قطرۂ خون سے زیادہ حقیقت نہیں رکھتا۔ ہمیشہ مائل بہ چکیدن رہتا ہے۔

(۲) "تکلف سے" یعنی محض دکھانے کے لئے اور اظہارِ خودداری کے لئے۔ تکلف برطرف (کہاں کا تکلف یا کیسا تکلف) فارسی کا محاورہ ہے۔

(۳) "صیدِ زبوں" بدحال شکار۔ یعنی خیالِ مرگ سے دلِ رنجور کی تسکین کیونکر ہو سکتی ہے۔ میرے دامِ تمنا میں جہاں اور بہت سے ارمان و حسرت ہیں وہاں شکار مُردار خیالِ مرگ بھی ہے۔

(۴) "افزائش" زیادتی۔ "دردِ دروں" دردِ پنہاں یا دردِ دل۔

(۵) "بُرش" تلوار کی کاٹ۔ "موجِ خوں" سے تیغِ جفا کی تشبیہ ہے اور نہایت موزوں ہے۔

(۶) "مئے عشرت" شرابِ عیش۔ "گردوں" آسمان۔ "جامِ واژگوں" ساغرِ بدفال یا نامبارک۔ ایک۔ "ایک دو چار" میں ہفت آسمان کی

رعایت ملحوظ ہے۔

ہے بزمِ بتاں میں سخن آزردہ لبوں سے	۱	تنگ آئے ہیں ہم ایسے خوشامد طلبوں سے
ہے دورِ قدح، وجہ پریشانیِ صہبا	۲	یکبار لگا دو خمِ مے میرے لبوں سے
رندانِ درِ میکدہ گستاخ ہیں واعظ	۳	زنہار نہ ہونا طرف، ان بے ادبوں سے
بیدادِ وفا دیکھ کہ جاتی رہی آخر	۴	ہر چند مری جان کو تھا ربط لبوں سے

(۱) یعنی بتوں کی بزم میں بحالتِ رنج و افسردگی بات کرنی ہی پڑتی ہے ورنہ تہذیبِ مجلس اور ان کے مزاج کے خلاف ہوتا ہے۔ ان حسینان خوشامد طلب سے تنگ آ گئے ہیں۔

(۲) یعنی دورِ ساغرِ شراب کی پریشانی کا باعث ہوتا ہے۔ ایکدم ہی خم مے میرے لبوں سے لگا دیتا تاکہ شراب کشاکش اور گردش سے نجات پاتے۔

(۳) "نہ ہونا طرف" نہ الجھنا۔ یا منہ نہ لگنا مراد ہے۔

(۴) یعنی جان تو پہلے ہی لبوں پر رہتی تھی لیکن وفا کی سختیوں سے جاتی ہی رہی۔

تا، ہمکو شکایت کی بھی باقی نہ رہے جا	۱	سن لیتے ہیں گو ذکر ہمارا نہیں کرتے
غالب ترا احوال سنا دینگے ہم ان کو	۲	وہ سن کے بلا لیں یہ اجارا نہیں کرتے

(۱) یعنی خود تو ذکر کرتے نہیں البتہ اگر کوئی دوسرا ہمارا ذکر چھیڑ دے تو خاموشی سے سن ضرور لیتے ہیں تاکہ ہم یہ شکایت نہ کر سکیں کہ تمہیں ہم سے نفرت ہے اور ہمارا ذکر تک تم کو ناگوار ہے۔

(۲) "اجارہ" دعویٰ مراد ہے۔

گھر میں تھا کیا کہ ترا غم اسے غارت کرتا	۱	وہ جو رکھتے تھے ہم اک حسرتِ تعمیر سو ہے

(۱) یعنی گھر میں کچھ تھا ہی نہیں کہ غمِ عشق برباد کرتا۔ بلکہ گھر بنانے کی حسرت تھی تو وہ بدستور ہے۔ اسی مضمون کا ایک شعر اس سے پہلے گذر چکا ہے:-

ہوا ہوں عشق کی غارتگری سے شرمندہ
سوائے حسرتِ تعمیر گھر میں خاک نہیں

غمِ دنیا سے گر پائی بھی فرصت سر اٹھانے کی
(۱)
فلک کا دیکھنا تقریب تیرے یاد آنے کی

کھلے گا کس طرح مضموں مرے مکتوب کا یا رب
(۲)
قسم کھائی ہے اُس کافر نے کاغذ کے جلانے کی

لپٹنا پرنیاں میں شعلۂ آتش کا آساں ہے
(۳)
ولے مشکل ہے حکمت دل میں سوزِ غم چھپانے کی

اُنہیں منظور اپنے زخمیوں کا دیکھ آنا تھا
(۴)
اُٹھے تھے سیرِ گل کو دیکھنا شوخی بہانے کی

ہماری سادگی تھی التفاتِ ناز پر مرنا
(۵)
ترا آنا نہ تھا ظالم مگر تمہید جانے کی

لکد کوبِ حوادث کا تحمل کر نہیں سکتی
(۶)
مری طاقت کہ ضامن تھی بتوں کے ناز اٹھانے کی

کہوں کیا خوبیِ اوضاعِ ابنائے زماں غالب
(۷)
بدی کی اُس نے جس سے ہم نے کی تھی بارہا نیکی

---

(۱) یعنی یا تو غمِ روزگار سے سر اٹھانے کی مہلت ہی نہیں ملتی اگر سر اٹھاتا بھی ہے تو تجھے یاد کرکے یاس بھری نگاہوں سے

فلک کو دیکھ لیتے ہیں۔

(۲) یعنی کاغذ جلاتے ہیں تو پرزہ پرزہ کرکے جلاتے ہیں اس بہانہ سے لفافہ کھلنے اور کسی لفظ پر نظر پڑ جانے کی توقع تھی وہ بھی ان کی قسمت سے جاتی رہی۔

(۳) "پرنیاں" حریر ایک ریشمی کپڑے کا نام ہے۔ بہت ممکن ہے کہ حریر میں آگ لپیٹی جاسکے اور کپڑے کو جلا کر آگ باہر نہ نکل سکے لیکن یہ ناممکن ہے کہ دل میں سوزِ غمِ عشق ہو اور چھپ جائے۔

(۴) بہار کی شوخی یہی کہ بسملوں اور مجروحوں کو دیکھنے کو سیرِ گلستاں سے تعبیر کیا۔

(۶) "لکد کوب" ٹھوکر اور ضرب۔ "ضامن" مدعی مراد ہے یعنی وہ طاقت جو بتوں کی ناز برداری کی مدعی تھی آپ حوادث روزگار کی معمولی ٹھوکریں برداشت نہیں کرسکتی۔

(۷) "اوضاع" اطوار۔ "ابنائے زماں" اہل زمانہ یعنی اہل زمانہ کے وضع و طریق کی خوبی کیا بیان کروں۔ ہمارے ساتھ یار رہا اُس شخص نے برائی کی ہے جس کے ساتھ ہم ہمیشہ نیکی کرتے رہے ہیں۔

حاصل سے ہاتھ دھو بیٹھ اے آرزو خرامی
دل جوشِ گریہ میں ہے ڈوبی ہوئی اسامی (۱)

اُس شمع کی طرح سے جس کو کوئی بجھا دے
میں بھی جلے ہوؤں میں ہوں داغِ ناتمامی (۲)

(۱) "آرزو خرامی" آرزو مندانہ جستجو۔ حاصل، اسامی رعایتِ الفاظ ہیں۔ "حاصل" پیداوار، محصول۔ "ڈوبی ہوئی اسامی" وہ مالگزار جو

تحصول ادا نہ کرسکے۔مطلب ہے کہ آرزومندانہ محبت میں نفع کچھ بھی نہیں۔ اس اسامی دل کو جوشِ گریہ ہی نے ڈبو دیا ہے (حالانکہ بارش پیداوار کے لئے مفید ہوا کرتی ہے)

(۲) بجھائی ہوئی شمع پر جلنے کا نشان (داغ) رہ جاتا ہے اور جلاتے ہی بجھا دینا گویا جلنا ناتمام کر دینا ہے۔ "جلے ہوؤں" کا استعارہ اُن لوگوں سے ہے جو آتشِ عشق میں جل کر فنا ہو چکے ہیں۔ مطلب ہے کہ آتشِ عشق سے جل کر بجھ گیا ہوں اچھی طرح جل بھی نہ سکا۔ کہ مرتبۂ فنا کو پہنچ جاتا۔ اور یہ داغِ ناکامی رہ گیا۔ میری مثال اُس شمع کی سی ہے جس کو کوئی جلا کر بجھا دے۔

کیا تنگ ہم ستم زدگاں کا جہان ہے	۱	جس میں کہ ایک بیضۂ مور آسمان ہے
ہے کائنات کو حرکت تیرے ذوق سے	۲	پرتو سے آفتاب کے ذرّے میں جان ہے
حالانکہ ہے یہ سیلیِ خارا سے لالہ رنگ	۳	غافل کو میرے شیشے پہ مے کا گمان ہے
کی اُس نے گرم سینۂ اہلِ ہوس میں جا	۴	آئے نہ کیوں پسند کہ ٹھنڈا مکان ہے
کیا خوب تم نے غیر کو بوسہ نہیں دیا	۵	بس چپ رہو ہمارے بھی منہ میں زبان ہے
بیٹھا ہے جو کہ سایۂ دیوارِ یار میں	۶	فرمانروائے کشورِ ہندوستان ہے
ہستی کا اعتبار بھی غم نے مٹا دیا	۷	کس سے کہوں کہ داغ جگر کا نشان ہے
۸	ہے بارے اعتمادِ وفاداری اس قدر غالب ہم اسمیں خوش ہیں کہ نامہربان ہے	

(۱) "جہان تنگ ہونا" بدقسمتی اور بدبختی کے معنوں میں آتا ہے۔ "بیضۂ مور" چیونٹی کا انڈا یعنی ہم ستم زدوں کا جہان اس قدر

تنگ ہوگیا ہے کہ آسمان بیضۂ مور معلوم ہوتا ہے۔ یا ہم اس قدر مجبور ہیں کہ چیونٹی کا انڈا جیسی حقیر ترین شے ہماری دنیا کے لئے آسمان ہے اور ہمارے ستانے کے لئے کافی ہے۔

(۲) "تیرے" کا اشارہ ذاتِ باری تعالیٰ کی جانب ہے دوسرا مصرعہ تمثیلی ہے۔

(۳) "شیشہ" دل سے اور "مے" خونِ دل سے استعارہ ہے۔ "خارا" (پتھر) سے سنگِ تفرقہ و ہجر مراد ہے۔ "سیلی" تھپیڑ۔ یہاں بمعنی ضرب۔ "لالہ رنگ" سرخ رنگ یا خونفشاں۔ "غافل" حسنِ بے مروت یا کج نظر۔ مطلب ہے کہ یہ خونفشانی سنگِ تفرقہ سے پیدا ہوگئی ہے۔ اور حسنِ بے پروا کو یہ گمان ہے کہ میرے دل میں خون موجود ہے۔

(۴) "ٹھنڈا مکان" اس دل سے استعارہ ہے جس میں سوزِ الفت نہ ہو۔ یہ محبوب پر طنز ہے، یعنی ہوس کی سرگرمی سوزِ عشق کے بالمقابل سرد ہے۔ گویا ان کا دل ٹھنڈا مکان ہے اور سرد مکان کو گرمی میں پسند کرتے ہیں۔ اس طرح یہ محبوب پر طنز کیا ہے کہ ٹھنڈا مکان پسند ہے۔

(۶) یعنی جس چیز کو سایۂ دیوارِ یار میں بیٹھنے کو جگہ مل گئی گویا وہ بادشاہِ ہند ہوگیا۔

(۷) یعنی اب اگر کسی سے کہوں کہ جگر کا نشان داغ ہے تو کس کو یقین آئے گا۔ گویا شدتِ غم سے اپنے وجود کا اعتبار بھی نہ رہا۔

(۸) یعنی اُن کی نامہربانی اس بنا پر ہے کہ انہیں ہم پر بھروسہ

ہو گیا ہے کہ ہم بہر حال وفادار رہیں گے۔

درد سے میرے ہے تجھ کو بیقراری ہائے ہائے
(۱)
کیا ہوئی ظالم تری غفلت شعاری ہائے ہائے

تیرے دل میں گر نہ تھا آشوبِ غم کا حوصلہ
(۲)
تو نے پھر کیوں کی تھی میری غمگساری ہائے ہائے

کیوں مری غمخوارگی کا تجھ کو آیا تھا خیال
(۳)
دشمنی اپنی تھی میری دوستداری ہائے ہائے

عمر بھر کا تو نے پیمانِ وفا باندھا تو کیا
(۴)
عمر کو بھی تو نہیں ہے پائداری ہائے ہائے

زہر لگتی ہے مجھے آب و ہوائے زندگی
(۵)
یعنی تجھ سے تھی اسے ناسازگاری ہائے ہائے

گلفشانی ہائے نازِ جلوہ کو کیا ہو گیا
(۶)
خاک پر ہوتی ہے تیری لالہ کاری ہائے ہائے

شرمِ رسوائی سے جا چھپنا نقابِ خاک میں
(۷)
ختم ہے اُلفت کی تجھ پر پردہ داری ہائے ہائے

خاک میں ناموسِ پیمانِ محبت مل گئے
(۸)
اُٹھ گئی دُنیا سے راہ و رسمِ یاری ہائے ہائے

ہاتھ ہی تیغ آزما کا کام سے جاتا رہا
(۹)
دل پہ اک لگنے نہ پایا زخمِ کاری ہائے ہائے

کس طرح کاٹے کوئی شب ہائے تارِ برشکال
(۱۰)
ہے نظر خو کردۂ اختر شماری ہائے ہائے

گوشِ مہجورِ پیام و چشمِ محرومِ جمال ایک دل تِس پر یہ ناامیدواری ہائے ہائے	(۱۱)	
	(۱۲)	عشق نے پکڑا نہ تھا غالبؔ ابھی الفت کا رنگ رہ گیا تھا دل میں جو کچھ ذوقِ خواری ہائے ہائے

(۱ تا ۳) معشوق کا مرثیہ ہے، جو شاید ان کے دردِ عشق میں ہلاک ہوگیا۔

(۴) یعنی تو نے تو عمر بھر کے لئے عہدِ وفا کیا لیکن عمر ہی کو وفا نہ ہو تو کوئی کیا کرے۔

(۵) "ناسازگاری" ناموافقت، بیوفائی۔ یعنی چونکہ زندگی نے تجھ سے بیوفائی کی اس لئے مجھے زندگی سے نفرت ہوگئی ہے۔

(۶) یعنی نازِ جلوہ کی گل فشانیوں کو کیا ہوگیا کہ اب خاک پر یا نہ خاک تیری لالہ کاریاں ہو رہی ہیں۔

(۷) یعنی یہ پردہ داری محبت سے ہے۔

(۸) "ناموس" راز۔

(۹) یعنی پورا زخمِ عشق میرے دل پر لگنے بھی نہ پایا کہ وہ کام تمام کرنے والا ہاتھ ہی نہ رہا۔

(۱۰) "برشکال" برسات یعنی برسات کی راتیں کس طرح کٹیں گی کیونکہ ہمیں تو اختر شماری میں شب ہائے ہجر کاٹنے کی عادت تھی۔

(۱۱) "مہجور" ہجراں زدہ یا دور، یعنی کان پیغامِ شوق سے اور آنکھ دیدار سے محروم ہیں۔ ایک دل اور اس پر ایسی ایسی مایوسیاں۔

(۱۲) دل میں جو ذوقِ رسوائی و خواری تھا وہ یوں ہی رہ گیا کیونکہ

ابھی اُلفت عشق کے درجہ تک نہ پہنچی تھی۔

سرگشتگی میں عالمِ ہستی سے یاس ہے	۱	تسکین کو دے نوید کہ مرنے کی آس ہے
لیتا نہیں مرے دلِ آوارہ کی خبر	۲	ابتک وہ جانتا ہے کہ میرے ہی پاس ہے
کیجے بیاں سرورِ تپِ غم کہاں تلک	۳	ہر مُو مرے بدن پہ زبانِ سپاس ہے
ہے وہ غرورِ حسن سے بیگانۂ وفا	۴	ہر چند اس کے پاس دلِ حق شناس ہے
پی جس قدر ملے شبِ مہتاب میں شراب	۵	اس بلغمی مزاج کو گرمی ہی راس ہے
۶	ہر اک مکان کو ہے مکیں سے شرف اسدؔ مجنوں جو مر گیا ہے تو جنگل اُداس ہے	

(۱) "سرگشتگی" جنون یعنی جوشِ جنون سے زندگی کی اُمید نہیں بلکہ مرنے کی توقع ہے۔ تسکین کو مبارک باد کہنا چاہیئے۔ کیونکہ مرنے پر سکون میسّر آجائے گا۔

(۲) یعنی میرے دلِ آوارہ کی خبر نہیں لیتا اُس کو یہ اطمینان ہے کہ دل میرے پاس ہوگا جب چاہیں گے لے لیں گے حالانکہ یہاں دل کا نشان تک باقی نہیں۔

(۳) "سپاس" تعریف و تمہید۔ شعر میں اظہار ایذا دوستی ہے۔

(۴) یعنی اگرچہ وہ عشاق کو مستحق کرم جانتا ہے لیکن غرورِ حسن مانع وفا ہے۔

(۵) شب ماہ کو بلغمی مزاج سے تعبیر کیا ہے۔ "راس" موافق۔

گر خامشی سے فائدہ اخفائے حال ہے	۱	خوش ہوں کہ میری بات سمجھنا محال ہے
کس کو سناؤں حسرتِ اظہار کا گلہ	۲	دل فردِ جمع و خرچِ زباں ہائے لال ہے
کس پردہ میں ہے آئینہ پرداز اے خدا	۳	رحمت کہ عذر خواہ لبِ بے سوال ہے

ہے ہے خدا نخواستہ وہ اور دشمنی	۴	اے شوقِ منفعل یہ تجھے کیا خیال ہے
مشکیں لباسِ کعبہ علی کے قدم سے جان	۵	نافِ زمین ہے نہ کہ نافِ غزال ہے
وحشت پہ میری عرصۂ آفاق تنگ تھا	۶	دریا زمین کو عرقِ انفعال ہے
۷	ہستی کے مت فریب میں آجائیو اسد عالم تمام حلقۂ دامِ خیال ہے	

(۱) اگر خامشی کا مقصد یہ ہے کہ راز اور حالِ دل پوشیدہ رہے تو میری باتیں بھی ایسی خاموشی سے کم نہیں کیونکہ ان کا مطلب ہی کوئی نہیں سمجھ سکتا۔

ہر گوش سخن شنو کچھ دل تو نہیں ہوتا
مطلب کوئی کیا سمجھے وارفتہ بیانی کا (تنہا)

(۲) پُرگوئی کو زبان لال ہونے سے تعبیر کرتے ہیں۔ یعنی حسرتِ اظہارِ شوق کا گلہ کس کو سناؤں دل میں بیشمار گویائیاں مضمر ہیں۔

(۳) "آئینہ پرداز" آرائش کرنے والا مراد ہے۔ "لب بے سوال" استعارہ ہے انسانِ مجبور سے اور یہ عالمِ جبر کی باتیں ہیں۔ آدمی بے اختیار ہے۔ مختار صرف خدا ہے۔ تاہم رحمت کی طلب سے شاعر نے ادبِ عبدیت کو قائم رکھا ہے۔ مطلب ہے کہ اے خدا انسانِ مجبور بزبانِ حال (لب بے سوال) عُذر خواہ ہے۔ اس وقت رحمت کس آئینہ خانہ میں آرایش کر رہی ہے ——— اگر آئینہ پردازی سے جلوہ نمائی مُراد ہے تو معنی یہ ہونگے کہ اے خدا تیری رحمت کہاں ہے جو ہنگامِ معاصی تو وہ تو بلا سوال ہمیں اپنا جلوہ دکھا دیتی تھی یعنی جس کے

بھروسہ پر گناہ کی ہمت ہوتی تھی۔

(۴) "اے شوق منفعل" کے بعد "ہو" مقدر ہے۔ یعنی اے شوق تجھے شرمانا چاہئے یہ کیا خیال ہے کہ وہ سب تجھے پائمال کر کے دشمن سے مل گئے ہیں۔

(۵) "مشکیں" مشک رنگ سیاہ۔ "نافۂ وغزال" سب عایات ہیں حضرت علیؑ کے قدم مبارک کی عظمت بیان کی ہے۔

(۶) "عرصۂ آفاق" میدانِ عالم یعنی میری وحشت کے بالمقابل وستِ ارض تنگ ہے۔ اور زمین کو اپنی اس تنگی پر شرمندگی ہے۔ چنانچہ اسی شرم و انفعال کا عرق سمندر ہے۔

(۷) یعنی ہستی کے فریب میں نہ آنا۔ سارا جہان دامِ خیال کا حلقہ ہے یا اس عالمِ اعتباری میں قیام و دوام کا وہم نہ رکھنا اصل میں یہ شعر مشہور فلسفی برکلے کے نظریۂ خیال پر مشتمل ہے جو وجودِ خارجی کا قائل نہیں ہے اور کائنات کو خیال و ذہن کی صورت آفرینیوں اور ہنگامۂ فرمائیوں پر محمول کرتا ہے۔ اس قسم کے اشعار حقیقتاً بڑے پایہ کے اشعار ہوتے ہیں جو حقایق علمی سے مطابقت رکھتے ہیں۔ بالکل ایسے ہی مضمون کا ایک شعر یہ ہے:۔

جز نام نہیں صورتِ عالم مجھے منظور
جز وہم نہیں ہستیِ اشیاء مرے آگے (غالب)

تم اپنے شکوہ کی باتیں نہ کھود کھود کے پوچھو	۱	حذر کرو مرے دل سے کہ اس میں آگ دبی ہے	
دلا یہ درد و الم بھی تو مغتنم ہے کہ آخر	۲	نہ گریۂ سحری ہے نہ آہِ نیم شبی ہے	

(۱) شکوہ و شکایت کو دبی ہوئی آگ سے تعبیر کیا ہے۔ کھود کھود کے پوچھنا محاورہ ہے یعنی بار بار اور تلاش و کاوش سے پوچھنا۔ "حذر کرو" پرہیز کرو، بچو۔ ایسا نہ کرو۔

(۲) "آخر" کا لفظ بہت بلیغ ہے یعنی آخر کار ایک دن یہی درد و الم جان لے لیں گے۔ نہ گریۂ سحر باقی رہیگا اور نہ آہِ نیم شبی۔

ایک جا حرفِ وفا لکھا تھا وہ بھی مٹ گیا (۱)
ظاہرا کاغذ ترے خط کا غلط بردار ہے

جی جلے ذوقِ فنا کی ناتمامی پر نہ کیوں (۲)
ہم نہیں جلتے نفس ہر چند آتش بار ہے

آگ سے پانی میں بجھتے وقت اٹھتی ہے صدا (۳)
ہر کوئی درماندگی میں نالے سے ناچار ہے

ہے وہی بدمستیٔ ہر ذرہ کا خود عذر خواہ (۴)
جس کے جلوہ میں زمیں تا آسماں سرشار ہے

مجھ سے مت کہہ تو ہمیں کہتا تھا اپنی زندگی (۵)
زندگی سے بھی مرا جی ان دنوں بیزار ہے

آنکھ کی تصویر سرنامہ پہ کھینچی ہے کہ تا (۶)
تجھ پہ کھل جاوے کہ اس کو حسرتِ دیدار ہے

(۱) "غلط بردار" اس آلہ کو کہتے ہیں جس سے حرف غلط مٹایا جاتا ہے۔

(۲) یعنی نفس آتش بار ہونے پر بھی ہمیں پھونک نہیں دیتا۔ اسی ناتمامیٔ ذوقِ فنا پر جی جلتا ہے۔ اسی کے ہم معنی اس سے پہلے یہ شعر گزر چکا ہے:-

جلتا ہے دل کہ کیوں نہ ہم اک بار جل گئے
اے ناتمامیٔ نفسِ شعلہ بار حیف (غالب)

(۳) "درماندگی" مصیبت۔ "نالہ سے ناچار ہے" یعنی نالہ کرنے کے لئے مجبور ہے۔

(۴) "ذرّہ" جلوہ کی رعایت سے محاورۃً استعمال کیا ہے۔ ذرّہ ذرّہ سے تمام کائنات مفہوم ہے۔ جیسے زمین تا آسمان سے سارا جہان مراد ہے۔ جلوہ کا مفہوم جمال ہے یہ صفتِ الٰہی رحمت وکرم اور احسان وغیرہ پر مشتمل ہے۔ "سرشار" معمور ہستی کی رعایت سے استعمال کیا گیا ہے یعنی ذرّہ ذرّہ کی بے عنوانی سیاہ کاری وبدقسمتی کا عذر خواہ اور عذر پذیر بھی وہی ہے جس کے جلوۂ جمال اور انوار رحمت وکرم سے سارا جہان معمور ہے۔

(۵) یعنی مجھ سے یہ نہ کہو کہ میں تم کو اپنی زندگی یا باعثِ زندگی کہا کرتا تھا۔ کیونکہ مجھ کو تو اب اپنی جان بھی عزیز نہیں رہی۔ زندگی سے بیزار ہو گیا ہوں۔ اب اس کے کہنے میں آپ سے نفرت کا احتمال ہوگا۔ یا اب اگر تم کو اپنی زندگی کہوں تو کوئی تعریف یا خوبی نہیں۔

پینس میں گذرتے ہیں جو کوچے سے مرے وہ	کندھا بھی کہاروں کو بدلنے نہیں دیتے

مری ہستی فضائے حیرت آباد تمنا ہے
جسے کہتے ہیں نالہ وہ اسی عالم کا عنقا ہے (۱)
خزاں کیا فصلِ گل کہتے ہیں کس کو کوئی موسم ہو (۲)

وہی ہم ہیں قفس ہے اور ماتم بال و پر کا ہے

وفائے دلبراں ہے اتفاقی۔ ورنہ اے ہمدم
(۳)
اثر فریادِ دل ہائے حزیں کا کس نے دیکھا ہے

نہ لائے شوخیٔ اندیشہ تابِ رنجِ نومیدی
(۴)
کفِ افسوس ملنا عہدِ تجدیدِ تمنا ہے

(۱) "فضا" ماحول۔ "حیرت آباد" یکسر حیرت۔ "تمنا" سے عشق مُراد ہے۔ "عنقا" یعنی معدوم۔ حیرت کا خاصہ ہے کہ حواس و حرکات میں سکوت و تعطل طاری ہو جاتے ہیں۔ اسی حواس و حرکات کے تعطل کو عدم سے تعبیر کیا ہے۔ پس یقیناً اس عدم کے اقتضا سے نالہ بھی عنقا یعنی معدوم ہونا چاہیئے۔ یعنی میری ہستی عشق کے عالم حیرت کی فضا ہے۔ اور عنقا اس فضا کا نالہ ہے۔

(۴) "شوخیٔ اندیشہ" خیال کی شوخی اور رنگینی۔ "عہدِ تجدید تمنا" از سرِ نو تمنا کرنے کا عہد یعنی شوخیٔ خیال سے ناامیدی کا رنج برداشت نہ ہو سکا۔ یا رنگینیٔ خیال کو مایوسی گوارا نہ ہوتی اور کفِ افسوس ملنے ہی سے عہدِ تجدید تمنا ظاہر ہونے لگا۔

رحم کر ظالم کہ کیا بودِ چراغِ کشتہ ہے
(۱)
نبضِ بیمارِ وفا دودِ چراغِ کشتہ ہے

دل لگی کی آرزو بے چین رکھتی ہے ہمیں
(۲)
ورنہ یاں بے رونقی۔ سودِ چراغِ کشتہ ہے

(۱) "بود" ہستی۔ دم۔ طاقت۔ بساط وغیرہ۔ "روح" جان کی

حقیقت نور ہے۔ چراغ بھی نورانیت میں مشترک ہے چنانچہ چراغ زندگی سے عام طور پر رُوح کو تعبیر کیا جاتا ہے یہاں بھی چراغ سے جان یا ہستی مُراد ہے۔ "کشتہ" شاعری کے مصطلحہ الفاظ میں سے ہے جس کے معنے عاشق کے ہوتے ہیں۔ مصرعہ ثانی میں چراغ کشتہ۔ اصل معنی میں استعمال ہوا ہے یعنی بُجھا ہوا چراغ۔ "دود" وہ دھواں مقصود ہے جو چراغ بُجھاتے وقت نکلتا ہے۔ اس دھوئیں کی حرکت خفیف غیر متواتر۔ اور غیر مسلسل ہوتی ہے۔ اور تھوڑی ہی دیر میں یہ دُھواں ختم ہو جاتا ہے اور حرکت وغیرہ سب فنا ہو جاتی ہیں۔ اس حرکت سے بیماروں کی حرکتِ نبض کی تشبیہ دی ہے اور نبض کی ایسی حرکت بیمار کے آخری وقت کی دلیل ہے اس نبض کو اصطلاح طب میں دودی کہا جاتا ہے۔ لیکن یہ دُود عربی سے ماخوذ ہے۔ عربی میں چھوٹے رینگنے والے کیڑوں کو دُود کہتے ہیں۔ یہاں یہ بات قابلِ غور ہے کہ مرنے والے کی نبض حرکت میں کیڑوں کے رینگنے سے زیادہ شباہت رکھتی ہے۔ یا دودِ چراغ کشتہ سے؟ کیا بلحاظ حرکت اور کیا بلحاظ حالت و انجام دُودِ چراغ کشتہ کی تشبیہ کیڑے کے رینگنے کے مقیاس سے زیادہ اشبہ اور مکمل ہے۔ اور یہ شاعر کی عدیم المثال صحت نظر ہے۔ کہ وہ شعر میں ایسی کامل تشبیہ دیدے جو اربابِ فن صدیوں کی مشق و نظر میں بہم نہ پہنچا سکے ہوں۔

(۲) "دل لگی" "محبت" "بیچین رکھتی ہے" یعنی ہنگامہ پرور رکھتی ہے

"یاں" ہمارے لئے کے معنی میں استعمال ہوا ہے۔ "سود" فائدہ بجھے ہوئے چراغ پر بے رونقی برستی ہے۔ لیکن یہ بے رونقی کچھ چراغ کے لئے مفید ہے کہ جلنے سے بچا ہوا ہے مطلب ہے کہ محبت کی آرزو سے ہم میں چہل پہل تو رہتی ہے۔ لیکن یہ چہل پہل اور ہنگامہ آرائی ہمارے لئے مفید نہیں بلکہ چراغِ کشتہ کی طرح ہمارے لئے یہی بے رونقی وافسردگی مفید ہے کہ سوزِ غم سے جلنے میں کچھ آرام نہیں بلکہ بے چینی ہی رہتی ہے۔

چشمِ خوباں۔خاموشی میں نوا پرداز ہے	۱	سرمہ تو کہوے کہ دُودِ شعلۂ آواز ہے
پیکرِ عشاق سازِ طالعِ ناساز ہے	۲	نالہ گویا گردشِ سیارہ کی آواز ہے
دست گاہِ دیدۂ خونبارِ مجنوں دیکھنا	۳	یک بیاباں جلوۂ گل فرشِ پا انداز ہے

(۱) "نوا پرواز" سخن پرواز۔ گویا آنکھوں کے عشوے اور غمزے گویائی ہیں۔ آواز باعتبارِ پرواز حرکتاً شعلہ سے مشابہ ہے پھر حسینوں کی مخمور اور شرابی آنکھوں کو بھی شعلہ سے مشابہت ہے۔ شعلۂ آواز کی ترکیب نہایت اعلیٰ ہے۔ مطلب ہے کہ حسینوں کی آنکھیں خاموشی میں عشوہ واشارات سے گویا ہوا کرتی ہیں اور سرمہ کو اسی گویائی کے شعلہ کا دھواں سمجھنا چاہئے۔

(۲) "پیکرِ عشاق" عاشقوں کا جسم یا وجود۔ "ساز" باجہ۔ "طالعِ ناساز" بدنصیبی۔ گردشِ سیارہ بھی طالعِ نارسا کے مُرادف ہے۔ اور اُردو میں بھی یہ محاورہ مانوس ہے۔ مطلب ہے کہ عاشقوں کا وجود ایک سازِ بدنصیبی ہے اور نالہ گردشِ سیارہ کی آواز ہے

یا ساز بدنصیبی کا نغمہ ہے۔

(۳) "دستگاہ" کمال" دیدۂ خونبار" چشم خونفشاں "جلوۂ گل" رنگ خون کی تشبیہ ہے۔ "فرش پا انداز" وہ فرش جس پر آمد و رفت ہو یعنی مجنوں کی چشم خونفشاں کا کمال تو دیکھو کہ سارے بیابان میں جلوۂ گل کا فرش معلوم ہوتا ہے۔

عشق مجھ کو نہیں وحشت ہی سہی	۱	میری وحشت۔ تری شہرت ہی سہی
قطع کیجے نہ تعلق ہم سے	۲	کچھ نہیں ہے تو عداوت ہی سہی
میرے ہونے میں ہے کیا رُسوائی	۳	اے وہ مجلس نہیں خلوت ہی سہی
ہم بھی دشمن تو نہیں ہیں اپنے	۴	غیر کو تجھ سے محبت ہی سہی
اپنی ہستی ہی سے ہو جو کچھ ہو	۵	آگہی گر نہیں غفلت ہی سہی
عمر ہر چند کہ ہے برق خرام	۶	دل کے خوں کرنے کی فرصت ہی سہی
ہم کوئی ترک وفا کرتے ہیں	۷	نہ سہی عشق مصیبت ہی سہی
کچھ تو دے اے فلک ناانصاف	۸	آہ و فریاد کی رخصت ہی سہی
ہم بھی تسلیم کی خو ڈالیں گے	۹	بے نیازی تری عادت ہی سہی

یار سے چھیڑ چلی جائے اسد
۱۰
گر نہیں وصل تو حسرت ہی سہی

(۱) یعنی دیوانگی ہی سہی۔ میرے عشق سے آپ کی شہرت تو ہے۔

(۲) اسی مضمون کا شعر پہلے گذر چکا ہے۔

وارستہ اس سے ہیں کہ محبت ہی کیوں نہ ہو
کیجے ہمارے ساتھ عداوت ہی کیوں نہ ہو

(۳) "رسوائی" بمعنی افشائے راز۔

(۴) یعنی خیر آپ ہی سچے ہیں کہ غیر کو آپ سے محبت ہے مگر یہ کہئے کہ ہمیں اپنے ساتھ دشمنی ہے کہ تم سے محبت نہیں رکھتے کیونکہ زندگی تو تم سے وابستہ ہے۔ پھر بھی اگر تم سے محبت نہ ہو تو اس کے یہ معنی ہوں گے کہ ہمیں اپنی جان اور اپنے آپے سے دشمنی ہے۔ اس سے قبل تقریباً اسی مفہوم کا شعر گذر چکا ہے:۔

کیونکر اس بت سے رکھوں جان عزیز کیا نہیں ہے مجھے ایمان عزیز

(۵) عرفان و سلوک کی تعلیم کے واقعی صرف یہی دو طریقے اور اصول ہیں۔ یعنی یا اپنے نفس کا علم یا نفس و نفسانیت فراموشی جن کو استاد نے آگہی اور غفلت کے الفاظ میں بیان کیا ہے اور پہلے مصرعہ میں جو کہا ہے کہ اپنی ہستی ہی سے ہو تا ہے۔ سچ کہا ہے یہ شعر پورے کلیہ عرفان کی وسعت و بلاغت رکھتا ہے یعنی یا اپنے نفس کو پہچان لو یا اس سے قطع نظر کر لو۔

(۶) یعنی عمر اگرچہ جلد گذر جانے میں برق خرام ہے لیکن اتنی مہلت بھی دل خون ہو جانے کے لئے کافی ہے۔

(۷) یعنی ترکِ وفا نا ممکن ہے عشق کا کوئی نتیجہ موافق نکلے یا نہ نکلے مصیبت ہی سہی۔

(۸) "رخصت" اجازت یعنی فریاد ہی دل کھول کر کر لینے دے۔

(۹) غرضکہ شکوہ اور گلہ نہ کریں گے (شعر ادبی اعجاز کے مرتبہ تک پہنچ گیا ہے)

(۱۰) کیونکہ آخر زندگی کے لئے کوئی نہ کوئی شغل چاہئے۔

ہے آرمیدگی میں نکوہش بجا مجھے	۱	صبح وطن ہے خندۂ دنداں نما مجھے
ڈھونڈے ہے اس مغنی آتش نفس کو جی	۲	جس کی صدا ہو جلوۂ برق فنا مجھے
مستانہ طے کروں ہوں رہِ وادیٔ خیال	۳	تا بازگشت سے نہ رہے مدعا مجھے
کرتا ہے بس کہ باغ میں تو بے حجابیاں	۴	آنے لگی ہے نکہتِ گل سے حیا مجھے
کھلتا کسی پہ کیوں مرے دل کا معاملہ	۵	شعروں کا انتخاب نے رسوا کیا مجھے

(۱) "آرمیدگی" آرام طلبی۔ "نکوہش" ملامت۔ صبح کو خندہ سے تشبیہ کرتے ہیں۔ یہاں نکوہش کے ثبوت کے خندۂ دنداں نما مضحکہ یا خندۂ تحقیر و ملامت لکھا ہے۔ مطلب ہے کہ آرام طلبی میں واقعی مجھے ملامت کرنا چاہیئے۔ کیونکہ میں تو بیاباں نوردی اور غربت کے لئے پیدا ہوا ہوں۔ پس ہر صبح وطن میرے لئے خندۂ ملامت ہے۔

(۲) "مغنی" گانیوالا۔ "آتش نفس" سوز و گداز کی طرف اشارہ ہے۔ جلوۂ برق فنا۔ نظارۂ برق فنا۔ یا نظارۂ مرتبہ فنا فی الذات مفہوم ہے۔ یعنی ایسے پرسوز و گداز مغنی کی آرزو ہے جس کے ہر نفسِ آتشین میں جلوۂ برق فنا نظر آنے لگے۔

(۳) "مستانہ" بے خودی یا بے خبری کے ساتھ یا عالم فراموشی کے ساتھ۔ "بازگشت" واپسی یعنی خیالستان یا عالم خیال میں مستانہ گذرتا ہوں۔ تاکہ واپسی سے سروکار نہ رہے اور ترقی کے بعد روبہ تنزل نہ ہوں۔

(۴) یعنی مجھے انفعال ہے کہ تو کہاں بے حجابیاں کرتا ہے۔

(۵) یعنی میرے اشعار کا انتخاب ہونے لگا اور ان اشعار میں میری

داستانِ عشق مصرعی -

زندگی اپنی جب اس شکل سے گذری غالب	۱	ہم بھی کیا یاد کریں گے کہ خدا رکھتے تھے

(۱) "اس شکل سے" اس انداز سے اس حال سے - شاعر اس شعر میں مایوسی کے ساتھ اپنی بدحالی کی طرف توجہ دلاتے ہوئے مراحم کی حسرت کرتا ہے -

اس بزم میں مجھے نہیں بنتی حیا کیے	۱	بیٹھا رہا اگرچہ اشارے ہوا کیے
دل ہی تو ہے سیاستِ درباں سے ڈر گیا	۲	میں اور جاؤں در سے ترے بن صدا کیے
رکھتا پھروں ہوں خرقہ و سجادہ رہنِ مے	۳	مدت ہوئی ہے دعوتِ آب و ہوا کیے
بے صرفہ ہی گذرتی ہے ہو گرچہ عمرِ خضر	۴	حضرت بھی کل کہیں گے کہ ہم کیا کیا کیے
مقدور ہو تو خاک سے پوچھوں کہ اے لئیم	۵	تو نے وہ گنج ہائے گرانمایہ کیا کیے
کس روز تہمتیں نہ تراشا کیے عدو	۶	کس دن ہمارے سر پہ نہ آرے چلا کیے
صحبت میں غیر کی نہ پڑی ہو کہیں یہ خو	۷	دینے لگا ہے بوسہ بغیر التجا کیے
ضد کی ہے اور بات مگر خو بری نہیں	۸	بھولے سے اُس نے سینکڑوں وعدے وفا کیے
۹	غالب تمہیں کہو کہ ملے گا جواب کیا مانا کہ تم کہا کیے اور وہ سُنا کیے	

(۱) یعنی کچھ ایسی مجبوری ہے کہ اُن کی بزم میں مجھے غیرت ہی نہیں آتی - اور وہاں یہ کیفیت تھی کہ کبھی کسی بات پر اُنہوں نے اغیار کو خاموشی کا اشارہ کیا کہ یہ بیٹھے ہوئے ہیں چُپ رہو کبھی یہ اشارہ ہوا کہ یہ کون ہیں - کیوں آ گئے ہیں - جاتے کیوں نہیں غرضکہ سینکڑوں اشارے ہوتے رہے اور مجھ سے اُٹھا نہ گیا -

(۲) "سیاست" انتظامِ ملک - یہاں خوف مراد ہے -

(۳) "خرقہ" لباسِ فقر "سجادہ" مصلّیٰ "رہن" ہے "شراب کے لئے رہن" "دعوتِ آب و ہوا" دعوتِ موسمِ بہار۔

(۴) "بے صرفہ" بے فائدہ۔ فضول۔ یعنی اس دُنیا میں کتنی ہی عمر کیوں نہ ہو بے نتیجہ ہی گذر جاتی ہے۔ حضرت خضر بھی باوجود اتنی عمر کے پچھتا ئیں گے ضرور کہ افسوس کچھ نہ کیا۔

(۵) "لئیم" "لامت" سے بنا ہے جس کے معنی ملامت شدہ یا بیچارہ ہیں بدبخت کے ہیں۔ "گنج ہائے گرانمایہ" سے قابلِ قدر اور قابلِ تحسین ہستیاں مراد ہیں۔ یعنی خاک سے پوچھو کہ وہ درونِ عالمِ وجود کہاں چلے گئے۔

(۶) یعنی ضد سے وہ خلافِ عادت کرتا تھا۔ جب تم یاد نہ رہی تو حسبِ عادت سینکڑوں وعدے وفا کئے۔

(۷) یہ شعر بھی قریب المضمون ہے یعنی بیانِ لفظی جواب نہیں ہے کہ

تم ان کے وعدے کا ذکر ان سے کیوں کرو غالب
یہ کیا کہ تم کہو اور وہ کہیں کہ یاد نہیں

رفتارِ عمر قطعِ رہِ اضطراب ہے	۱	اس سال کے حساب کو برق آفتاب ہے
مینائے مے ہے سروِ نشاطِ بہار سے	۲	بالِ تدرو جلوۂ موجِ شراب ہے
زخمی ہوا ہے پاشنہ پائے ثبات کا	۳	نے بھاگنے کی گوں نہ اقامت کی تاب ہے
جادادِ بادہ نوشیِ رنداں ہے شش جہت	۴	غافل گماں کرے ہے کہ گیتی خراب ہے
نظارہ کیا حریف ہو اُس برقِ حسن کا	۵	جوشِ بہار جلوے کو جس کے نقاب ہے
میں نامراد دل کی تسلی کو کیا کروں	۶	مانا کہ تیرے رخ سے نگہ کامیاب ہے
گزرا اسدؔ مسرتِ پیغامِ یار سے	۷	قاصد پہ مجھ کو رشکِ سوال و جواب ہے

(۱) عمر کی رفتار ایسی ہے جیسے کوئی اضطراب و بے چینی میں جلد جلد راستہ طے کر رہا ہو۔ اور عمر کے سال کے حساب کے لئے آفتاب گویا برق ہے۔ یا برق آفتاب ہے۔

(۲) "مینائے مے" صراحی ہے۔ اسی رعایت سے نشاط اضافہ کیا ہے "بال تدرو" بادل سے استعارہ ہے۔ جلوۂ مے کو بادل سے مشابہہ کہا گیا ہے۔ یعنی مینا اگر سرو ہے تو موج شراب گھٹا۔

(۳) "پاشنہ" ایڑی "پائے ثبات" ثابت قدمی۔ پائے استقلال "اقامت" قیام یا قائم کرنا۔ یعنی یہ راہ عشق کچھ ایسی دشوار ہے کہ نہ بھاگا جاتا ہے اور نہ ٹھیرا جاتا ہے۔ بس ایڑیاں رگڑنی پڑتی ہیں اور پائے استقلال زخمی ہوتا رہتا ہے۔

(۴) رندوں سے مراد بادہ مستان عشق الٰہی ہیں "شش جہت" آفاق۔ دنیا۔ گیتی۔ یعنی دنیا زندان عشق ہی کی جا داد ہے لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ ان کی وجہ سے زمانہ خراب ہے۔

(۵) "نظارہ" طاقت دیدار "حریف" مقابل۔ بہار کے لوازم میں سے ابر بھی ہے۔ اسی رعایت سے حسن کی توصیف برق سے کی گئی ہے۔ استاد کا شعر ہے:۔

لطافت بے کثافت جلوہ پیدا کر نہیں سکتی
چمن زنگار ہے آئینۂ باد بہاری کا

یہاں بھی جوش بہار اسی قسم کا نقاب ہے جیسا آئینۂ باد بہاری کا زنگار چمن تھا۔

(۶) یعنی دیدار سے آنکھوں کو تو سکون ہے لیکن دل کی تسلی محض دیدار

سے نہیں ہوتی۔

(۷) "گذرا" "باز آیا" کے معنی میں استعمال ہوا ہے یعنی مجھے قاصد پر اُن سے ہمکلامی کا رشک ہے اس لئے میں پیغام سے ہی گذرا۔

---

(۱)
دیکھنا قسمت کہ آپ اپنے پہ رشک آجائے ہے
میں اُسے دیکھوں بھلا کب مجھ سے دیکھا جائے ہے

(۲)
ہاتھ دھو دل سے یہی گرمی گر اندیشہ میں ہے
آبگینہ تندیٔ صہبا سے پگھلا جائے ہے

(۳)
شوق کو یہ لت کہ ہر دم نالہ کھینچے جائیے
دل کی وہ حالت کہ دم لینے سے گھبرا جائے ہے

(۴)
غیر کو کیونکر وہ یا رب منع گستاخی کرے
گر حیا بھی اُس کو آتی ہے تو شرما جائے ہے

(۵)
دورِ چشم بد تری بزم طرب سے واہ واہ
نغمہ ہو جاتا ہے واں گر نالہ میرا جائے ہے

(۶)
گرچہ ہے طرزِ تغافل پردہ دارِ رازِ عشق
پر ہم ایسے کھوئے جاتے ہیں کہ وہ پا جائے ہے

(۷)
اُس کی بزم آرائیاں سن کر دلِ رنجور یاں
مثلِ نقشِ مدعائے غیر بیٹھا جائے ہے

(۸)
ہو کے عاشق وہ پری رخ اور نازک بن گیا
رنگ کھلتا جائے ہے جتنا کہ اُڑتا جائے ہے

(۹)
نقش پر اُس کے مصور کو بھی کیا کیا ناز ہیں
کھینچتا ہے جس قدر اُتنا ہی کھنچتا جائے ہے

سایہ میرا مجھ سے مثل دود بھاگے ہے اسدؔ
پاس مجھ آتش بجاں کے کس سے ٹھہرا جائے ہے

(۱) انتہائے لذت دید میں ایک وقت ایسا بھی آتا ہے کہ خود پر رشک آنے لگے۔

(۲) "گرمیٔ اندیشہ" گرمیٔ خیال۔ جوشِ خیال۔ مصرعہ گرمیٔ خیال کی تشبیہ صہبا (شراب) سے دی ہے "تندی" تیزی اور اس لفظ کی رعایت سے جوشِ خیال یا گرمیٔ خیال لاتے ہیں۔ آبگینہ شیشۂ دل سے استعارہ ہے۔ مطلب ہے کہ جس طرح صہبا سے شیشے کے پگھلنے کا احتمال ہے اسی طرح اگر یہی جوشِ خیال ہے تو دل بھی خون ہو کر بہہ جائے گا۔

(۳) یعنی شوق کا تقاضہ ہے کہ پیہم نالہ کھینچے جاؤں اور دل کی وہ الجھن کی سی کیفیت ہے کہ دم گھٹا جاتا ہے۔

(۴) "شرما جانا" - شرمندہ ہونا۔

(۵) یعنی نالہ سے بھی کوئی ہمدردی نہیں ہوتی اور بزم طرب کے جوش میں اس کو نغمہ ہی سمجھا جاتا ہے۔ خدا تیری بزم کو نظر بد سے بچائے۔

(۶) "طرزِ تغافل" اندازِ بیگانگی۔ یعنی ہمارے طرزِ تغافل سے ہمارا عشق چھپا ہوا ظاہر ہونے لگتی ہے اور ہم تغافل میں کچھ ایسے کھوئے جاتے ہیں کہ ان کو ہمارا اصل حال کا گمان ہوتا ہے اور وہ سمجھ جاتے ہیں کہ ضرور کچھ بات ہے۔

(۷) "نقش مدعا بیٹھنا" مستقل اور دیرپا کامیابی کے معنوں میں

آتا ہے نقش بیٹھنے سے اپنے دل کے بیٹھنے کی تشبیہ دی ہے اور دل کا بیٹھنا محاورہ ہے۔ بمفہوم مایوسی۔

(۸) یعنی ضعفِ عشق سے نزاکت بڑھ گئی ہے "رنگ اُڑنا" آثارِ ضعف میں سے ہے۔ اور رنگ سفید پڑ جانا بھی علامتِ ضعف ہے۔ رنگ کھانا محاورہ میں گورے ہو جانے کے معنی میں مستعمل ہے۔ یہی تمام رعایات شعر میں ہیں۔

(۹) "کھینچتا ہے" یعنی تصویر یا نقش صورت کھینچتا ہے۔ "کھنچتا جاتا ہے" یعنی اتراتا اور غرور کرتا جاتا ہے۔

(۱۰) سایہ اور دود (دھواں) میں تشبیہ ہے "آتش بجاں" جس کی جان آتشِ غم میں مبتلا ہو۔ مصیبت کی بیکسی بیان کرنے میں سایہ کی علیحدگی کی تمثیل عام اور مشہور ہے۔ یہاں آگ سے دھوئیں کی علیحدگی سے سایہ کے جدائی کی تشبیہ دی گئی ہے۔

گرم فریاد رکھا شکلِ نہالی نے مجھے	۱	تب اماں ہجر میں دی بردِ لیالی نے مجھے
نسیہ و نقدِ دو عالم کی حقیقت معلوم	۲	لے لیا مجھ سے مری ہمتِ عالی نے مجھے
کثرت آرائی وحدت ہے پرستارئ وہم	۳	کر دیا کافر ان اصنامِ خیالی نے مجھے
ہوسِ گل کا تصور میں بھی کھٹکا نہ رہا	۴	عجب آرام دیا بے پر و بالی نے مجھے

(۱) "شکلِ نہالی" نقوش و تصاویرِ قالین۔ "برد" سردی "لیالی" لیل (رات) کی جمع ہے۔

(۲) "نسیۂ عقبیٰ اور نقدِ دنیا" یعنی منافع موجود و آئندہ سے میری ہمتِ عالی نے مجھے مستغنی کر دیا۔ بایں نقدِ دنیا اور عقبیٰ کے ادہار پر فروخت نہ ہوا۔ بلکہ ہمتِ عالی نے بمعاوضۂ استغنا مجھے خرید لیا۔

(۳) کثرت آرائی وحدت ۔ یعنی وحدت کو کثرت سمجھنا اوہام پرستی اور کفر ہے کیونکہ یہ سب وہم و خیال کے بت ہیں ۔ بلکہ کثرت کو وحدت سمجھنا چاہیئے ۔

(۴) اسکے پردہ بالی " مایوسی یا بے طاقتی ۔

کارگاہ ہستی میں لالہ داغ ساماں ہے	۱	برق خرمنِ راحت خونِ گرم دہقاں ہے
غنچہ تا شگفتن ہا برگ عافیت معلوم	۲	باوجود دل جمعی خوابِ گل پریشاں ہے
ہم سے رنج بیتابی کس طرح اٹھایا جائے	۳	داغ پشت دست عجز شعلہ خس بدنداں ہے

(۱) "داغ ساماں" مثلِ انجم انجمن ۔ وہ شخص کہ داغ جس کا سرمایہ وساماں ہو ۔ موجودیت لالہ کی منحصر نمائش داغ پر ہے ۔ ورنہ رنگ تو اور پھولوں کا بھی لال ہوتا ہے ۔ پس اس کے یہ سمجھیے کہ پھول کا درخت یا غلہ جو کچھ بویا جاتا ہے ۔ دہقان کو جوتنے بونے اور پانی دینے میں مشقت کرنی پڑتی ہے ۔ اور ریاضت میں لہو گرم ہوجاتا ہے ۔ مقصود شاعر کا یہ ہے کہ وجود محض رنج و عنا ہے ۔ مزارع کا وہ لہو جو کشت و کار میں گرم ہوا ہے وہ لالہ کی راحت کے خرمن کا برق ہے ۔ حاصل موجودیت داغ اور داغ مخالف راحت اور صورت رنج ہے " (از عود ہندی)

(۲) "کلی جب تک نہ کھلے بصورت قلب صنوبری نظر آتی اور جبتک پھول بنے برگ عافیت معلوم ۔ یہاں معلوم بمعنی معدوم ہے اور برگ عافیت بمعنی مایہ آرام مصرعہ "برگ عیش مگو، خویش برگ اور ہمہ برگ بمعنی ساز و ساماں " خواب گل " شخصیت گل باعتبار خموشی و یکجا ماندگی پریشانی ظاہر ہے ۔ یعنی شگفتگی

دہی پھول کی پنکھڑیوں کا بکھرا ہوا ہونا۔ غنچہ بصورتِ دل جمع ہے باوصفِ جمعیت دل گل کو خواب پریشان نصیب ہے۔"

(از عود ہندی)

(۳) "پشتِ دست" صورتِ عجز۔ اور "خس بدنداں" "و "کاہ بدنداں گرفتن" بھی اظہارِ عجز ہے۔ پس جس عالم میں کہ داغ نے پشت دست زمین پر رکھ دی ہو اور شعلے نے تنکا دانتوں میں لیا ہو ہم سے رنج و اضطراب کا تحمل کس طرح ہو۔ مطلب ہے کہ اس رنج کے برداشت کرنے کی ہم میں تاب و طاقت نہیں ہے اور یہ ہمیں ہلاک کر دے گا (از عود ہندی)

اُگ رہا ہے در و دیوار سے سبزہ غالبؔ	۱	ہم بیاباں میں ہیں اور گھر میں بہار آئی ہے

(۱) گھر میں گھاس اُگنا ویرانی کی دلیل ہے۔ گویا جب گھر میں یہ بہار ہو تو گھر بیابان ہے اور ہم کو گھر میں بیابان کا مزہ آ سکتا ہے پھر ناحق ہم بیابان میں ہیں۔

سادگی پر اُس کی مر جانے کی حسرت دل میں ہے
(۱)
بس نہیں چلتا کہ پھر خنجر کفِ قاتل میں ہے

دیکھنا تقریر کی لذت کہ جو اُس نے کہا
(۲)
میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے

گرچہ ہے کس کس برائی سے ولے بایں ہمہ
(۳)
ذکر میرا مجھ سے بہتر ہے کہ اُس محفل میں ہے

بس ہجومِ ناامیدی خاک میں مل جائے گی
(۴)
یہ جو اک لذت ہماری سعیٔ بے حاصل میں ہے

رنج رہ کیوں کھینچے، واماندگی کو عشق ہے
اُٹھ نہیں سکتا، ہمارا جو قدم منزل میں ہے (۵)

جلوہ زارِ آتشِ دوزخ ہمارا دل سہی
فتنۂ شورِ قیامت کس کے آب و گل میں ہے (۶)

ہے دلِ شوریدۂ غالبؔ طلسمِ پیچ و تاب
رحم کر، اپنی تمنا پر، کہ کس مشکل میں ہے (۷)

(۱) یعنی حسرت تو محض ان کی سادگی پر مرنے کی ہے۔ اور خنجر سے ہلاک ہونے میں وہ مزا کہاں لیکن ان کے ہاتھ میں خنجر ہے اب بے بسی ہے۔

(۲) تقریر کا کمال ہے کہ دل لگتی بات کی جائے۔

(۳) "سعیِ بے حاصل" وہ کوشش جس کا کوئی نتیجہ نہ ہو۔ یا کامیاب نتیجہ نہ نکلے اور ظاہر ہے کہ مایوسی کی بیکاری سے سعیِ بیحاصل غنیمت ہے۔ اور افسردگی کی بے دلی سے خام خیالی ہی بہتر ہے۔

(۴) "واماندگی" تھکن۔ یعنی واماندگی، رنجِ راہ روی کیوں گوارا کرے اس کو ہمارے قدم سے عشق ہے۔ اور اس لئے قدم اُٹھ نہیں سکتا۔

(۵) "جلوہ زار" معمور۔ "آب و گل" خمیر، خلقت، جبلت۔ دوزخ و قیامت کی رعایت ظاہر ہے۔ معشوق کے قامت کی تعریف قیامت سے اور رفتار کی فتنۂ قیامت یا فتنۂ حشر وغیرہ سے مشہور ہے۔ آتش سے سوزِ عشق مراد ہے اور اسی تذکرہ و اظہارِ حال سوز پر معشوق نے طنزاً یا خفگی سے کہا ہوگا کہ آپکے دل میں تو

دوزخ کی آگ بھری ہے۔ اس پر عاشق اسی قسم کا سوال الزامی کرتا ہے کہ اچھا ہمارا دل آتش دوزخ سے معمور سہی۔ لیکن یہ تو کہئے کہ فتنۂ شور قیامت کس کے خمیر و جبلت میں ہے۔

(۴) "شوریدہ" بے چین۔ مضطرب۔ "طلسم" جادو کا بنا ہوا عجیب و غریب مکان جس کی بنا اشکال نجوم سے ہوئی ہو۔ اور جس کا اثر یہ ہے کہ کوئی وہاں سے نکل نہ سکتا ہو۔ عاشق کے دل میں جو تمنا ہوتی ہے وہ چونکہ معشوق سے متعلق ہوتی ہے اس لئے گویا اسی کی تمنا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ میرا دل شوریدہ طلسم پیچ و تاب ہے اور تیری تمنا اس پیچ و تاب میں پھنسی ہوئی ہے تو اپنی تمنا پر رحم کر کہ اس کشمکش سے نکل جائے۔

دل سے تری نگاہ جگر تک اتر گئی	۱	دونوں کو اک ادا میں رضامند کر گئی
شق ہو گیا ہے سینہ خوشا لذت فراغ	۲	تکلیف پردہ داری زخم جگر گئی
وہ بادۂ شبانہ کی سرمستیاں کہاں	۳	اٹھیے بس اب کہ لذت خواب سحر گئی
اڑتی پھرے ہے خاک مری کوئے یار میں	۴	بارے اب اے ہوا ہوس بال و پر گئی
دیکھو تو دل فریبی انداز نقش پا	۵	موج خرام یار بھی کیا گل کتر گئی
ہر بوالہوس نے حسن پرستی شعار کی	۶	اب آبروئے شیوۂ اہل نظر گئی
نظارہ نے بھی کام کیا واں نقاب کا	۷	مستی سے ہر نگہ ترے رخ پر بکھر گئی
فردا و دی کا تفرقہ یک بار مٹ گیا	۸	کل تم گئے کہ ہم پہ قیامت گزر گئی
۹	مارا زمانہ نے اسداللہ خاں تمہیں وہ ولولے کہاں، وہ جوانی کدھر گئی	

(۱) شعرا کے یہاں نگاہ کو تیر سے تعبیر کرتے ہیں اور اسی تیر کے

آرزومند۔ دل و جگر دونوں مسلم ہیں۔

(۲) یعنی زخم جگر کے چھپانے اور پردہ رکھنے میں سینہ کو بڑی تکلیف ہوتی تھی کیونکہ زخم کے درد سے تنفس میں اُلجھن اور گھٹن تھی جس سے سینہ پر بار تھا۔ اب سینہ شق ہو گیا اور زخم جگر کی پردہ داری کی تکلیف سے کیسی اچھی فراغت حاصل ہو گئی۔

(۳) شراب کی مستی اور سرور میں نیند کی سی لذت بھی ہوتی ہے۔ خمار اور تار میں بے چینی ہوتی ہے اس لئے نیند کا لطف باقی نہیں رہتا۔ مطلب ہے کہ بادۂ شبانہ کی سرمستی اب باقی نہیں ہے۔ اور خواب سحر کی لذت بھی اسی وقت تک تھی جب تک نشہ تھا۔ اب وہ لذت کہاں۔

(۴) اس شعر میں "اب" کا لفظ مخصوص ہے یعنی اب مرنے کے بعد۔ مطلب ہے کہ زندگی میں ہم اُن کے کوچہ تک پہنچ ہی نہ سکے بال و پر کی ہوس تھی کہ اُڑ کر پہنچ جائیں۔ ہوا بھی ہمیں نہ پہنچا سکتی تھی۔ اب خاک ہونے پر ہماری خاک اُن کے کوچہ میں اُڑتی پھرتی ہے۔

(۵) گل کترنا اور شگوفہ چھوڑنا مرادف ہیں۔ یعنی فتنہ پیدا کرنا اور یہاں لفظی طور پر واقعی گل تراشی مراد ہے۔ چونکہ نقش پا کو یار گل سے تشبیہ دیتے ہیں مدوح اور خرام میں بھی حرکت اور روانی دونوں ہیں اور یہاں مشبہ اور مشبہ بہ کو ساتھ ساتھ بیان کردیا ہے۔ حسن خرام یا خوبی خرام ظاہر ہے۔

(۶) "بوالہوس" اہل خواہش و غرض۔ اہل نظر۔ عاشقان صادق۔

(۷) "خیرگی" نگاہ کو مستی نظر سے تعبیر کیا ہے اور خیرگی جب پیدا ہوتی ہے تو نظر اپنا کام نہیں کر سکتی۔ آنکھوں پر پردہ سا معلوم ہوتا ہے اسی پردہ کو اُستاد نے معشوق کے رُخ کا نقاب بیان کیا ہے۔

(۸) "فردا" آنے والی کل۔ قیامت کو بھی فردائے قیامت کہتے ہیں "دی" گذشتہ کل مطلب ہے کہ تمہارے جانے سے جو قیامت کل آنے والی تھی وہ کل گذر چکی۔ جو کچھ ہونا تھا وہ ہو چکا اب ماضی و مستقبل کا کوئی قصہ ہی نہ رہا۔

تسکیں کو ہم نہ روئیں جو ذوقِ نظر ملے	۱	حورانِ خلد میں تری صورت مگر ملے
اپنی گلی میں مجھکو نہ کر دفن بعدِ قتل	۲	میرے پتے سے خلق کو کیوں تیرا گھر ملے
ساقی گری کی شرم کرو آج، ورنہ ہم	۳	ہر شب پیا ہی کرتے ہیں مے جسقدر ملے
تجھ سے تو کچھ کلام نہیں لیکن اے ندیم	۴	میرا سلام کہیو، اگر نامہ بر ملے
تم کو بھی ہم دکھائیں کہ مجنوں نے کیا کیا	۵	فرصت کشاکشِ غمِ پنہاں سے گر ملے
لازم نہیں کہ خضر کی ہم پیروی کریں	۶	جانا کہ اک بزرگ ہمیں ہم سفر ملے

۷ — اے ساکنانِ کوچۂ دلدار دیکھنا
تم کو کہیں جو غالبِ آشفتہ سر ملے

(۱) یعنی اگر آنکھوں ہی کو لطفِ دیدار میسر آجائے تو خیر ہم دل کی تسکین کا مطالبہ بھی نہ کریں۔ لیکن کجا تیری صورتِ زیبا اور کہاں حورانِ خلد کی صورتیں۔

(۲) یعنی اگر میرے واقعۂ قتل کے حوالہ سے تیرے گھر کا پتہ مشہور ہو گیا تو تو بدنام ہو جائے گا۔

(۴) یہ مضمون کچھ آغاز چاہتا ہے ۔ یعنی شاعر کو ایک قاصد کی ضرورت ہوئی مگر کھٹکا یہ کہ کہیں قاصد معشوق پر عاشق نہ ہو جائے ۔ ایک دوست اس عاشق کا ایک شخص کو لایا ۔ اور اس نے عاشق سے کہا کہ یہ آدمی وضع دار اور معتمد علیہ ہے ۔ میں ضامن ہوں کہ ایسی حرکت نہ کرے گا ۔ خیر اس کے ہاتھ خط بھیجا گیا ۔ قضا را عاشق کا گمان سچ ہوا ۔ قاصد مکتوب الیہ کو دیکھ کر والہ و شیدا ہو گیا ۔ کیسا خط ۔ کیسا جواب ۔ دیوانہ بن ۔ کپڑے پھاڑ جنگل کو چل دیا ۔ اب عاشق اس واقعہ کے وقوع کے بعد نامہ بر سے کہتا ہے کہ غیب داں تو خدا ہے ۔ کسی کے باطن کی کسی کو کیا خبر ۔ اپنے نامہ بر تجھ سے کچھ کلام نہیں ۔ لیکن اگر نامہ بر کہیں مل جائے تو اس کو میرا سلام کہنا ۔ کہ کیوں صاحب تم کیا کیا دعوے عاشق نہ ہونے کے کر گئے تھے اور انجام کار کیا ہوا ۔ (ماخوذ از مکتوب قاضی عبد الجمیل صاحب ۔ جمیل بریلوی)

(۵) غم پنہاں کی کشاکش نہ ہو اور غم پنہاں ، جنون ظاہر سے بدل جائے تو ہم دکھائیں کہ مجنوں نے کیا کیا تھا اور ہم کیا کر سکتے ہیں ۔

(۶) یعنی خضر کی بزرگی تسلیم ۔ لیکن سفر (سلوک) تو ہم ہی کر رہے ہیں اور ان منازل کو ہم خود طے کر لیں گے ۔ ہمیں ان کی پیروی کی کیا ضرورت ۔ البتہ خواجہ صاحب موصوف اگر چاہیں تو ہمارے ہم سفر ہو سکتے ہیں ۔

(۷) یعنی اگر غالب آشفتہ سر کہیں مل جائے تو دیکھنا اس کی حالت اس کوچہ سے نکلنے کے بعد کیا ہوئی ہے ۔

کوئی دن گر زندگانی اور ہے	۱	اپنے جی میں ہم نے ٹھانی اور ہے
آتشِ دوزخ میں یہ گرمی کہاں	۲	سوزِ غم ہائے نہانی اور ہے
بارہا دیکھی ہیں ان کی رنجشیں	۳	پر کچھ اب کے سرگرانی اور ہے
دیکے خط منہ دیکھتا ہے نامہ بر	۴	کچھ تو پیغامِ زبانی اور ہے
قاطعِ اعمار ہیں اکثر نجوم	۵	وہ بلائے آسمانی اور ہے

۶	ہو چکیں غالب بلائیں سب تمام ایک مرگِ ناگہانی اور ہے

(۳) یعنی نامہ بر اب کوئی ایسی غیر متوقع بات کہنے کو ہے کہ وہ کہتے ہوئے جھجکتا ہے کہ خدا جانے سننے والے پر کیا گزرے۔

(۴) "قاطعِ اعمار" عمریں گھٹا دینے والے نجوم مراد ہیں۔ بلائے آسمانی معشوق کو کہا گیا ہے۔

کوئی امید بر نہیں آتی	۱	کوئی صورت نظر نہیں آتی
موت کا ایک دن معین ہے	۲	نیند کیوں رات بھر نہیں آتی
آگے آتی تھی حالِ دل پہ ہنسی	۳	اب کسی بات پر نہیں آتی
جانتا ہوں ثوابِ طاعت و زہد	۴	پر طبیعت ادھر نہیں آتی
ہے کچھ ایسی ہی بات جو چپ ہوں	۵	ورنہ کیا بات کر نہیں آتی
کیوں نہ چیخوں کہ یاد کرتے ہیں	۶	میری آواز گر نہیں آتی
داغِ دل گر نظر نہیں آتا	۷	بو بھی اے چارہ گر نہیں آتی
ہم وہاں ہیں جہاں سے ہم کو بھی	۸	کچھ ہماری خبر نہیں آتی
مرتے ہیں آرزو میں مرنے کی	۹	موت آتی ہے پر نہیں آتی
کعبے کس منہ سے جاؤ گے غالب	۱۰	شرم تم کو مگر نہیں آتی

(۲) موت تو ہمارے مانگے نہیں آتی ۔ گویا وہ ہماری طلب اور شب ہائے ہجر سے وابستہ نہیں بلکہ اس کے لئے کوئی اور وقت مقرر ہے ۔ لیکن خدا جانے نیند کیوں نہیں آتی ۔ حالانکہ نیند آنے کا وقت رات ہی کا ہوتا ہے ۔

(۴) یعنی پہلے حالِ دل پہ ہی سہی ہنسی آ تو جاتی تھی ۔ مگر اب تو کچھ ایسی افسردگی ہے کہ کسی بات پر نہیں آتی ۔

(۶) یعنی داغِ دل اگر نظر نہیں آتا تو کیا سوزِ عشق سے دل کے جلنے کی بُو بھی نہیں آتی ۔

(۷) یعنی ہم اُس مرتبۂ فنا میں پہنچ گئے ہیں کہ ہم کو خود خبر نہیں رہی کہ ہم کہاں تھے اور کہاں ہیں ۔

(۹) یہ مرنا بمعنی کثرت و وفورِ محبت استعمال ہوا کرتا ہے ۔ چنانچہ اس موقع پر یہی مراد ہے اور اس شعر میں ۔

محبت میں نہیں ہے فرق مرنے اور جینے کا
اُسی کو دیکھ کر جیتے ہیں جس کافر پہ دم نکلے

دم نکلے بھی بمعنی محبت استعمال ہوا ہے ۔

دلِ ناداں تجھے ہوا کیا ہے	۱	آخر اس درد کی دوا کیا ہے
ہم ہیں مشتاق اور وہ بیزار	۲	یا الٰہی یہ ماجرا کیا ہے
میں بھی منہ میں زبان رکھتا ہوں	۳	کاش پوچھو کہ مدعا کیا ہے
جبکہ تجھ بن کوئی نہیں موجود	۴	پھر یہ ہنگامہ اے خدا کیا ہے
یہ پری چہرہ لوگ کیسے ہیں	۵	غمزہ و عشوہ و ادا کیا ہے
شکنِ زلفِ عنبریں کیوں ہے	۶	نگہِ چشمِ سرمہ سا کیا ہے

سبزہ و گل کہاں سے آئے ہیں	۷	ابر کیا چیز ہے، ہوا کیا ہے
ہم کو ان سے وفا کی ہے امید	۸	جو نہیں جانتے وفا کیا ہے
ہاں بھلا کر ترا بھلا ہوگا	۹	اور درویش کی صدا کیا ہے
جان تم پر نثار کرتا ہوں	۱۰	میں نہیں جانتا دعا کیا ہے
۱۱		میں نے مانا کہ کچھ نہیں غالب مفت ہاتھ آئے تو برا کیا ہے

(۱) دلِ ناداں سے دردِ عشق کے متعلق سوال ہے۔ اور چارۂ کار اور انجامِ کار کی پرسش۔

(۲) یعنی یہ حالتِ جمعِ اضداد کیسی۔ اور یہ الٹی بات کیوں ہے کہ ہم محبت کریں اور وہ نفرت۔

(۳) یعنی کاش تم ایک دفعہ پوچھ تو لو کہ میرا مدعا کیا ہے پھر دیکھو کیا اور کس قدر کہتا ہوں۔

(۷) اسی مضمون کو استاد مرحوم مختلف طریقوں سے لکھ چکے ہیں چنانچہ یہاں بھی معشوقِ حقیقی کو موجود بوجودِ واحد یقین کرتے ہوئے اس سے مظاہر کونی و مجازی کے متعلق سوال کیا ہے کہ تو تو بوجودِ واحد موجود ہے۔ پھر یہ اس قدر انواعِ مظاہر کیا ہیں یہ خوب صورت اور حسین لوگ جن کا حسن عالم آشوب اپنی پرستش اور عشق کے لیے جھکاتا اور کھینچتا ہے ان کی نگاہوں کے سحر طراز غمزے۔ ان کے اعجاز آفریں عشوے۔ ان کی چشم سرمہ سا کے کرشمے۔ ان کی زلفِ عنبریں کی دل پھنسا لینے والی شکنیں کیا ہیں۔ پھر یہ عالمِ نباتات کی گلکاریاں ابر و ہوا کی موسم

آرائیاں اور بہار آفرینیاں کیسی ہیں۔ اور یہ سب کچھ کیا۔ کہاں سے اور کس طرح ہو رہا ہے۔

(۸) یعنی وہ ابھی نا آشنائے اُلفت ہیں۔ اور ہمیں ان سے وفا کی توقع ہے۔ یا ہم کو ایسے شخص سے وفا کی توقع ہے جو جانتا ہی نہیں کہ وفا کیا ہے۔

کہتے تو ہو تم سب کہ بُتِ غالیہ مُو آئے
اِک مرتبہ گھبرا کے کہو کوئی وہ آئے (۱)

ہوں کشمکشِ نزع میں، ہاں جذبِ محبت
کچھ کہہ نہ سکوں پر وہ مرے پوچھنے کو آئے (۲)

ہے صاعقہ و شعلہ و سیماب کا عالم
آنا ہی سمجھ میں مری آتا نہیں، گو آئے (۳)

ظاہر ہے کہ گھبرا کے نہ بھاگیں گے نکیرین
ہاں مُنہ سے مگر بادۂ دوشینہ کی بُو آئے (۴)

جلاد سے ڈرتے ہیں نہ واعظ سے جھگڑتے
ہم سمجھے ہوئے ہیں اُسے جس بھیس میں جو آئے (۵)

ہاں اہلِ طلب کون سُنے طعنۂ نایافت
دیکھا کہ وہ ملتا نہیں اپنے ہی کو کھو آئے (۶)

اپنا نہیں وہ شیوہ کہ آرام سے بیٹھیں
اُس در پہ نہیں بار تو کعبے ہی کو ہو آئے (۷)

کی ہم نفسوں نے اثرِ گریہ میں تقریر
اچھے رہے آپ اُس سے مگر مجھ کو ڈبو آئے (۸)

۹	اُس انجمنِ ناز کی کیا بات ہے غالبؔ ہم بھی گئے واں اور تری تقدیر کو رو آئے	

(۱) "غالیہ مُو" عنبریں زلفوں والا (دو) ضرورتِ ردیف کے لئے
بجائے (ھ) کے واؤ استعمال کیا ہے۔ یعنی تم سب کہتے تو ہو
کہ وہ آجائے، کاش ایسا بھی ہو کہ تم گھبرا کے کہو کہ "لو وہ آگئے"۔
(۲) یعنی اگرچہ کشمکشِ نزع کی وجہ سے کچھ کہہ نہ سکوں لیکن اسے
جذبِ محبت وہ میرے پُوچھنے کو اس وقت ضرور آجائے!
(۳) "صاعقہ" بجلی "سیماب" پارہ۔ یہ سب معشوق کی شوخی اور
آتے ہی چل دینے کے اشارے ہیں۔
(۵) یعنی ہم اشکال ولباس پر نظر نہیں رکھتے ہم تو ہر بھیس میں
اُسی ایک حقیقت کو دیکھتے ہیں۔
(۶) خود بھی صاحبِ طلب ہیں اور اپنے ہی ہم مشربوں سے
مخاطب ہو کر کہتے ہیں کہ محرومی کا طعنہ کون سُنے۔ وہ نہیں ملا تو
ہم خود اپنے آپ کو کھو بیٹھے (اور راہِ سلوک میں اپنے کو کھو دینا
بھی ڈھونڈھ لینے کے برابر ہے)
(۸) ہم نفسوں سے محبوب کے اہلِ بزم مُراد ہیں۔ "تقریر" بحث
یعنی ان کے ندیموں نے ان سے کہا کہ آپ اُسے رونے دیجئے۔
رونے میں اثر ہی کیا رکھا ہے۔ خود اچھا ہے کہ اُن کے دل کی
سی بات بنادی۔ لیکن مجھے ڈبو دیا۔
(۹) "انجمن ناز" معشوق کی بزم مطلب ہے کہ ہم بھی اُس بزمِ ناز میں
گئے۔ وہاں کا عالم دیکھا۔ کیا کہیں واقعی عجیب وغریب نظارہ ہے

تیری تقدیر کو روتے آئے یعنی تم پر افسوس کرتے رہے ہیں کہ وہ محروم ہے اُس کی قسمت کہاں کہ اس انجمن میں شریک ہو۔

۱	پھر کچھ اک دل کو بیقراری ہے	سینہ جویائے زخمِ کاری ہے
۲	پھر جگر کھودنے لگا ناخن	آمدِ فصلِ لالہ کاری ہے
۳	قبلۂ مقصدِ نگاہِ نیاز	پھر وہی پردۂ عماری ہے
۴	چشم دلالِ جنسِ رسوائی	دل خریدارِ ذوقِ خواری ہے
۵	وہی صد رنگ نالہ فرسائی	وہی صد گونہ اشکباری ہے
۶	دل ہوائے خرامِ ناز سے پھر	محشرستانِ بیقراری ہے
۷	جلوہ پھر عرضِ ناز کرتا ہے	زورِ بازارِ جاں سپاری ہے
۸	پھر اسی بے وفا پہ مرتے ہیں	پھر وہی زندگی ہماری ہے
۹	پھر کھلا ہے درِ عدالتِ ناز	گرم بازارِ فوجداری ہے
۱۰	ہو رہا ہے جہان میں اندھیر	زلف کی پھر سرشتہ داری ہے
۱۱	پھر دیا پارۂ جگر نے سوال	ایک فریاد و آہ و زاری ہے
۱۲	پھر ہوئے ہیں گواہِ عشق طلب	اشک باری کا حکم جاری ہے
۱۳	دل و مژگاں کا جو مقدمہ تھا	آج پھر اس کی روبکاری ہے
۱۴	بیخودی بے سبب نہیں غالبؔ	کچھ تو ہے جسکی پردہ داری ہے

(۲) "فصلِ لالہ کاری" موسمِ بہار۔ ناخن سے جگر کھودنے کی رعایت ہے

(۳) یعنی نیاز کیشِ عشق کا قبلۂ مقصود وہ (معشوق کا) پردۂ عماری ہے
پردۂ عماری اور غلافِ کعبہ کی رعایت ظاہر ہے۔

(۴ و ۵) یعنی آنکھیں رسوائی کے سودے کی دلالی کرتی ہیں۔ اور دل

ذوقِ خواری کا خریدار ہے۔ آنکھیں اسی طرح ہزاروں آنسو بہاتی ہیں اور دل ہزاروں طرح نالہ فرسا ہے۔

(۶) "ہوا" شوق۔ "خرامِ ناز" معشوق کا چلنا پھرنا۔ اور خرامِ ناز کا وصف حشر برپا کرتا ہے۔ محشرستان اسی رعایت سے لائے ہیں۔ اور دلِ بیقرار کو محشرستان کہنا بیقراریوں کی ہل چل اور ہنگاموں پر مبنی ہے۔

(۷) "عرض" نمود و نمائش۔ یہاں لین دین اور فروخت کرنا مُراد ہے "جاں سپاری" جان دینا۔

(۹) ناز و انداز سے پھر مقابلہ ہے اور عشاق کا گوشت و خون ہو رہا ہے۔

(۱۰) پھر گرفتارِ زلف ہو رہے ہیں۔

(۱۱) پارۂ جگر پھر فریادِ درد کرتا ہے۔

(۱۲) عشق کے آثار پھر ظاہر ہو رہے ہیں اور گریہ و اشک کا سلسلہ جاری ہے۔

(۱۳) دل کا صفِ مژگاں سے پھر مقابلہ ہے — یہ پانچوں شعر عدالتی یا دفتری اصطلاحوں میں ادا کئے گئے ہیں مثلاً فوجداری سرشتہ داری۔ سوال۔ روبکاری وغیرہ۔

جنوں تہمت کشِ تسکیں نہ ہو گر شادمانی کی
(۱)
نمکپاشِ خراشِ دل ہے لذت زندگانی کی

کشاکش ہائے ہستی سے کرے کیا سعیٔ آزادی
(۲)
ہوئی زنجیرِ موجِ آب کو فرصت روانی کی

۳	پس از مردن بھی دیوانہ زیارت گاہِ طفلاں ہے شرارِ سنگ نے تربت پہ میری گلفشانی کی	

(۱) "تہمت کش" متہم۔ "خراشِ دل" زخمِ دل۔ "جنوں" عشق یعنی اگر ہم سے شادمانی ظاہر ہو تو ہمارے جنونِ عشق پر تسکین طلبی کا الزام نہیں دیا جا سکتا۔ کیونکہ دُنیا بھر کی شادمانیاں عشاق کے زخمِ دل پر نمک کا کام کرتی ہیں۔ یعنی شادمانیوں میں اُن کے لئے کوئی حقیقی لذت نہیں ہوتی۔

(۲) "کشاکش ہائے ہستی" زندگی کی اُلجھنیں اور وابستگیاں۔ "سعیِ آزادی" آزادی کی کوشش۔ "فرصت" فراغ۔ "موجِ زنجیر" میں تشبیہ ہے۔ مطلب ہے کہ دریا کو جس قدر روانی میں آزادی ہوتی ہے (دریا جس قدر زیادہ رواں ہوتا ہے) اسی قدر زنجیرِ امواج کی کثرت ہوتی ہے، گویا زنجیرۂ امواج روانی و آزادیٔ دریا ہی کا بنایا ہوا ہوتا ہے۔ یہی حال انسان کی کوششِ آزادی کا ہے، کہ آزادی کی کوششیں خود زنجیر بن جاتی ہیں۔ اور علایق و افکار کا سلسلہ اور بڑھ جاتا ہے!

(۳) "پس از مردن" مرنے کے بعد۔ "زیارت گاہ" مرنے کی رعایت سے استعمال ہوا ہے۔ "شرارِ سنگ" آگ جو پتھر سے مضاربت میں نکلتی ہے۔ "شرر" اور پھول کی تشبیہ ہے مطلب ہے، کہ لڑکے میری قبر پر بھی پتھر مارتے ہیں اور اس زیارت گاہ پر شرارِ سنگ کے پھولوں کا چڑھاوا ہوتا ہے۔

نکوہش ہے سزا فریادیٔ بیدادِ دلبر کی
(۱)
مبادا خندۂ دنداں نما ہو صبحِ محشر کی

رگِ لیلیٰ کو خاکِ دشتِ مجنوں ریشگی بخشے
(۲)
اگر بو دے بجائے دانہ دہقاں نوک نشتر کی

پرِ پروانہ شاید بادبانِ کشتیٔ مے تھا
(۳)
ہوئی مجلس کی گرمی سے روانی دورِ ساغر کی

کروں بیدادِ ذوقِ پرفشانی عرض کیا قدرت
(۴)
کہ طاقت اُڑ گئی اُڑنے سے پہلے میرے شہپر کی

کہاں تک روؤں اُس کے خیمے کے پیچھے قیامت ہے
(۵)
مری قسمت میں یارب کیا نہ تھی دیوار پتھر کی

(۱) "نکوہش" ملامت۔ "فریادیٔ بیدادِ دلبر" معشوق کے مظالم کی فریاد کرنے والا۔ "خندۂ دنداں نما" خندۂ ملامت، مضحکہ یعنی معشوق کے فریادی کی اجر اعراملامت و مضحکہ ہے۔ ایسا نہ ہو کہ اس فریادی کے لئے صبحِ قیامت بھی، تمسخر کرے!

(۲) اس شعر کے متعلق تلمیح یہ ہے کہ مجنوں کی فصد کھولی گئی تھی اور جذبۂ الفت نے یہ اعجاز دکھایا تھا کہ رگِ لیلیٰ بھی خونفشاں ہو گئی تھی۔ شعر میں اُستاد نے اسی جذب کو دوسری طرح ادا کیا ہے۔ کہ وہاں فصد کھلنے سے یہ ہوا اور یہاں اُس کا دوسرا پہلو بھی ہے، یعنی مجنوں کے عشق و جذبات سے ساری وادیٔ نجد معمور ہے، اور اس کی ضرورت نہیں کہ خود مجنوں کی رگ میں نشتر لگے تب لیلیٰ کی رگ سے خون جاری ہو، بلکہ خاکِ دشتِ مجنوں

ہیں، اگر دہقاں بجائے دانہ کے نوکِ نشتر بودے تو رگِ لیلیٰ مجروح ہو جائے۔

(۳) "پر فشانی" اُڑنے کے لیے پروں کو حرکت دینا، یا پر تولنا یعنی اُس کی تاب کہاں کہ ذوقِ پر فشانی کا ظلم بیان کروں کیونکہ یہاں اُڑنے سے پہلے ہی بازو کی قوت پرواز کر چکی ہے اور ارادہ سے قبل ہمت نے جواب دیدیا ہے!!

(۴) مجلس کی گرمی سے، مشاغل مجلس کے شروع ہونے کی طرف اشارہ ہے۔ شمع بھی لوازم مجلس سے ہے۔ پر پروانہ کو کشتی مے کا "بادبان" کہا ہے پس یہ کشتی رواں ہوئی، اور دَورِ چلنے لگا۔

(۵) یعنی خیمہ کے بجائے اگر پتھر کی دیوار ہوتی، تو سر پھوڑ لیتا۔ روتے روتے مدت ہو گئی۔

بے اعتدالیوں سے سبک سب میں ہم ہوئے
جتنے زیادہ ہو گئے اُتنے ہی کم ہوئے (۱)

پنہاں تھا دام سخت قریب آشیان کے
اُڑنے نہ پائے تھے کہ گرفتار ہم ہوئے (۲)

ہستی ہماری اپنی فنا پر دلیل ہے
یاں تک مٹے کہ آپ ہم اپنی قسم ہوئے (۳)

سختی کشانِ عشق کی پوچھے ہے کیا خبر
وہ لوگ رفتہ رفتہ سراپا الم ہوئے (۴)

تیری وفا سے کیا ہو تلافی کہ دہر میں
تیرے سوا بھی ہم پہ بہت سے ستم ہوئے (۵)

(۶)

لکھتے رہے جنوں کی حکایاتِ خوں چکاں
ہر چند اس میں ہاتھ ہمارے قلم ہوئے

(۷)

اللہ رے تیری تندیٔ خو جس کے بیم سے
اجزائے نالہ دل میں مرے رزقِ ہم ہوئے

(۸)

اہلِ ہوس کی فتح ہے ترکِ نبردِ عشق
جو پاؤں اُٹھ گئے وہی اُن کے علم ہوئے

(۹)

نالے عدم میں چند ہمارے سپرد تھے
جو واں نہ کھچ سکے سو وہ یاں آ کے دم ہوئے

(۱۰)

چھوڑی اسدؔ نہ ہم نے گدائی میں دل لگی
سائل ہوئے تو عاشقِ اہلِ کرم ہوئے

---

(۱) "بے اعتدالی" حد سے تجاوز کرنا۔ "کم ہوئے" سبک ہوئے ذلیل ہوئے۔

(۲) "سخت قریب" بہت قریب، یا "دامِ سخت" جس کی گرفت مضبوط ہو۔

(۳) ایسی ہستی جو فنا پذیر ہو، جھوٹی قسم سے زیادہ وقعت و ثبات نہیں رکھتی ایا ہم نے اپنی جان دے کر اپنے مٹنے کی قسم پوری کر دی۔

(۴) "سختی کشاں" مبتلائے مصائب۔ یعنی عشاق اس قدر سختیوں میں مبتلا رہے ہیں کہ ہمہ تن مصائب ہو گئے ہیں یا خود ہی تصویرِ الم بن گئے ہیں۔

(۵) یعنی علاوہ آلامِ عشق کے، غم روزگار اور ستم ہائے آسمانی بھی ہوتے رہے ہیں!

(۶) "ہاتھ قلم ہونا" ہاتھ کٹنا۔ لیکن یہاں یہ مطلب بھی ہو سکتا ہے کہ

جنونِ عشق کے واقعات خون میں لکھتے لکھتے انگلیاں فگار ہوگئیں اور فگار انگلیوں سے قلم اور خون سے روشنائی کا کام لیا!

(۷) "تندئ خو" تیزئ مزاج۔ "بیم" خوف۔ رزق کی رعایت سے نالہ کے اجزاء (ٹکڑے) کہے ہیں "ہم" غم و رنج۔ مطلب ہے کہ تیری بدمزاجی کے خوف سے، نالے کھینچنا دشوار تھا، نالوں سے غمِ پنہاں کو تسکین ہوتی ہے۔ گو غمِ پنہاں تحلیل ہو کر نالوں میں نکلتا ہے اور کم ہوتا رہتا ہے، مگر تیرے خوف سے جب نالے نہ کھنچے تو غمِ پنہاں کے لئے اجزاءِ نالہ رزق ہوگئے گویا غمِ پنہاں کی پرورش و زیادتی کے باعث ہوئے!

(۸) "علم" نشاناتِ فتح مراد ہیں۔ اور پائے فرار کو علم سے تشبیہ دی ہے اور سچ یہ ہے کہ اہلِ ہوس مقابلہ عشق سے گریزاں اور میدانِ عشق سے فرار کو اپنے لئے مفید جانتے ہیں۔ اس لئے اُن کی نگاہوں میں ایثار و قربانی نقصان معلوم ہوتے ہیں۔

(۹) "عدم" سے یہاں ازل مراد ہے۔ یعنی وہی نالے جو اُس عالم میں کھینچے جاتے، یہاں اس عالم میں سانس بن گئے ہیں گویا ہماری ہستی کی حقیقت اور بناء آلام ہیں۔

جو نہ نقدِ داغِ دل کی کرے شعلہ پاسبانی	۱	تو فسردگی نہاں ہے بہ کمینِ بے زبانی
مجھے اُس سے کیا توقع بہ زمانۂ جوانی	۲	کبھی کودکی میں جس نے نہ سنی مری کہانی
یونہی دکھ کسی کو دینا نہیں خوب ورنہ کہتا	۳	کہ مرے عدو کو یارب ملے میری زندگانی

(۱) "داغ" کی درہم سے تشبیہ دیا کرتے ہیں۔ اس لئے نقدِ داغ کہا گیا ہے۔ "شعلہ" سے مراد سوزِ عشق ہے۔ "فسردگی" مرجھانا یا

بیدل و مایوس ہونا۔ "کمیں" آڑ میں۔ گھات میں۔ مطلب ہے کہ اگر نقدِ داغ کی حفاظت شعلۂ عشق نہ کرے تو فسردگی جو بے زبانی کی آڑ میں چھپی ہوتی ہے اُس کو چرا لے جائے۔ یعنی اگر شعلۂ عشق باقی نہ رہے تو بے دلی اور مایوسی داغِ دل پر چھا جائیں۔

(۲) "کودکی" بچپن۔ بچپن میں قصہ کہانی سُننے کا شوق ہوا کرتا ہے۔

(۳) یعنی کسی کو تکلیف دینا اچھا نہیں۔ ورنہ رقیب کے لئے میں ضرور یہ بددُعا کرتا کہ میرے مصائب اُس پر منتقل ہو جائیں۔

ظلمت کدہ میں میرے شبِ غم کا جوش ہے | ۱ | اک شمع ہے دلیلِ سحر سو خموش ہے
نے مژدۂ وصال نہ نظارۂ جمال | ۲ | مُدت ہوئی کہ آشتیِ چشم و گوش ہے
مے نے کیا ہے حُسنِ خود آرا کو بے حجاب | ۳ | اے شوق یاں اجازتِ تسلیمِ ہوش ہے
گوہر کو عقدِ گردنِ خوباں میں دیکھنا | ۴ | کیا اوج پر ستارۂ گوہر فروش ہے
دیدار، بادہ، حوصلہ، ساقی، نگاہِ مست | ۵ | بزمِ خیال، میکدۂ بے خروش ہے

قطعہ

اے تازہ واردانِ بساطِ ہوائے دل | ۶ | زنہار اگر تمہیں ہوسِ نائے و نوش ہے
دیکھو مجھے، جو دیدۂ عبرت نگاہ ہو | ۷ | میری سُنو، جو گوشِ نصیحت نیوش ہے
ساقی بہ جلوہ دُشمنِ ایمان و آگہی | ۸ | مطرب بہ نغمہ رہزنِ تمکین و ہوش ہے
یا شب کو دیکھتے تھے، کہ ہر گوشۂ بساط | ۹ | دامانِ باغباں و کفِ گلفروش ہے
لطفِ خرامِ ساقی و ذوقِ صدائے چنگ | ۱۰ | یہ جنتِ نگاہ وہ فردوسِ گوش ہے
یا صبح دم جو دیکھیے آ کر تو بزم میں | ۱۱ | نے وہ سرور و سوز نہ جوش و خروش ہے
داغِ فراقِ صحبتِ شب کی جلی ہوئی | ۱۲ | اک شمع رہ گئی ہے سو وہ بھی خموش ہے
آتے ہیں غیب سے یہ مضامیں خیال میں | ۱۳ | غالب صریرِ خامہ نوائے سروش ہے

(۱) "ظلمتکدہ" بیت الحزن۔ عاشق کا گھر مراد ہے یعنی میرے گھر میں ہمیشہ شبِ غم ہی رہتی ہے صبح کی دلیل بجھی ہوئی شمع ضرور ہے لیکن میرے گھر کی شمع صبح کی وجہ سے گل نہیں ہوئی بلکہ شبِ غم کی جوشِ ظلمت میں وہ روشن ہی نہ ہو سکی۔

(۲) پہلے دیدار سے آنکھیں کامیاب ہوتی رہتی تھیں اور کانوں کو آنکھوں پر رشک یا آنکھوں سے شکایتِ محرومی ہوتی تھی لیکن اب مدت ہوئی کہ نہ مژدۂ وصل سننے میں آتا ہے نہ نظارۂ جمالِ یار میسر ہے اور آنکھوں اور کانوں میں موافقت ہے یعنی دونوں کا محرومی میں ایک حال ہے۔

(۳) "حسنِ خود آرا" محبوب سے استعارہ ہے۔ "تسلیم" عربی لفظ ہے جس کے معنے اطاعت یا خود کو حوالہ کر دینے کے آتے ہیں یعنی شراب نے تو اُن کو بے حجاب کر دیا۔ اے شوق اب تجھے بھی اجازت ہے کہ ہوش و ادب کو تو بھی نشہ کے حوالہ کر کے شوخی و گستاخ دستی اختیار کرے۔

(۴) "عقد گردن" گلے کا ہار یا کنٹھا مراد ہے۔ "ستارہ اوج پر" ہونا خوش نصیبی کے معنوں میں محاورہ ہے۔ ستارہ اور موتی کی تشبیہ ظاہر ہے یعنی معشوقوں کے گلے میں موتی دیکھ کر گوہر فروش کے ستارہ کا اوج ظاہر ہوتا ہے۔

(۵) "بزمِ خیال" یعنی عالمِ خیال میں محفل کا تصور۔ "بے خروش" بے ہنگامہ۔ بے شور و غل۔ یعنی بزمِ خیال میں نظارہ شراب ہے مست نگاہ، ساغر طلب ہے، اور ساقی کا حوصلہ عالی یا ساغر

دینے میں عالی حوصلگی ہے۔ اور یہ ایسا میکدہ ہے جس میں شور و غل بھی نہیں۔

(۷ تا ۱۲) "تازہ واردان" نئے آنے والے۔ "بساط" فرش۔ مسند "ہوائے دل" ذوق و شوق یا ولولہ ہائے دلی۔ "زنہار" کلمۂ نفی مؤکد۔ "نا و نوش" مے نوشی اور سماع۔ "دیدۂ عبرت نگاہ" وہ آنکھ جو برباد یوں کے آثار سے عبرت حاصل کرے۔ "گوش نصیحت نیوش" وہ کان جو نصیحتوں کو سنیں۔ "ساقی بجلوہ" ساقی جلوہ نمائی کے عالم میں۔ "ایمان و آگہی" دین و عقل "مطرب بنغمہ" مطرب جب نغمہ سرا ہو یا گانے کے عالم میں۔ "رہزن" چور۔ یہاں باطل کر دینے والا مراد ہے۔ مطلب ہے کہ اے وہ لوگو کہ تمہارے دلوں میں ذوق و شوق اور ولولے تازہ تازہ پیدا ہوئے ہیں۔ محفل سازی سے نے نوشی اور نغمہ و ساز کی ہوس ہے۔ اگر تمہاری آنکھیں عبرت نگاہ ہیں تو مجھے دیکھو اور عبرت پکڑو اور اگر تمہارے کانوں میں نصیحت سننے کی اہلیت ہے تو میری نصیحت سنو کہ جلوۂ ساقی ایمان و عقل کا دشمن ہے۔ اور نغمۂ مطرب ضبط و ہوش کو برباد کر دیتا ہے۔ ہم پر تو یہ گذری کہ رات تو یہ دیکھا کہ فرش محفل کا ہر کونہ پھولوں سے بھرا ہوا دامن باغبان یا پھول بیچنے والے کا پھولوں بھرا ہاتھ تھا۔ ساقی کے لطف خرام نے جنت کی گل تراشیاں اور گلکاریاں پیش نظر کر دی تھیں اور کیفیت ساز نے کانوں کو بہشتی سرور سے مخمور کر دیا تھا صبح کے وقت جو بزم کا عالم دیکھا تو مسرت۔ گرمیٔ محفل۔ اور ہنگامہ عیش و طرب

کچھ بھی نہ تھا۔ ایک جلی ہوئی شمع باقی ہے اور پھر وہ بھی خاموش گویا صبحِ شب سے فراق کا داغ کھائے ہوئے ہے۔

(۱۴) "صریرِ خامہ" قلم کی آواز۔ "نوائے سروش" پیغام و صدائے غیب۔

نہ ہوئی گر مرے مرنے سے تسلی نہ سہی	۱	امتحاں اور بھی باقی ہے تو یہ بھی نہ سہی
خار خارِ المِ حسرتِ دیدار تو ہے	۲	شوق گلچینِ گلستانِ تسلی نہ سہی
مے پرستاں خمِ مے منہ سے لگائے ہی بنے	۳	ایکدن گر نہ ہوا بزم میں ساقی نہ سہی
نفسِ قیس کہ ہے چشم و چراغِ صحرا	۴	گر نہیں شمعِ سیہ خانۂ لیلیٰ نہ سہی
ایک ہنگامہ پہ موقوف ہے گھر کی رونق	۵	نوحۂ غم ہی سہی نغمۂ شادی نہ سہی
نہ ستایش کی تمنا نہ صلہ کی پروا	۶	گر نہیں ہیں مرے اشعار میں معنی نہ سہی
۷	عشرتِ صحبتِ خوباں ہی غنیمت سمجھو نہ ہوئی غالب اگر عمرِ طبیعی نہ سہی	

(۲) "گل و خار" دونوں مقابلہ کی چیزیں ہیں، یا دونوں ایک ہی درخت کی پیداوار ہیں۔ یعنی المِ حسرتِ دیدار کے کانٹے کی چبھن تو ہے اگرچہ شوق کو گلچینی جمال میسر نہیں!

(۴) آہ نالہ کو شعراء شرربار لکھا کرتے ہیں، اور چراغ و شمع میں بھی شعلہ ہوتا ہے، اور آنکھ، چراغ اور شمع وغیرہ نور میں مشترک ہیں اور ان میں یہی وجہ شبہ ہے۔ اور عشاق کے عقیدہ میں جہاں شمعِ عشق کی روشنی نہ ہو، وہاں آفتاب و شمع بھی بے نور و تاریک ہیں۔ اسی اعتبار کو لیلیٰ کے گھر کو "سیہ خانہ" سے تعبیر کیا ہے مطلب یہ ہے کہ گرچہ سیہ خانۂ لیلیٰ کو شمع نفسِ قیس میسر نہیں،

چونکہ تو اغیار کے گھر جانے کے لئے بناؤ سنگھار کرتا ہے تو ہم سے وعدہ خلافی کا داغ آئینے کے سامنے اور زیادہ نمایاں ہو جانا چاہیے۔

(۳) یعنی ہوس میں الجھ کر عافیت برباد نہ کر۔ تجربہ یا ترک طلب ہی میں سلامتی اور راحت ہے۔

(۴) یعنی وہ وفا پرور (محبوب) تو پیش نظر ہو اور عشق صادق نہ ہو۔ ایسا ہے کہ موسم بہار ہو اور مصنوعی دیوانگی تو بھلا محبوب کیا ہاتھ آسکتا ہے۔ اور بہار سے کیا لطف حاصل ہو سکتا ہے۔

---

(۱)
لاغر اتنا ہوں، کہ گر تو بزم میں جا دے مجھے
میرا ذمہ دیکھ کر گر کوئی بتلا دے مجھے

(۲)
کیا تعجب ہے کہ اس کو دیکھ کر آ جائے رحم
واں تلک کوئی کسی حیلے سے پہنچا دے مجھے

(۳)
منہ نہ دکھلاوے نہ دکھلا، پر بہ انداز عتاب
کھول کر پردہ ذرا آنکھیں ہی دکھلا دے مجھے

(۴)
یاں تلک میری گرفتاری سے وہ خوش ہے کہ میں
زلف گر بن جاؤں تو شانے میں الجھا دے مجھے

---

(۳) یعنی مجھ کو منہ دکھانے میں شرم ہے اور منہ دکھلانے سے اگر خفا ہوتا ہے تو آنکھیں ہی دکھا دے کیونکہ غصہ میں آنکھیں ہی دکھلائی جاتی ہیں۔

---

(۱)
بازیچۂ اطفال ہے دنیا مرے آگے
ہوتا ہے شب و روز تماشا مرے آگے
اک کھیل ہے اورنگ سلیماں مرے نزدیک
اک بات ہے اعجاز مسیحا مرے آگے

جز نام نہیں صورتِ عالم مجھے منظور	۳	جز وہم نہیں ہستیِ اشیا مرے آگے
ہوتا ہے نہاں گرد میں صحرا مرے ہوتے	۴	گھستا ہے جبیں خاک پہ دریا مرے آگے
مت پوچھ کہ کیا حال ہے میرا ترے پیچھے	۵	تو دیکھ کہ کیا رنگ ہے تیرا مرے آگے
سچ کہتے ہو خودبین و خودآرا ہوں نہ کیوں ہوں	۶	بیٹھا ہے بتِ آئینہ سیما مرے آگے
پھر دیکھیے اندازِ گل افشانیِ گفتار	۷	رکھ دے کوئی پیمانۂ صہبا مرے آگے
نفرت کا گماں گذرے ہے میں رشک سے گذرا	۸	کیونکر کہوں لو نام نہ ان کا مرے آگے
ایمان مجھے روکے ہے جو کھینچے ہے مجھے کفر	۹	کعبہ مرے پیچھے ہے کلیسا مرے آگے
عاشق ہوں پہ معشوق فریبی ہے مرا کام	۱۰	مجنوں کو برا کہتی ہے لیلیٰ مرے آگے
خوش ہوتے ہیں پر وصل میں یوں مر نہیں جاتے	۱۱	آئی شبِ ہجراں کی تمنا مرے آگے
ہے موجزن اک قلزمِ خوں کاش یہی ہو	۱۲	آتا ہے ابھی دیکھیے کیا کیا مرے آگے
گو ہاتھ کو جنبش نہیں آنکھوں میں تو دم ہے	۱۳	رہنے دو ابھی ساغر و مینا مرے آگے
	ہم پیشہ و ہم مشرب و ہمراز ہے میرا غالب کو برا کیوں کہو اچھا مرے آگے	۱۴

(۱) یعنی دنیا کو بازی گاہ سمجھتا ہوں اور انقلابات و حوادث کو کھیل
(۲) دُنیاوی جاہ و حشم ڈھکوسلے ہیں اور موت و حیات چٹکلے۔
(۳) یعنی عالم کے اشکال و صور بڑائے نام ہیں۔ اور اشیاء کا وجود وہم۔
(۴) یعنی میرے خاک اُڑانے سے صحرا چھپ جاتا ہے۔ اور میرے گریہ کے مقابل دریا اظہارِ عجز کرتا ہے۔
(۵) یعنی یہ تو نہ پوچھ کہ تیرے ہجر میں مجھ پر کیا گذرتی ہے بلکہ یہ دیکھ کہ موجودگی اور وصل میں تو کیا تلافی کرتا ہے۔

(٦) یعنی تم جو مجھے خود بین و خود آرا کہتے ہو سچ کہتے ہو۔ کیوں مغرور و خود بین نہ ہوں کہ ایسا معشوق آئینہ سیما میرے سامنے بیٹھا ہوا ہے۔

(٧) یعنی پھر دیکھیے میرے منہ سے کیسے پھول جھڑتے ہیں۔ ذرا جام شراب میرے سامنے رکھ دو کہ طبیعت بحال ہو جائے۔

(٨) یعنی لوگ اس کا نام لیتے ہیں اور مجھے رشک ہوتا ہے کہ اس کا نام یہ کیوں لے بیٹھے ہیں۔ تاہم منع بھی نہیں کر سکتا۔ کیونکہ نام سے نفرت تو ہے نہیں رہا۔

(١٠) یعنی میں دیوانوں کی طرح عشق نہیں۔

(١١) یعنی وصل میں خوش تو ہوتے ہیں۔ لیکن مرگِ شادی نہیں ہوتا۔ شبِ ہجر کی تمنا گویا بڑا بول تھی۔

(١٢) یعنی رونے میں ایک دریا خون رواں ہے۔ کاش اسی پر مصائب کا خاتمہ ہو جائے۔ ابھی نہ معلوم کن کن مصیبتوں سے سابقہ ہوتا ہے۔

کہوں جو حال، تو کہتے ہو مدعا کہیے	١	تم ہی کہو کہ جو تم یوں کہو تو کیا کہیے
نہ کہیو طعن سے پھر تم کہ ہم ستمگر ہیں	٢	مجھے تو خو ہے کہ جو کچھ کہو بجا کہیے
وہ نیشتر سہی، پر دل میں جب اتر جائے	٣	نگاہِ ناز کو پھر کیوں نہ آشنا کہیے
نہیں ذریعۂ راحت جراحتِ پیکاں	٤	وہ زخمِ تیغ ہے جس کو کہ دلکشا کہیے
جو مدعی بنے اس کے نہ مدعی بنیے	٥	جو نا سزا کہے اس کو نہ نا سزا کہیے
کہیں حقیقتِ جانکاہیِ مرض لکھیے	٦	کہیں مصیبتِ ناسازیِ دوا کہیے
کہیں شکایتِ رنجِ گراں نشیں کیجیے		کہیں حکایتِ صبرِ گریز پا کہیے

رہے نہ جان تو قاتل کو خوں بہا دیجے	۸	کٹے زبان تو خنجر کو مرحبا کہیے
نہیں نگار کو الفت، نہ ہو، نگار تو ہے	۹	روانیِ روش و مستیِ ادا کہیے
نہیں بہار کو فرصت، نہ ہو، بہار تو ہے	۱۰	طراوتِ چمن و خوبیِ ہوا کہیے
۱۱	سفینہ جبکہ کنارے پہ آ لگا غالبؔ خدا سے کیا ستم و جورِ ناخدا کہیے	

(۱) یعنی جب حال کہنا چاہتا ہوں تو آپ فرماتے ہیں کہ مطلب کہیے۔ مدعا کہیے۔ عبارت مختصر۔ حاصلِ کلام —— یعنی کچھ نہ کہیے ایسے آپ ہی کہیے کہ جب آپ ہی ہمارا حال نہ سنیں تو ہم کیا کریں۔

(۳) یعنی جو دل میں جگر کرے وہ دوست ہے۔ چاہے نشترِ نگاہِ ناز ہی کیوں نہ ہو۔

(۴) یعنی تیر کے زخم سے کچھ نہیں ہوتا۔ انشراحِ قلب تو تلوار کے زخم سے ہوتا ہے۔

(۵) یعنی لڑنے والے سے لڑائی مول نہ لو —— جواب نہ دو اور برا کہنے والے کی بھی سن لو۔

(۶و۷) یعنی نشانۂ حوادث ہوں۔ کبھی مرض کی جانکاہی ہے کبھی دوا کی ناموافقت ہے۔ کبھی یار کی شکایت ہے۔ کبھی رخصتِ صبر و ضبط کا اظہار ہے۔ غرضکہ یوں گزرتی ہے۔

(۸) یعنی اگر جان جائے تو قاتل کو بخش دو۔ اور زبان کٹے تو خنجر کو مرحبا کہو۔ بہرصورت ظلم کی لذت اٹھاؤ۔

(۹) یعنی معشوق کو محبت نہیں ہے نہ سہی، یہ کیا کم ہے کہ وہ معشوق

ہے اُس کی سنگدلی سے اُس کے خرامِ ناز، اُس کے حسنِ گفتار و رفتار اور اُس کے متوالے پن پر کب حرف آسکتا ہے۔

(۱۰) یعنی بہار کو اگر قیام و ثبات نہیں، نہ سہی، بہار تو ہے۔ چمن کی شادابی اور ہوا کی لطافت کیا کم ہے۔

(۱۱) یعنی گذری ہوئی مصیبت کا دُہرانا بھی مصیبت کا تازہ کرلینا ہے۔

---

(۱)
رونے سے اور عشق میں بے باک ہو گئے
دھوئے گئے ہم اتنے کہ بس پاک ہو گئے

(۲)
صرفِ بہائے مے ہوئے آلاتِ مے کشی
تھے یہی دو حساب، سو یوں پاک ہو گئے

(۳)
رسوائے دہر گو ہوئے آوارگی سے تم
بارے، طبیعتوں کے تو چالاک ہو گئے

(۴)
کہتا ہے کون نالۂ بلبل کو بے اثر
پردہ میں گل کے لاکھ جگر چاک ہو گئے

(۵)
پوچھے ہے کیا، وجود و عدم اہلِ شوق کا
آپ اپنی آگ کے خس و خاشاک ہو گئے

(۵)
کرنے گئے تھے اُس سے تغافل کا ہم گلہ
کی ایک ہی نگاہ کہ بس خاک ہو گئے

اس رنگ سے کل اُس نے اُٹھائی اسد کی نعش
دشمن بھی جس کو دیکھ کے غمناک ہو گئے

---

(۱) یعنی [illegible]

(۳) "بہا" قیمت ۔ "آلاتِ میکشی" مینوشی کے ظروف یعنی ساغر و مینا بیچ کر شراب پی لی۔ اب چوں کہ شراب کی قیمت ادا کرنے کو کچھ نہیں رہا۔ گویا شراب کا جھگڑا مٹا۔ شراب گئی۔ ساغر و مینا بک گئے۔ قصہ پاک ہوا۔

(۴) یعنی یہ جگر ہی پھولوں کے لباس و صورت میں تھے جو نالہ بلبل سے چاک ہوئے یا پھولوں کا کھلنا بھی چاک جگر کے مماثل ہے۔

(۵) یعنی اہل شوق کے عدم و وجود کے متعلق سوال ہی کیا۔ یہ سمجھو کہ اپنی ہی آگ میں آپ جل گئے یا خود ہی آگ تھے اور خود ہی جلنے والے۔ یا جن کے وجود میں عدم تھا اور جن کا عدم ہی وجود تھا۔

(۶) یعنی ہم تو ان سے تغافل اور کم نگہی کا شکوہ اور التفات و یگانگت کا مطالبہ کرنے گئے تھے۔ انھوں نے جو نظر ڈالی۔ بجلی گری۔ خاک ہو گئے۔ کچھ تھا ہی نہیں۔

(۷) یعنی کچھ ٹھوکریں لگائیں۔ الزام کر دیا۔ غرضکہ خوب گت بنائی۔

نشہ ہا شاداب رنگ و ساز ہا مست طرب
(۱)
شیشۂ مے سروِ سبزِ جوئبارِ نغمہ ہے

ہم نشیں مت کہہ کہ برہم کر نہ بزمِ عیشِ دوست
واں تو میرے نالہ کو بھی اعتبارِ نغمہ ہے

---

(۱) نغمہ آواز کے مد و جزر اور دریا روانی میں مشابہ ہے۔ ہی اعتبار

نے نغمہ کو جو ئبارِ نغمہ کہا ہے۔ پھر اس رعایت و تلازمہ سے شیشۂ مے کو سرو سے تشبیہ دی ہے۔ اور سرو کی توصیف سبز ہے۔ اب شیشۂ مے سروِ سبز جو ئبارِ نغمہ ہو گیا۔ اور جب شیشہ سروِ سبز ہے تو یہ سر سبزی دلیل ہے کہ نشہ کا رنگ شاداب و تازہ ہے اور پیالے اپنی شادابی اور سر سبزی سے مست نسرت ہو کر نغمہ سنج ہو گئے ہیں۔

(۲) یعنی "نغمہ بن جاتا ہے گردان نالہ میرا جاتے ہے۔

عرضِ نازِ شوخیِ دنداں، برائے خندہ ہے
دعوئے جمعیتِ احباب جائے خندہ ہے (۱)

ہے عدم میں غنچہ محوِ عبرتِ انجامِ گل
یک جہاں زانو تامل در قفائے خندہ ہے (۲)

کلفتِ افسردگی کو عیش بے تابی حرام
ورنہ دنداں در دل افشردن بنائے خندہ ہے (۳)

سوزشِ باطن کے ہیں احباب منکر ورنہ یاں
دل محیطِ گریہ و لب آشنائے خندہ ہے (۴)

(۱) "عرض" اظہار "تازہ" "خوبی" "دنداں" اور "جمعیتِ احباب" میں رعایت ملحوظ ہے۔ یعنی دانتوں کی خوبی کا اظہار ہنسی پر موقوف ہے۔ یا ہنسی میں دانتوں کی خوبی ظاہر ہوتی ہے اور احباب ہنسنے ہی لئے کے لئے جمع ہوا کرتے ہیں گویا یہاں جمعیت کا مقصد ہنسنا ہوتا ہے اور وہاں ہنسی میں خوبی ظاہر ہوتی ہے۔ دونوں کی حقیقت ہنسی پر ہے۔ یعنی مضحکہ و استہزا اور ہیچ

یہ ہے کہ اس جمعیت عالم پر تفریق پہنچتی ہے۔

(۲) غنچہ جب کھل گیا۔ پھول ہو گیا۔ گویا غنچہ کا وجود نہ رہا۔ عدم میں چلا گیا اب اس جہان میں غنچہ، پھول کے اس انجام پر کہ اب یہ کیفیت بھی نہ رہے گی اور مرجھا کر خاک میں مل جائے گا۔ محو عبرت ہے۔ دوسرے مصرعہ میں زانو سے محویت کا اور تامل سے عبرت انجام کا اشارہ ہے۔ مطلب ہے کہ ہر قہقہۂ عیش اور ہر خندۂ مسرت ایک زانوئے فکر انجام اور ایک جہان محویت عبرت رکھتا ہے۔ گویا بے تعداد مصیبتوں کے بعد ایک معمولی اور فانی مسرت میسر آتی ہے یا عالم عدم سے ایک ایسا وجود پیدا ہوتا ہے جو معدوم ہونے والا ہے اور یہ مثال ہے ارتکاب بین الضدین کی۔

(۳) کلفت افسردگی" افسردگی کی تکلیف۔ "عیش بیتابی" بیتابی کی راحت۔ یہ ظاہر ہے کہ افسردگی اور بے دلی کی کلفت سے بیتابی و اضطراب کا ہنگامہ بہتر ہے۔ افسردگی کی بنا نا امیدی پر ہوتی ہے اور بیتابی کا جوش امید پر ہے۔ عیش کی طلب خواہ بیتاب کر دینے والی ہی کیوں نہ ہو عیش ہے۔ اور نا امیدی کی خموشی خواہ صورت سکون ہی کیوں نہ ہو کلفت ہے۔ دندان در دل افشردن سے بیتابی مراد ہے۔ اور لفظی طور پر یہ کہ جب دل میں گڑ جائیں گے تو زخم ہو جائیں گے اور شگاف زخم کی تشبیہ خندہ سے ظاہر ہے گویا بیتابی جس کو دندان در دل افشردن [illegible] ہے۔ اور [illegible] بیتابی

کلفتِ افسردگی کو حرام ہے۔ یعنی کلفتِ افسردگی کو بیتابی اور
غم بھی میسر نہیں ہوتے بلکہ یکسر الم جاوید ہوتی ہے۔
(۴) "سوزشِ باطن" سوزِ پنہاں۔ اس شعر میں لطف یہ ہے کہ
دل میں سوزِ پنہاں اور دل محیطِ گریہ میں ڈوبا ہوا دو ضدیں جمع
کردی ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ سوزِ غم نے ہمارے دل کو بحرِ گریہ
میں ڈبو رکھا ہے گو ہماری صورت بشاش ہے۔

حسن بے پروا خریدارِ متاعِ جلوہ ہے	۱	آئینہ زانوئے فکرِ اختراعِ جلوہ ہے
تاکجا اے آگہی رنگِ تماشا باختن	۲	چشمِ واگردیدہ آغوشِ وداعِ جلوہ ہے

(۱) "حسن بے پروا" معشوق بے پروا۔ "متاع" جنس۔ خریدار
کی رعایت ہے۔ جلوہ سے نمود و نمائش مراد ہے۔ اور خود نمائی
بغیر خود آرائی کے ناممکن ہے۔ لہٰذا آئینہ میں بناؤ سنگھار ہو رہا
ہے۔ زانو کو شعراء آئینہ لکھا کرتے ہیں۔ آرائش کی طلب اور
آئینہ کی ضرورت کی مناسبت زانو کے ساتھ فکر کا اضافہ کیا ہے
گویا آئینہ کی احتیاج زانوئے فکر ہے۔ مطلب یہ ہے کہ وہ حسن
بے پروا خود آرائی پر مائل ہوا ہے۔ اور آئینہ زانوئے فکر بن گیا
ہے اور طرح طرح کے آرائش و نمود کے طریقے سوچتا اور ایجاد
کرتا ہے۔
(۲) "تاکجا" کب تک۔ "آگہی" عقل۔ "رنگِ تماشا باختن" بدل
جانے والے رنگوں اور انقلاب پذیر صورتوں کا نظارہ تماشا
مراد ہے۔ "چشمِ واگردیدہ" کھلی ہوئی آنکھ۔ "آغوشِ وداع" کی تشبیہ
ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اے عقل نظارۂ عالم میں کب تک صحبت [illegible]

رہے گی۔ بس یہ سمجھ لینا چاہیے کہ عالم کو قیام و ثبات نہیں اس پر آنکھیں کھولنا۔ بدل جانے والے منظروں کے لئے آغوشِ وداع کے مثل ہے کہ دیکھتے ہی دیکھتے منظر بدل جاتا ہے۔

۱	جب تک دہانِ زخم نہ پیدا کرے کوئی	مشکل کہ تجھ سے راہِ سخن وا کرے کوئی
۲	عالم غبارِ وحشتِ مجنوں ہے سربسر	کب تک خیالِ طرۂ لیلیٰ کرے کوئی
۳	افسردگی نہیں طرب انشائے التفات	ہاں درد بن کے دل میں مگر جا کرے کوئی
۴	رونے سے اے ندیم ملامت نہ کر مجھے	آخر کبھی تو عقدۂ دل وا کرے کوئی
۵	چاکِ جگر سے جب رہِ پرسش نہ وا ہوئی	کیا فائدہ کہ جیب کو رسوا کرے کوئی
۶	لختِ جگر سے ہے رگِ ہر خار شاخِ گل	تا چند باغبانیٔ صحرا کرے کوئی
۷	ناکامیٔ نگاہ ہے برقِ نظارہ سوز	تو وہ نہیں کہ تجھکو تماشا کرے کوئی
۸	ہر سنگ و خشت ہے صدفِ گوہرِ شکست	نقصاں نہیں جنوں سے جو سودا کرے کوئی
۹	سر بر ہوئی نہ وعدۂ صبر آزما سے عمر	فرصت کہاں کہ تیری تمنا کرے کوئی
۱۰	ہے وحشتِ طبیعتِ ایجاد یاس خیز	یہ درد وہ نہیں کہ نہ پیدا کرے کوئی
۱۱	بیکاریٔ جنوں کو ہے سر پیٹنے کا شغل	جب ہاتھ ٹوٹ جائیں تو پھر کیا کرے کوئی
۱۲	حسنِ فروغِ شمعِ سخن دور ہے اسدؔ پہلے دلِ گداختہ پیدا کرے کوئی	

(۱) یعنی جب تک تیغِ عشق سے زخمی نہ ہو۔ یا جب تک زخمِ عشق دل کو زخمی نہ کر دے اس سے بات کرنی ناممکن ہے۔ گویا تجھ سے ہمکلامی کے لئے یہ دہن نہیں بلکہ دہنِ زخم کی ضرورت ہے۔

(۲) مقصودِ کلام "طرۂ لیلیٰ" کا استعارہ ہے، اسی کی رعایت تلمیحی سے "مجنوں" استعمال کیا ہے لہٰذا "لیلیٰ" کا مفہوم محض معشوقِ حقیقی

ہے "طرۂ زینت و آرائش کی چیز ہے، اور اضافات حسن نہیں ہے ہے۔ بعض لوگ دنیا کو پرتو جمال الٰہی سمجھتے ہیں، گویا لیلیٰ ذات اور "طرۂ لیلے" پرتو ذات۔ کائنات کی بے ثباتی، اور اس کے تغیرات بدیہی امور ہیں، وحشت بھی گریز و فراری کی کیفیت ہے۔ اس لئے موجودات "بے ثبات" کو بالفاظ دیگر "غبار وحشت" کہنا چاہئے۔ مطلب شاعر یہ ہے کہ اس عالم کے اشکال فانی اور آثار بے بود کو "غبار وحشت مجنوں" تو کہہ سکتے ہیں لیکن اس کو تجلیات ذات باقی "طرہ لیلے" کیونکر قیاس کر لیں؟

(۴) "طرب انشاء التفات" التفات سے مسرت حاصل کرنا یعنی افسردگی اور بے دلی سے مسرت التفات حاصل نہیں ہوتی ہاں درد کی گنجائش ضرور ہوتی ہے اور میرے دل افسردہ میں کوئی درد ہی بن کر جگہ کر سکتا ہے۔

(۵) یعنی جگر شق ہونے پر تو کسی نے پوچھا نہیں۔ محض جیب گریباں پھاڑنے سے کیا فائدہ۔ مفت کی رسوائی ہے۔

(۶) یعنی جگر کے ٹکڑے آنسوؤں میں نکل کر نوک خار میں چھپ گئے ہیں اور ہر کانٹا شاخ اور لخت جگر پھول معلوم ہوتے ہیں۔ دیکھئے کب تک یہ باغبانی صحرا ہوتی رہے گی۔

(۷) یعنی شدۂ نور کے بالمقابل آنکھیں خیرہ ہو جاتی ہیں۔ گویا جمال برق نظارہ سوز ہے ــــ آفتاب سے کمال اشراق میں نگہ نہیں ملائی جا سکتی۔ اس لئے کمال ظہور کو کمال خفا کہا جاتا ہے۔ پس اس ذات انوار و تجلیات کو کون دیکھ سکتا ہے۔ یعنی خود آپ ہی تاب جلوہ

نگاہ کو دیدار سے محروم کر دیتی ہے پھر تجھ کو کون دیکھ سکتا ہے۔

(۸) مقصود کو گوہر مقصود، عام طور پر کہا جاتا ہے، یہاں مقصود محذوف کرکے محض گوہر استعمال کر دیا ہے اور شعر میں محض لفظی رعایت بجائے استدلال کے ہے۔ لڑکے دیوانوں کے پتھر مارتے ہیں جس سے حاصل مقصود، شکست ہوتی ہے یعنی یہ گوہر شکست" صدف سنگ و خشت سے نکلتا ہے۔ تو گویا جنون سے معاملہ کرنے میں کوئی نقصان نہیں کہ اینٹ پتھر کے بدلے یہ موتی ہاتھ آتا ہے۔

(۹) یعنی وعدۂ صبر آزما کی مدت فرصت عمر سے طویل تھی۔ گویا زمانۂ صبر طویل تھا اور عمر کم۔ پس اتنی فرصت کہاں کہ تیری کوئی تمنا کرے کیونکہ عمر تو آزمایش صبر ہی سے پہلے ختم ہو جاتی ہے۔

(۱۰) یعنی اس عالم ایجاد کی طبیعت میں یا ممکنات کے خاصہ میں وحشت و بیگانگی ہے اور اس سے توقع رکھنی عبث ہے۔ اور یہ وحشت و بیگانگی ایسا درد نہیں ہے جو کوئی پیدا کرے۔

(۱۱) مفہوم یہ ہے کہ ایک مبتلائے الم، مشاغل الم پورے کرنے ... بھی مجبور رہو، تو پھر کیا کرے!

(۱۲) یعنی کلام میں اثر نہیں ہوتا۔ جب تک کہ دل میں درد نہ ہو۔

ابن مریم ہوا کرے کوئی	۱	میرے دکھ کی دوا کرے کوئی
شرع و آئین پر مدار سہی	۲	ایسے قاتل کا کیا کرے کوئی
چال جیسے کڑی کمان کا تیر	۳	دل میں ایسے کے جا کرے کوئی
بات پر واں زبان کٹتی ہے	۴	وہ کہیں اور سنا کرے کوئی
بک رہا ہوں جنوں میں کیا کیا کچھ	۵	کچھ نہ سمجھے خدا کرے کوئی

	نہ کہو گر برا کرے کوئی	۶	نہ سنو گر برا کہے کوئی	
	بخش دو گر خطا کرے کوئی	۷	روک لو گر غلط چلے کوئی	
	کس کی حاجت روا کرے کوئی	۸	کون ہے جو نہیں ہے حاجتمند	
	اب کسے رہنما کرے کوئی	۹	کیا کیا خضر نے سکندر سے	
	جب توقع ہی اُٹھ گئی غالب کیوں کسی کا گلہ کرے کوئی		۱۰	

(۱) یعنی ہمیں کیا کوئی اعجاز عیسوی رکھتا ہے تو رکھا کرے ہمارے درد کی اگر کوئی دوا کرے تو ہم اُس مسیحا سمجھیں۔

(۲) یعنی شرع اور قانون پر فیصلہ تو ہو جائے لیکن جو قتل کرنے ہیں وہ آلات مہلکہ ہی استعمال نہ کرتا ہو جو قانونی گرفت میں آسکیں تو ایسے قاتل کا کوئی کیا کرسکتا ہے۔

(۳) کڑی کمان کے تیر اسے تیز رفتاری کی تشبیہ دیتے ہیں۔ یعنی بے جھجک۔ بے محابا۔ زود خرام۔ جو گذرگاہ کے فریادیوں کی فریاد بھی نہ سنتا ہو۔ اور جو سر راہ کے بسملوں پر نظر بھی نہ ڈالتا ہو بلکہ مغرورانہ گذر جاتا ہو۔ ایسے کے دل میں کوئی کیا جگہ پیدا کر سکتا ہے یا ایسے کے دل میں جگہ پیدا ہو تو بات ہے۔

(۹) یعنی خود آب حیات پی لیا۔ اور سکندر کو محروم رکھا۔ جب خضر جیسے شخص نے یہ کیا تو کسی دوسرے رہنما سے کیا توقع ہو سکتی ہے۔

(۱۰) یعنی جب امید ہی نہیں تو شکایت کیسی۔

غلام ساقیٔ کوثر ہوں مجھ کو غم کیا ہے	۱	بہت سہی غم گیتی، شراب کم کیا ہے	
رقیب پر ہے اگر لطف تو ستم کیا ہے	۲	تمہاری طرز روش جانتے ہیں ہم کیا ہے	

سخن میں خامۂ غالب کی آتش افشانی
یقیں ہے ہم کو بھی لیکن اب اس میں دم کیا ہے

(۱) یعنی کتنا ہی غم روزگار کیوں نہ ہو ساقیِ کوثر کا غلام ہوں شراب جنت (جس میں سرورِ خلد کی کیفیت ہوتی ہے) کا ایک گھونٹ سارے افکار زمانہ کو بھلا دے گا۔

(۲) یعنی تمہاری عادت ہم خوب جانتے ہیں۔ کہ ہمیشہ جھوٹے مدعیانِ عشق کی قدر کرتے ہو۔ یا ہمارے دکھانے اور ستانے کو اوروں پر مہربانیاں کرتے رہتے ہو۔ پس رقیب پر اگر مہربانی ہے تو یہ کوئی نئی بات نہیں۔

(۳) یعنی غالب کے کلام سے سوزِ عشق تو مترشح ہوا کرتا ہے مگر اب وہ زمانہ سوز ہی کہاں۔

باغ پاکر خفقانی یہ ڈراتا ہے مجھے	۱	سایۂ شاخِ گل افعی نظر آتا ہے مجھے
جوہرِ تیغ بہ سرچشمۂ دیگر معلوم	۲	ہوں میں وہ سبزہ کہ زہراب اگاتا ہے مجھے
مدعا محوِ تماشائے شکستِ دل ہے	۳	آئینہ خانہ میں کوئی لئے جاتا ہے مجھے
نالہ سرمایۂ یک عالم و عالم کفِ خاک	۴	آسماں بیضۂ قمری نظر آتا ہے مجھے
زندگی میں تو وہ محفل سے اٹھا دیتے تھے	۵	دیکھو اب مرگئے پر کون اٹھاتا ہے مجھے

(۱) "سایۂ شاخ" اور "افعی" میں تشبیہ ہے۔ مطلب ہے کہ باغ بھی مجھے خفقانی سمجھ کر ڈراتا ہے اور سایۂ شاخِ گل افعی معلوم ہوتا ہے "یہ" کا اشارہ بہت بے ساختہ ہے۔ جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ "یہ سانپ" نکلا۔

(۲) "زہر آب" آبِ حیات کا ضد۔ جوہر کو سبزہ سے تشبیہ دیتے ہیں۔

اور تلوار کو زہر میں بجھایا کرتے ہیں۔ گویا زہر آب تیغ پر سبزۂ جوہر اُگتا ہے۔ مطلب ہے کہ جس طرح سبزۂ جوہر سوائے زہر آبِ تیغ کے کسی سر چشمہ پر نہیں اُگ سکتا۔ میری ہستی ہمتِ بھی ایسی ہے جس کی نشو نما سر زمین عدم وہلاکت پر ہوتی ہے۔

(۳) دل کو آئینہ لکھتے ہیں۔ اس لئے ٹوٹے ہوئے دل کے ٹکڑوں سے آئینہ خانہ مراد ہے۔ اور دل ٹوٹنا ناکامی کے اعتبار پر ہے مطلب ہے کہ مقصد تو پورا نہیں ہوا دل ٹوٹ گیا اور اب وہی مدعائے محروم اس آئینہ خانہ کی سیر کر رہا ہے۔

(۴) پرندہ کو مشتِ پر کہتے ہیں۔ لیکن قمری کا رنگ چوں کہ خاکی ہوتا ہے اس لئے اُس کو کفِ خاک یا کفِ خاکستر لکھا کرتے ہیں مصرعۂ اولیٰ میں جو کفِ خاک ہے اس سے عالم کے ہیچ ہونے کا اشارہ ہے۔ اور اسی کفِ خاک کی رعایت سے قمری استعمال ہوا ہے۔ اور آسمان کو تحقیراً بیضۂ قمری کہا گیا ہے۔ مطلب ہے کہ اس دُنیائے پُر فساد کا حاصل غم ہے۔ دنیا ہیچ و بے ثبات ہے اور یہ گنبدِ نیلی میری نگاہ میں بیضۂ قمری سے زیادہ وقعت نہیں رکھتا۔ جس سے فسادات غم پیدا ہوتے رہتے ہیں

(۵) یعنی زندگی میں تو وہ محفل سے اُٹھا دیا کرتے تھے۔ اب زبان سے تو کام چلتا نہیں دیکھئے نعش کون اُٹھاتا ہے۔ کاش اب وہ ہاتھوں سے کام لیں۔

مدندی ہوئی ہے کوکبۂ شہریار کی	۱	اترائے کیوں نہ خاک سرِ راہ گزار کی
جب اُس کے دیکھنے کے لئے آئیں بادشاہ	۲	لوگوں میں کیوں نمود نہ ہو لالہ زار کی

	بھوکے نہیں ہیں سیر گلستاں کے ہم ولے کیونکر نہ کھایئے کہ ہوا ہے بہار کی	۳

(۱) "کوکبہ" گھوڑا۔

ہزاروں خواہشیں ایسی کہ ہر خواہش پہ دم نکلے
(۱)
بہت نکلے مرے ارمان، لیکن پھر بھی کم نکلے

ڈرے کیوں میرا قاتل کیا رہے گا اس کی گردن پر
(۲)
وہ خوں جو چشم تر سے عمر بھر یوں دمبدم نکلے

نکلنا خلد سے آدم کا سنتے آئے تھے لیکن
(۳)
بہت بے آبرو ہو کر ترے کوچہ سے ہم نکلے

بھرم کھل جائے ظالم تیری قامت کی درازی کا
(۴)
اگر اس طرۂ پرپیچ و خم کا پیچ و خم نکلے

مگر لکھوائے کوئی اس کو خط، تو ہم سے لکھوائے
(۵)
ہوئی صبح، اور گھر سے کان پر رکھ کر قلم نکلے

ہوئی اس دور میں منسوب مجھ سے بادہ آشامی
(۶)
پھر آیا وہ زمانہ جو جہاں میں جام جم نکلے

ہوئی جن سے توقع خستگی کی داد پانے کی
(۷)
وہ ہم سے بھی زیادہ خستۂ تیغ ستم نکلے

محبت میں نہیں ہے فرق جینے اور مرنے کا
(۸)
اسی کو دیکھ کر جیتے ہیں جس کافر پہ دم نکلے

کہاں میخانے کا دروازہ غالب اور کہاں واعظ
(۹)
پر اتنا جانتے ہیں کل، وہ جاتا تھا کہ ہم نکلے

(۱) یعنی اب بھی ایسی ہزاروں خواہشیں ہیں جن پر جان جاتی ہے اور گو بہت سی آرزوئیں پوری ہوئیں لیکن موجودہ خواہشوں کے مقابلہ میں کم پوری ہوئیں۔

(۲) یعنی قاتل کے ڈرنے کی کوئی بات نہیں۔ میرا خون اُسکی گردن پر کیا رہے گا یہ تو یوں بھی آنکھوں سے بہتا رہتا ہے۔ رونے میں نہ بہا قاتل نے بہادیا۔

(۳) یعنی آدم کا خلد سے نکلنا سُنا ہی کرتے تھے۔ یا اس کو ایک زمانہ بعید ہو چکا ہے لیکن ہم پر یہ تازہ واردات ہے۔

(۴) یعنی آپ کو اپنی سرو قامتی پر بہت ناز ہے۔ اگر زلف گرہ گیر کے بل نکل جائیں تب معلوم ہو کہ قامت دراز ہے یا زلف۔

(۵) یعنی اکثر لوگ اس کو نامہ ہائے شوق لکھواتے رہتے ہیں یہ معلوم کرنے کے لئے کہ کون کیا لکھواتا ہے ہم صبح ہی قلم لے کر پھرا کرتے ہیں تاکہ لوگ ہمیں سے ان کو خط لکھائیں۔

(۶) یعنی اس زمانہ میں مینوشی میں ہم مشہور ہو گئے ہیں اور اب پھر وہ زمانہ آیا ہے کہ جام جمشید سے دور رہوں۔

(۷) یعنی ہمیں جن سے اپنے حالِ پر ملال یا اپنے ستم ہائے عشق کے داد کی اُمید تھی وہ غم زمانہ یا جور افلاک سے ہم سے بھی زیادہ ستائے ہوئے نکلے۔

(۸) جیتے ہیں اور مرتے ہیں دونوں محاورے ہیں جن سے اہل زبان واقف ہیں۔ شعر حسن بیان کے اعتبار سے عدیم المثال ہے۔

(۹) یعنی یہ تو میں کہہ نہیں سکتا کہ نامہ میخانہ میں تھا یا میخواری کے

لئے جارہا تھا لیکن اتنا حضرت ہے کہ جب ہم میخانہ سے نکل رہے تھے تو ذاتِ شریف دروازہ پر ملے تھے۔

کوہ کے ہوں بارِ خاطر گر صدا ہو جایئے
بے تکلف اے شرارِ جستہ کیا ہو جایئے (۱)
بیضۂ آسا تنگِ بال و پر ہے یہ کنجِ قفس
از سرِ نو زندگی ہو گر رہا ہو جایئے

(۱) کوہ اور شرارِ جستہ میں یہ رعایت ہے کہ کوہ پتھر ہے اور شرر پتھر سے نکلتا ہے گویا شر پتھر کی سختیوں یا ٹکرانے کی مصیبت سے نکلنے کے لئے پتھر سے جدا ہو تا ہے۔ مطلب ہے کہ اے شرارِ جستہ تو تو پتھر کے دل میں جگہ پائے ہوئے تھا ذراسی چوٹ اور سختی سے کیسا صاف نکل گیا ہم تو اگر تجھ سے بھی زیادہ تیز رفتاری اور غیر نمایاں صورت حاصل کر لیں جب بھی اتنی آسانی کے ساتھ ان سختیوں اور صعوبتوں سے چھٹکارا نہیں پاسکتے۔ بلکہ جیسے پہاڑ سے آواز کا ردِ عمل ہوتا ہے اور آواز واپس آتی ہے ہم اگر مصائب سے نکلیں تو پھر انہیں کی طرف رجوع ہونا پڑیگا۔ گویا کہ ہمارا بارِ غم پہاڑ بھی نہیں اٹھا سکتا۔

(۲) "کنجِ قفس" استعارہ ہے قفسِ عنصری یا جسمِ انسانی سے۔ بال و پر سے روح کی پرواز مبدءِ حیات کی طرف مراد ہے۔ مطلب ہے کہ یہ قفسِ عنصری روح کے بال و پر کے لئے تنگ ہے اگر اس سے رہائی مل جائے تو روح فضائے عالمِ ارواح کی طرف پرواز کر جائے اور اپنے مبدءِ حیات میں پہنچ جائے۔ اس قفس

جسم سے نکلے تو از سرِ نو زندگی ہو جائے جیسے کہ پرندکی زندگی انڈے سے نکلنے کے ساتھ شروع ہوتی ہے۔

مستی بہ ذوقِ غفلتِ ساقی ہلاک ہے | ۱ | موجِ شراب یک مژۂ خوابناک ہے

جز زخمِ تیغِ ناز نہیں دل میں آرزو | ۲ | جیبِ خیال بھی ترے ہاتھوں سے چاک ہے

۳ | جوشِ جنوں سے کچھ نظر آتا نہیں اسدؔ
صحرا ہماری آنکھ میں یک مشتِ خاک ہے

(۱) محبوب کی چشمِ مخمور کو خوابناک بھی کہتے ہیں۔ یہاں غفلت کی لفظی رعایت بھی ملحوظ ہے۔ غالباً ساقی ساقی گری کرتے کرتے شدتِ نشاط میں سونے لگا اور اس نیند نے ایسا خمار پیدا کیا کہ مستیٔ شراب سے بھی زیادہ دل فریبی پیدا ہو گئی گویا خود مستی اس ادائے خواب پر نثار ہونے لگی اور موجِ شراب مژۂ خواب آلود بن گئی۔

(۲) یعنی سوائے تیغِ ناز سے زخمی ہونے کے دل میں کوئی آرزو ہی نہیں ہے۔ اور گریبانِ خیال بھی زخم کی طرح چاک ہو گیا ہے۔

(۳) "کچھ نظر نہیں آتا" میں دو پہلو ہیں۔ ایک یہ کہ بڑی سے بڑی چیز کی کوئی وقعت نہیں دوسرے یہ کہ جوشِ وحشت اس درجہ ہے کہ وسعتِ صحرا نا کافی ہے۔

لبِ عیسیٰ کی جنبش کرتی ہے گہوارہ جنبانی | ۱ | قیامت کشتۂ لعلِ بتاں کا خوابِ سنگیں ہے

(۱) یعنی ہم ایسے رشکِ مسیحا سے ہلاک کئے ہوئے ہیں کہ اعجازِ عیسوی ہم کو جلا نہیں سکتا۔ بلکہ ہمارے خوابِ سنگین کے لئے جنبشِ لبِ عیسیٰ گہوارہ جنبانی کے مماثل ہے۔ کہ اور غفلت بڑھتی ہے

آمدِ سیلابِ طوفانِ صداے آب ہے
نقشِ پا، جو کان میں رکھتا ہے انگلی جادہ ہے (۱)

بزمِ مے وحشتکدہ ہے کس کی چشمِ مست کا
شیشے میں نبضِ پری پنہاں ہے موجِ بادہ سے (۲)

(۱) سیلاب سے یہاں سیلِ حوادث مراد ہے۔ اور طوفانِ صداے آب سے بارش میں رات کی گرج وغیرہ مقصود ہے۔ یا خود پانی کے جوش وخروش کی صدائیں انہیں صداؤں سے حوادث کی شدت اور تصادم وتضارب وغیرہ کی تشبیہ دی ہے۔ اور بادل جب زور شور سے گرجتا ہے تو لوگ کانوں میں انگلیاں دے لیتے ہیں۔ یہاں جادہ کو انگلی سے اور نقشِ پا کو کان سے تشبیہ دی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ سیلِ حوادث ایسے زور شور سے ہو رہا ہے۔ جیسے طوفانِ ابر و رعد آتا ہو یہاں تک کہ نقشِ پا نے بھی خوف سے اپنے کانوں میں انگشتِ جادہ دے لی ہے۔

(۲) ہرن کی آنکھ اچھی ہوتی ہے اور اُس کی وحشت مشہور ہے۔ شاید اسی قیاس پر شعرا کے یہاں آنکھوں کی وحشت وصف میں داخل ہوگئی ہے۔ "پری" ایک وجودِ وہمی ہے جس کے متعلق حسن اور انسانوں سے چھپنا باور کیا جاتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ محفلِ شراب خرابات نے کس کی چشمِ مست کا وحشت کدہ ہے کہ موجِ شراب نبضِ پری کی طرح شیشہ میں چھپ گئی ہے

ہیں میں بھی تماشائی نیرنگِ تمنا	۱	مطلب نہیں کچھ اس سے کہ مطلب ہی بر آئے

(۱) یعنی میں تو صرف تمنا کی دلچسپی اور دلفریبی سے لطف حاصل کرتا

ہوں۔ یہ غرض نہیں کہ تمنا پوری ہی ہو۔

سیاہی جیسے گر جائے دمِ تحریر کاغذ پر	۱	مری قسمت میں یوں تصویر ہے شبہائے ہجراں کی

(۱) یعنی میرے نوشتۂ تقدیر میں شبِ ہجراں کا جو نقش ہے وہ ایسا ہے جیسے لکھتے لکھتے سیاہی قلم سے کاغذ پر گر جائے۔

ہجومِ نالہ، حیرت عاجزِ عرضِ یک افغاں ہے
(۱)
خموشی ریشۂ صد نیستاں سے خس بدنداں ہے

تکلف برطرف، ہے جانستاں تر لطفِ بدخویاں
(۲)
نگاہِ بے حجابِ ناز، تیغِ تیزِ عریاں ہے

ہوئی یہ کثرتِ غم سے تلف کیفیتِ شادی
(۳)
کہ صبحِ عید مجھ کو بدتر از چاکِ گریباں ہے

دل و دیں نقد لا، ساقی سے گر سودا کیا چاہے
(۴)
کہ اس بازار میں ساغر متاعِ دستگرداں ہے

غم آغوشِ بلا میں پرورش دیتا ہے عاشق کو
(۵)
چراغِ روشن اپنا قلزمِ صرصر کا مرجاں ہے

(۱) گویا ہر نالہ ایک نے ہے اور ہجومِ نالہ صد نیستاں ہے۔ اب جو نالہ لب تک آتا ہے ایک ریشۂ صد نیستاں کی حیثیت رکھتا ہے۔ "خس بدنداں ہونا" اظہارِ عجز کرنا۔ مطلب یہ ہے کہ نالوں کا ہجوم بھی ہے اور حیرت کہ نالہ کرنے میں عجز ہے۔ چونکہ حیرت خاموشی کی مقتضی ہے پس خاموشی ریشۂ صد نیستاں کا تنکا دانتوں میں لیکر اظہارِ عجز کرتی ہے۔ اسی قسم کا ایک شعر اور گذر چکا ہے۔

نہ آئی سطوتِ قاتل بھی مانع میرے نالوں کو — لیا دانتوں میں جو تنکا ہوا ریشہ نیستاں کا

وہاں سطوتِ قاتل اور یہاں جوشِ حیرت کا مضمون ہے۔

(۳) لطف و التفات میں نگاہیں حجاب ہوتی ہیں۔ نگاہِ محبوب کو تیغ لکھتے ہیں اس لئے بے حجاب نگاہ کو تیغِ تیزِ عریاں ہونا چاہیئے۔ مطلب ہے کہ اُن کے ستم سے اُن کا کرم زیادہ اسبابِ قتل رکھتا ہے۔

(۴) دست گردان "علی سبیل البیعت"۔ اس ہاتھ دو اُس ہاتھ لو۔ یعنی ساقی سے اگر معاملۂ مے نوشی کرنا ہے تو نقدِ دل و دین دے کر ساغرِ شراب خریدے۔ کیونکہ بازارِ میخانہ میں جامِ مے ایسا سودا ہے جو یہی قیمت چاہتا ہے۔

(۵) تلاطمِ آب سے آندھی یعنی طوفانِ ہوا کو تشبیہ دی ہے اور چراغ سے مرجان کو۔ اور چراغِ روشن۔ غمِ عشق سے استعارہ ہے مطلب ہے کہ جس طرح تلاطمِ آب سے چراغِ مرجان گل نہیں ہوتا اسی طرح صرصرِ حوادث و آلام سے چراغِ عشق نہیں بجھتا گویا آغوشِ غم ہی میں عشاق کی پرورش ہوتی ہے۔

خموشیوں میں تماشا ادا نکلتی ہے	۱	نگاہ دل سے تری سرمہ سا نکلتی ہے
فشارِ تنگیِ خلوت سے بنتی ہے شبنم	۲	صبا جو غنچے کے پردہ میں جا نکلتی ہے
نہ پوچھ سینۂ عاشق سے آبِ تیغِ نگاہ	۳	کہ زخمِ روزنِ در سے ہوا نکلتی ہے

(۱) خموشیوں سے یہاں ضبطِ آہ مراد ہے۔ یعنی آہیں رُکی ہوئی ہیں۔ دھواں گھٹا ہوا ہے۔ اب جو معشوق کی نگاہ دل میں اترتی ہے تو اس دھوئیں سے کاجل لگ جاتا ہے اور دل سے سرمہ لگائے ہوئے نکلتی ہے۔ خموشی سے اسی ادا کے پیدا ہونے کی طرف شعر میں اشارہ ہے۔

(۲) غنچہ کی بستگی کو تنگیٔ خلوت سے تشبیہ دی۔ دبنے اور بھچنے سے پسینہ آجاتا ہے۔ مطلب ہے کہ صبا جب خلوت خانۂ غنچہ میں جا نکلتی ہے تو پسینہ پسینہ ہو جاتی ہے۔ اور یہی پسینہ شبنم کہلاتا ہے۔

(۳) وہ زخم جو سانس دینے لگے بہت مہلک ہے۔ اس زخم کو روزن در سے تشبیہ دی گئی ہے۔ مطلب ہے کہ تیغ نگاہ کی تیزی کو کیا پوچھتے ہو جس نے زخم کو ہوا دار روزن بنا دیا ہے۔

جس جا نسیم شانہ کشِ زلفِ یار ہے	۱	نافہ دماغِ آہوئے دشتِ تتار ہے
کس کا سراغِ جلوہ ہے حیرت کو اے خدا	۲	آئینہ فرشِ شش جہت انتظار ہے
ہے ذرہ ذرہ تنگیٔ جا سے غبارِ شوق	۳	گر دام یہ ہے وسعتِ صحرا شکار ہے
دل مدعی و دیدہ بنا مدعا علیہ	۴	نظارے کا مقدمہ پھر روبکار ہے
چھڑکے ہے شبنم آئینۂ برگِ گل پر آب	۵	اے عندلیب وقت وداعِ بہار ہے
پچ آپڑی ہے وعدۂ دلدار کی مجھے	۶	وہ آئے یا نہ آئے پہ یاں انتظار ہے
بے پردہ سوئے وادیٔ مجنوں گزر نہ کر	۷	ہر ذرے کے نقاب میں دل بے قرار ہے
اے عندلیب یک کفِ خس بہرِ آشیاں	۸	طوفانِ آمد آمدِ فصلِ بہار ہے
دل مت گنوا خبر نہ سہی سیر ہی سہی	۹	اے بے دماغ آئینہ تمثال دار ہے
۱۰	غفلت کفیلِ عمر و اسدؔ ضامنِ نشاط اے مرگِ ناگہاں تجھے کیا انتظار ہے	

(۱) معشوق کی زلفوں میں نسیم کے سرایت ہونے کو شانہ کشی سے تعبیر کرتے ہیں۔ مطلب ہے کہ جہاں نسیم زلفوں سے مشکبو ہو کر چلتی ہو۔ وہاں شامۂ آہو مشک بن جاتی ہے اور دماغ آہو نافہ۔

(۲) حیرت اور آئینہ کی رعایت ظاہر ہے۔ مطلب ہے کہ اے خدا!

حیرت کو کس کے جلوہ کی تلاش اور کس کا انتظار و سراغ ہے کہ سارا عالم آئینہ بنا ہوا ہے۔

(۳) جوشِ شوق۔ دیوانگی کی حد تک پہنچ گیا ہے اور دیوانگیٔ شوق نے خاک اُڑانی شروع کی ہے۔ صحرا میں جگہ کم ہے اس لئے غبارِ ذرّہ کے برابر ہے۔ اور جگہ حلقۂ دام کے برابر۔ مطلب ہے کہ اگر ایسی تنگی جا ہے تو اسی حلقہ میں تمام صحرا کی وسعت شکار ہو جائیگی۔ گویا تمام صحرا ایک حلقۂ دام ہو جائے گا۔ جس میں دیوانگیٔ شوق کی خاک اُڑانے کی حسرت پوری نہ ہوگی۔

(۴) یعنی دل نے آنکھوں کو الزام دیا ہے کہ انہوں نے دیدار کرکے اس مصیبت عشق میں پھنسا دیا۔

(۵) سفر کے وقت آئینہ پر پانی چھڑکنے کی کوئی رسم ہے۔ اُسی تلازمہ سے آئینہ برگِ گل پہ آبِ شبنم گویا بہار کی علامتِ سفر ہے۔

(۶) ہر ذرّہ کے نقاب میں یا ہر ذرّہ کے لباس و شکل میں ایک ایک دلِ بیقرار ہے گویا ساری وادی جذباتِ عشقِ مجنوں سے معمور ہے۔ لیلیٰ کو بے محابا اور بے پردہ نہ جانا چاہیئے۔

(۸) یعنی اے عندلیب ایک کفِ خس لاکر آشیان بنالے ورنہ جوشِ بہار سے ہر خس شاخِ گل ہو جائے گا یا اے عندلیب تو ایک کفِ خس کا آشیانہ بنا رہی ہے اور اس جوشِ بہار میں جبکہ سارا زمانہ گلستاں ہو گیا ہے تو نے شاخہائے گل سے اپنا آشیانہ نہ بنایا۔

(۹) تحیر یہاں بمعنی علم و معرفت ہے دل میں انوار و تجلیات کا پرتو

ہوتا ہے۔ دل کو آئینہ کہا جاتا ہے۔ اور اس پرتوِ تجلیات کو تمثال سے تعبیر کیا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ شکستہ خاطر نہ ہو اور آئینۂ دل کو ضائع نہ کر۔ معرفت نہ سہی۔ اے کم عقل اور کم ذوق پرتوِ تجلیات کی سیر کر لے۔

(۱۰) عیش و غفلت یا مستی و بے خبری میں عمرِ طبیعی کے بعد بھی اگر موت آئے تو مرگِ ناگہاں معلوم ہوگی۔ یہی مطلب ہے کہ غفلت عمر سے وابستہ ہے۔ اور میں نشاط و مستی میں محو ہوں اے مرگِ ناگہاں اب تجھے کیا انتظار ہے۔ کیونکہ تیری ناگہانی کے اسباب جمع ہیں۔

آئینہ کیوں نہ دوں کہ تماشا کہیں جسے	۱	ایسا کہاں سے لاؤں کہ تجھ سا کہیں جسے
حسرت نے لا رکھا تری بزمِ خیال میں	۲	گلدستۂ نگاہ سویدا کہیں جسے
پھونکا ہے کس نے گوشِ محبت میں اے خدا	۳	افسونِ انتظار تمنا کہیں جسے
سر پر ہجومِ دردِ غریبی سے ڈالیے	۴	وہ ایک مشتِ خاک کہ صحرا کہیں جسے
ہے چشمِ تر میں حسرتِ دیدار سے نہاں	۵	شوقِ عناں گسیختہ دریا کہیں جسے
درکار ہے شگفتنِ گلہائے عیش کو	۶	صبحِ بہار پنبۂ مینا کہیں جسے
غالب برا نہ مان جو واعظ برا کہے ایسا بھی کوئی ہے کہ سب اچھا کہیں جسے	۷	

(۱) یعنی تجھ جیسا کوئی حسین تو ہے نہیں، آئینہ تیرے ہاتھ میں دیئے دیتا ہوں تاکہ تو خود حیرانِ تماشا ہو جائے۔

(۲) دل کے نقطۂ سیاہ کو سویدا کہتے ہیں۔ آنکھ کی پتلی اور سویدا میں تشبیہ ہے۔ عاشق کا دل [illegible] تنہائی ہوتا ہے جس میں محبوب

مسند نشین رہتا ہے۔ گلدستہ بھی لوازمات بزم میں سے ہے سویدائے چشم خیال میں سے سینکڑوں حسرت بھری نگاہیں شوق دیدار میں نکل رہی ہیں۔ جن کو گلدستہ سے تشبیہ دی ہے گویا یہ گلدستہ حسرت نے اس کے بزم خیال میں لاکر رکھ دیا ہے۔

(۳) "کان میں افسوں پھونکنا" محاورہ ہے جس کے معنے آمادہ کرنے اور ہم خیال بنا لینے کے ہیں۔ مطلب ہے کہ خدا جانے یہ افسون انتظار جس کو تمنا کہنا چاہیئے محبت کے کان میں کس نے پھونک دیا ہے کہ محبت یکسر انتظار و تمنا ہو گئی ہے۔

(۴) "خاک بر سر کردن" فارسی محاورہ ہے جس کے معنے بھلا دینے کے ہیں۔ مطلب ہے کہ غربت اور آوارہ وطنی کے وفور غم سے سارے صحرا میں خوب خاک اڑائی۔ صحرا جو وفور اور ہجوم غم کے مقابلہ میں ایک مشت خاک سے زیادہ وقعت نہیں رکھتا یہی مشت خاک ہے کہ غربت کے سر پر ڈال دیتے یعنی غربت کے غم کو فراموش کر کے یہیں گھر بنا لیتے۔ دوسرا پہلو یہ ہے کہ ایسا ہجوم غم ہے کہ صحرا ایک مشت خاک معلوم ہوتا ہے جس کو اپنے سر پر اس غم میں ڈالتا ہوں۔

(۵) "عنان گسیختہ" سے چلنے کے لئے باگ چھوڑے ہوئے یعنی تیار۔ شوق عنان گسیختہ سے یہاں شوق مائل بگریہ مراد ہے۔ مطلب ہے کہ حسرت دیدار سے ایک شوق گریہ بار آنکھوں میں موجزن ہے۔

(۶) یعنی جس طرح پھول کھلنے کے لئے صبح بہار کی ضرورت ہے۔

اسی طرح گلہائے عیش کھلنے کے لئے سفیدۂ پنبۂ مینا ضروری ہے۔
(۷) یعنی واعظ کے برا کہنے کا برا نہ ماننا چاہئے۔ کیونکہ دنیا میں ایسا کوئی نہیں جس کو سب اچھا کہتے ہوں۔ اور اچھے سے اچھے شخص کو کوئی نہ برا کہنے والا ضرور ہوتا ہے۔

شبنم بہ گلِ لالہ نہ خالی ز ادا ہے	۱	داغِ دلِ بیدرد نظرگاہِ حیا ہے
دل خوں شدۂ کشمکشِ حسرتِ دیدار	۲	آئینہ بدستِ بتِ بدمستِ حنا ہے
شعلے سے نہ ہوتی ہوسِ شعلہ نے جو کی	۳	جی کس قدر افسردگیِ دل پہ جلا ہے
تمثال میں تیری ہے وہ شوخی کہ بصد شوق	۴	آئینہ باندازِ گل آغوش کشا ہے
قمری کفِ خاکستر و بلبل قفسِ رنگ	۵	اے نالہ نشانِ جگرِ سوختہ کیا ہے
خو نے تری افسردہ کیا وحشتِ دل کو	۶	معشوقی و بے حوصلگی طرفہ بلا ہے
مجبوری و دعوائے گرفتاریِ الفت	۷	دستِ تہِ سنگ آمدہ پیمانِ وفا ہے
معلوم ہوا حالِ شہیدانِ گزشتہ	۸	تیغِ ستم آئینۂ تصویر نما ہے
اے پرتوِ خورشیدِ جہاں تاب ادھر بھی	۹	سائے کی طرح ہم پہ عجب وقت پڑا ہے
ناکردہ گناہوں کی بھی حسرت کی ملے داد	۱۰	یارب اگر ان کردہ گناہوں کی سزا ہے
	۱۱	بیگانگیِ خلق سے بیدل نہ ہو غالب کوئی نہیں تیرا تو مری جان خدا ہے

(۱) یعنی لالہ کے پھول پر شبنم بے وجہ نہیں، بلکہ اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ یہ داغ جو درد نہیں رکھتا، اپنے بیدرد ہونے پر محجوب ہے، اور شبنم قطرۂ عرقِ شرم ہے!
(۲) "بدمستِ حنا" نشۂ رنگِ حنا میں چور۔ یا اپنے ہاتھ میں شوخیِ رنگِ حنا دیکھ کر مغرور ہو جانے والا۔ دلِ خوں شدہ، اور شوقِ

رنگِ حنا میں، رنگ وجہ شبہ ہے۔ دل، اور آئینہ کی رعایت ظاہر ہے۔ مطلب ہے کہ ایک ہمارا آئینہ دل ہے، کہ کشاکش حسرت دیدار میں خون ہو رہا ہے، اور ایک وہ بھی آئینہ ہے جس کو وہ خود اپنے حنا مالیدہ ہاتھ میں لئے ہوئے دیکھ رہے ہیں!

(۳) یعنی اس افسردگی پر، کہ سوزِ عشق میں اشتعال و جوش نہیں، اور جی بجھ سا گیا، دل بہت ہی جلتا ہے، اتنا جلتا ہے کہ خود سوزِ عشق سے بھی شاید اتنا نہ جلتا!

(۴) یعنی تیرے عکسِ عارض، اور پرتو رخسار سے آئینہ گلابی ہو گیا ہے، اور ذوق و شوق، ہیں گل کی طرح آغوش کشا معلوم ہوتا، اور تیرا سراپا اس آغوش شوق میں نظر آتا ہے!

(۵) "نالہ" سے عشق مراد ہے۔ قمری، بلبل، اور جگر، نالوں کے مختلف پیکر ہیں ــــ قمری کو فارسی والے بالعموم کفِ خاکستر لکھتے ہیں۔ "بلبل قفس رنگ" یعنی بلبل مبتلائے عشقِ گل۔ رنگ سے رنگِ گل مفہوم ہے۔ مطلب ہے کہ [illegible] عشق [illegible] بھی جو کفِ خاکستر ہے اور بلبل جس کو قفس رنگ کہنا چاہیئے، [illegible] آزاد، اور [illegible] عشق میں مشہور ہیں، مگر ہمارا جگر جو رنگِ خون بھی رکھتا تھا، اور جس کو تیرے جلا کر خاکستر بھی کر دیا، اس کے محبوب و مطلوب کا کوئی نشان نہیں!

(۶) "وحشتِ دل" سے دیوانہ پن کی امنگ مراد ہے۔ مطلب ہے کہ تیری بدخوئی اور برہمی مزاج نے دل بجھا دیا۔ اور [illegible] ہے "معشوق شوخ و عاشق دیوانہ چاہیئے" ورنہ معشوق کی بے [illegible]

بڑی مصیبت ہوتی ہے!

یعنی عشق پر تو اختیار نہیں، کیونکہ یہ تو وہ آتش ہے "کہ لگائے نہ لگے، اور بجھائے نہ بنے"۔ اور دعویٰ یہ ہے کہ ہم محبت کرتے ہیں اور عہدِ وفا سے ہاتھ نہیں اُٹھاتے، در آنحالیکہ پتھر کے نیچے ہاتھ دب گیا ہے، اور فرماتے ہیں کہ ہم خود نہیں نکالتے!

(۷) یعنی تیغِ ستم آئینہ ہے، جس میں پچھلے مقتولین کی صورتیں نظر آتی ہیں۔

(۸) سایہ کی اُفتادگی سے وقت پڑنے کی تمثیل و تشبیہ ہے۔ آفتاب کے سامنے سایہ نہیں ٹھہرتا، اپنے ملجائے کرم، کو "پرتوِ خورشید جہاں تاب" کے الفاظ سے تعبیر کیا ہے۔

۱	منظور تھی یہ شکل تجلی(۱) کو نور کی	قسمت کھلی ترے قد و رُخ سے ظہور کی
۲	اک خونچکاں کفن میں کروڑوں بناؤ ہیں	پڑتی ہے آنکھ تیرے شہیدوں پہ حور کی
۳	واعظ نہ تم پیو، نہ کسی کو پلا سکو	کیا بات ہے تمہاری شراب طہور کی
۴	لڑتا ہے مجھ سے حشر میں قاتل کہ کیوں اُٹھا	گویا ابھی سُنی نہیں آواز صور کی
۵	آمد بہار کی ہے کہ بلبل ہے نغمہ سنج	اُڑتی سی اک خبر ہے زبانی طیور کی
۶	گو واں نہیں، پہ واں کے نکالے ہوئے تو ہیں	کعبہ سے ان بتوں کو بھی نسبت ہے دور کی
۷	کیا فرض ہے کہ سب کو ملے ایک سا جواب	آؤ نہ ہم بھی سیر کریں کوہ طور کی
۸	گرمی سہی کلام میں لیکن نہ اس قدر	کی جس سے بات اُس نے شکایت ضرور کی

غالبؔ گر اس سفر میں مجھے ساتھ لے چلیں
حج کا ثواب نذر کروں گا حضور کی

(۱) یہ شکل کا اشارہ سراپائے حضورِ رسالتؐ کی جانب ہے۔ "تجلی"

جلوہ آرائی۔ مطلب ہے کہ معشوق حقیقی کو اپنے انوار کی جلوہ آرائی یا جمال نمائی یا نمود اس شکلِ اقدس میں منظور تھی اور آپ کے قدِ زیبا اور روئے تاباں سے ظہور کی قسمت کھل گئی۔

(۲) کفن جیسا سادہ لباس اُس پر خونِ شہادت کی افشاں۔ اسی میں کروڑوں بناؤ ہیں کہ تیرے شہدا پر حوروں کی للچائی ہوئی نگاہیں پڑتی ہیں۔

(۳) "نہیں" کیا بات ہے" تمسخر اور استہزا کے طور پر استعمال ہوا ہے۔ اور یہ معنی بھی مترشح ہوتے ہیں کہ ایسی شراب کا ذکر ہی کیا جو نہ خود پیتے ہو نہ کسی کو پلاتے ہو۔

(۴) قاتل کا مزاج ایسا لاؤبالی ہے کہ صور کی آواز بھی نہ سُنی یا اُس کے لاؤبالی پن پر طنز کیا ہے کہ ابھی تک قاتلانہ غرور باقی ہے۔ کہ آوازِ صور نہیں سُنی۔ اور یہ نہیں معلوم کہ وقتِ داد و فریاد ہے خود اس کو مجرم کی حیثیت سے خدا کے سامنے پیش ہونا ہے۔

(۵) بلبلوں کے نغمہ سنجی کی آواز جو کان میں آتی ہے اُس کو اُڑتی سی خبر زبانیِ طیور کی کہا ہے اور خوب کہا ہے۔

(۷) یعنی یہ فرض نہیں ہے کہ وہ سب سے لن ترانی فرماتے رہیں آؤ ہم بھی قسمت آزمائی کر لیں۔

(۸) یعنی زبان میں اتنی شوخی و طراری نہ ہونی چاہیئے کہ جو منہ میں آئے وہ کہہ ڈالیں اس سے جو کوئی بات کرتا ہے اُس کی بدزبانی کی شکایت ضرور کرتا ہے۔

غم کھانے میں بودا دلِ ناکام بہت ہے
(۱)
یہ رنج کہ کم ہے مئے گلفام بہت ہے

کہتے ہوئے ساقی سے حیا آتی ہے ورنہ
(۲)
ہے یوں کہ مجھے دُردِ تہ جام بہت ہے

نے تیر کماں میں ہے نہ صیّاد کمیں میں
(۳)
گوشہ میں قفس کے مجھے آرام بہت ہے

کیا زُہد کو مانوں کہ نہ ہو گرچہ ریائی
(۴)
پاداشِ عمل کی طمعِ خام بہت ہے

ہیں اہلِ خرد کس روشِ خاص پہ نازاں
(۵)
پابستگیٔ رسم و رہِ عام بہت ہے

زمزم ہی پہ چھوڑو مجھے کیا طوفِ حرم سے
(۶)
آلودہ بہ مے جامۂ احرام بہت ہے

ہے قہر گر اب بھی نہ بنے بات کہ اُن کو
(۷)
انکار نہیں اور مجھے ابرام بہت ہے

خوں ہو کے جگر آنکھ سے ٹپکا نہیں اے مرگ
(۸)
رہنے دے مجھے یاں کہ ابھی کام بہت ہے

ہوگا کوئی ایسا بھی کہ غالبؔ کو نہ جانے
(۹)
شاعر تو وہ اچھا ہے پہ بدنام بہت ہے

(۱) یعنی دل غم کھانے میں بہت کمزور ہے۔ شراب کی کمی کا غم بھی اس کے لئے بہت ہے۔

(۲) "دُردی کش" اُن سے لوگوں کو کہتے ہیں جو تلچھٹ تک نہیں

چھوڑتے تھے۔

(۳) یعنی قفس گوشۂ عافیت تو ہے کہ نہ تیر کمان میں نظر آتے ہیں نہ صیاد ذناک میں۔

(۴) یعنی میں زہد کی وقعت کیا کروں۔ ریائی نہ بھی سہی اور لوگوں کے لیئے دام تزویر نہ بھی ہو۔ پھر بھی اجر آخرت کا لالچ خلوص کے منافی ہے:۔

طاعت میں تا رہے نہ مے و انگبیں کی لاگ
دوزخ میں ڈال دو کوئی لے کر بہشت کو

(۵) یعنی وہ لوگ جن کو اس دُنیا میں اپنی ہوشیاری اور عقل کا دعویٰ ہے نہیں معلوم کس روش خاص پر نازاں ہیں۔ کوئی خصوصیت تو نظر نہیں آتی۔ سب کے سب رفتار زمانہ کے پیرو اور رسم و رواج کے حلقہ بگوش ہیں۔

(۷) "ابرام" اصرار۔

(۸) یعنی ابھی گریہ میں جگر کا خون بہا دینے کا کام میرے ذمہ باقی ہے۔

(۱)
مدت ہوئی ہے یار کو مہماں کیئے ہوئے
جوشِ قدح سے بزم چراغاں کیئے ہوئے

(۲)
کرتا ہوں جمع پھر جگرِ لخت لخت کو
عرصہ ہوا ہے دعوتِ مژگاں کیئے ہوئے

(۳)
پھر وضعِ احتیاط سے رُکنے لگا ہے دم
برسوں ہوئے ہیں چاک گریباں کیئے ہوئے

(۴)
پھر گرم نالہ ہائے شرر بار ہے نفس

مدت ہوئی ہے سیر چراغاں کئے ہوئے

پھر پرسشِ جراحتِ دل کو چلا ہے عشق
سامانِ صد ہزار نمکداں کئے ہوئے (۵)

پھر بھر رہا ہے خامۂ مژگاں بخونِ دل
سازِ چمن طرازیٔ داماں کئے ہوئے (۶)

باہمدگر ہوئے ہیں دل و دیدہ پھر رقیب
نظارہ و خیال کا ساماں کئے ہوئے (۷)

دل پھر طوافِ کوئے ملامت کو جائے ہے
پندار کا صنم کدہ ویراں کئے ہوئے (۸)

پھر شوق کر رہا ہے خریدار کی طلب
عرضِ متاعِ عقل و دل و جاں کئے ہوئے (۹)

دوڑے ہے پھر ہر ایک گل و لالہ پر خیال
صد گلستاں نگاہ کا ساماں کئے ہوئے (۱۰)

پھر چاہتا ہوں نامۂ دلدار کھولنا
جاں نذرِ دلفریبیٔ عنواں کئے ہوئے (۱۱)

مانگے ہے پھر کسی کو لبِ بام پر ہوس
زلفِ سیاہ رخ پہ پریشاں کئے ہوئے (۱۲)

چاہے ہے پھر کسی کو مقابل میں آرزو
سرمے سے تیز دشنۂ مژگاں کئے ہوئے (۱۳)

اک نوبہارِ ناز کو تاکے ہے پھر نگاہ
چہرہ فروغِ مے سے گلستاں کئے ہوئے (۱۴)

پھر جی میں ہے کہ در پہ کسی کے پڑے رہیں
سر زیرِ بارِ منتِ درباں کئے ہوئے (۱۵)

جی ڈھونڈھتا ہے پھر وہی فرصت کے رات دن
بیٹھے رہیں تصورِ جاناں کئے ہوئے (۱۶)

غالبؔ ہمیں نہ چھیڑ کہ پھر جوشِ اشک سے
بیٹھے ہیں ہم تہیۂ طوفاں کئے ہوئے (۱۷)

(۱) "جوشِ قدح" ساغر کے متواتر دور۔ شراب کو آتش اور آتشیں کہتے ہیں اس لئے ساغر کی چراغ سے تشبیہ ہے۔

(۲) یعنی جگر کے ٹکڑے جمع کر کے اب پھر مژگانِ یار کی دعوت کرتا ہوں۔

(۳) یعنی پاسِ وضع اور ضبط سے دم گھٹا جاتا ہے۔ طبیعت الجھتی ہے۔ مدت سے گریبان چاک نہیں کیا۔

(۴) نالہ کا وصف شعرا کے یہاں شرر باری مسلم ہے۔ چراغاں اور نالہ میں شرر باری مشترک و مشابہ ہے۔

(۵) یعنی عشق اس قدر اہتمام سے جراحتِ دل کی پرسش کو چلا ہے گویا عشق کے پرانے زخموں میں پھر تازگی اور لذت پیدا ہو رہی ہے۔

(۶) "چمن طرازی" سے نقش و نگار بنانے مراد ہیں۔ یعنی مژگانِ خوں فشاں سے دامن کو گلستان بنانے کی تیاری ہے۔

(۷) آنکھ نظارہ کا سامان کر رہی ہے اور دل وصل کا خیال کرتا ہے۔ دونوں آپس میں رقیب ہو گئے ہیں۔

(۸) "پندار" نیکی یا نیک کرداری سے نفس میں غرور پیدا ہوتا ہے۔

لوگ اُس کو اچھا سمجھتے اور وہ خود کو اچھا جانتا ہے۔ اس کیفیت کو پندار کہتے ہیں۔ یہ غیریت اور خودی کے بتوں کا مجموعہ ہے۔ کیونکہ ہر وہ وجود جو خدا کے سوا ہو صنم ہے۔ اسی لئے پندار کا صنم کدہ لکھا ہے۔ اس کے برعکس جس سے لوگ نفرت کرتے ہیں اور جس کے عیوب پر نکتہ چینیاں ہوتی اور ملامت کی جاتی ہے اُس شخص کے دل میں شرمندگی انکسار اور رجوع و خشوع کے جذبات برانگیختہ ہوتے ہیں۔ پس صنم کدۂ پندار کے بالمقابل کوئے ملامت یقیناً کعبہ کی حیثیت رکھتی ہے مطلب یہ ہے کہ عاصیوں کا خانۂ سیاہ پوش عصیاں جو کہ کوئے ملامت میں ہے صنم کدۂ پندار ویران کر کے دل اُسکی طرف جاتا ہے۔

(۹) یعنی پھر عقل و دین اور دل فروشی کا بازار گرم اور شوق کسی خریدارِ طرح دار کا منتظر ہے۔

(۱۰) گویا ہر نگاہ میں ایک ایک سبز باغ تمنا کا سامان ہے اور خیال بار بار گل و لالہ (معشوقوں سے استعارہ ہے) پر دوڑتا ہے۔

(۱۱) یعنی معشوق کا ایسا خط کھولنا چاہتا ہوں، جس کا عنوان ہی پڑھ کر جان نذر کر دوں۔

(۱۳) "نو بہار ناز" جس کے حسن میں تازہ تازہ یا پہلے پہل بہار آئی ہو۔ "چہرہ فروغِ مے سے گلستاں کئے ہوئے" یعنی سرور نشاطِ مے سے چہرہ شاداب و تاباں کئے ہوئے۔

(۱۵) یعنی دل چاہتا ہے کہ کسی معشوق کے دروازہ پر دربان کے قدموں پہ سر رکھ کر خوشامد کرتے رہیں اور پڑے رہیں۔

(۱۶) یعنی دل ایسی فرصت کا طالب ہے کہ دن رات تصورِ جاناں کے سوا کوئی دوسرا شغلِ زندگی ہی نہ ہو۔

(۱۷) یعنی جوشِ اشک سے ایک دریائے متلاطم بہا دینے کا ارادہ کئے ہوئے ہے۔

نوید امن ہے بیدادِ دوست جاں کے لئے
(۱)
رہی نہ طرزِ ستم کوئی آسماں کے لئے

بلا سے گر مژۂ یار تشنۂ خوں ہے
(۲)
رکھوں کچھ اپنی بھی مژگانِ خونفشاں کیلئے

وہ زندہ ہم ہیں، کہ ہیں روشناسِ خلق اے خضر
(۳)
نہ تم، کہ چور بنے عمرِ جاوداں کے لئے

رہا بلا میں بھی میں مبتلائے آفتِ رشک
(۴)
بلائے جاں ہے ادا تیری اک جہاں کیلئے

فلک نہ دور رکھ اس سے مجھے کہ میں ہی نہیں
(۵)
درازدستیٔ قاتل کے امتحاں کے لئے

مثال یہ مری کوشش کی ہے، کہ مرغِ اسیر
(۶)
کرے قفس میں فراہم خس آشیاں کیلئے

گدا سمجھ کے وہ چپ تھا مری جو شامت آئے
(۷)
اٹھا اور اٹھ کے قدم میں نے پاسباں کے لئے

بہ قدرِ شوق نہیں ظرف تنگنائے غزل
(۸)
کچھ اور چاہیئے وسعت مرے بیاں کیلئے

دیا ہے خلق کو بھی تا اسے نظر نہ لگے
(۹)

بنا ہے عیش تجمل حسین خاں کے لئے

زباں پہ بارِ خدایا، یہ کس کا نام آیا (۱۰)
کہ میرے نطق نے بوسے مری زباں کیلئے

نصیرِ دولت و دیں، اور معینِ ملت و ملک (۱۱)
بنا ہے چرخِ بریں جس کے آستاں کے لئے

زمانہ عہد میں اُس کے ہے محوِ آرایش (۱۲)
بنیں گے اور ستارے اب آسماں کے لئے

ورق تمام ہوا اور مدح باقی ہے (۱۳)
سفینہ چاہیئے اس بحرِ بیکراں کے لئے

ادائے خاص سے غالب ہوا ہے نکتہ سرا (۱۴)
صلائے عام ہے یارانِ نکتہ داں کیلئے

(۱) "نویدِ امن" مژدۂ امن یعنی تمام ستم معشوق ہی ختم کئے دیتا ہے۔ اور فلک کو ظلم کرنے کا کوئی پہلو باقی نہیں رہتا اس لئے دوست کا ظلم پیغامِ امن ہے۔ کہ جورِ چرخ سے مامون ہو گئے۔

(۲) یعنی اگرچہ معشوق کی مژگاں بھی خونِ دل کی پیاسی ہے۔ مگر مجھے گریہ خونیں کے لئے خون بچا لینا ضروری ہے۔

(۳) یعنی چوری چھپے کا جینا ہی کیا۔ چاہے عمرِ جاوداں ہی کیوں نہ ہو۔ پس اے خضر زندہ تو ہم ہیں کہ ساری دنیا ہمیں پہچانتی ہے اگرچہ عمر کم ہے۔

(۴) یعنی یہ دیکھنے کے لئے کہ قاتل کس قدر بڑھ بڑھ کر قتل کرتا ہے مجھ کو قاتل سے دور نہ رکھ درازدستی کا امتحان

دوسروں پر کرلے۔

(۵) یعنی رشک ہے کہ تیرے ستم سارے زمانہ پر کیوں ہوں۔ مجھ ہی پر کیوں نہ ہوں۔

(۶) یعنی اس دنیا میں ہمارا دولت یا اسباب معیشت جمع کرنا وہی حیثیت رکھتا ہے۔ کہ ایک طائر گرفتار قفس میں آشیانے کے لئے تنکے جمع کرے۔

(۷) یعنی پہلے تو وہ مجھے فقیر جان کر خاموش تھا۔ قسمت میں جو دھکے کھانے تھے میں پاسبان کے قدموں پر گر پڑا۔ وہ سمجھ گیا کہ ان کا عاشق ہے۔ اور گھر میں جانے کی اجازت چاہتا ہے بس پھر کیا تھا۔

(۸) "تنگ نائے" پانی کا وہ محدود حصہ جو ساحل میں سے دور دور تک گزرتا ہو۔ مطلب یہ ہے کہ شوق کے مقابلہ میں غزل میں مضامین نہیں سما سکتے۔ اب قصیدہ کی روش اختیار کرتا ہوں۔

(۹) یعنی عیش بنا تو تجمل حسین خاں ہی کے لئے ہے۔ لیکن دوسرے لوگوں کو بھی کچھ تھوڑا بس لئے مل گیا ہے کہ ان کے عیش کو نظر نہ لگے۔

(۱۰) شعر ما سبق میں تجمل حسین خاں کا نام آچکا ہے۔ پھر بنا بہ مسرت کے اظہار کے لئے استفہام استعمال کیا ہے کہ یہ کس کا نام ہے۔ جو میری قوت گویائی میری زبان کے بوسے لیتی ہے۔

(۱۱) نصیر و معین کے معنی مددگار کے ہیں اور یہ عہدہائے سلطنت کے مصطلح نام ہیں۔

(۱۲) اس کے زمانہ میں سارے جہان پر رونق چھا گئی ہے اور تمام

دُنیا آرائشوں میں مصروف ہے۔ کچھ تعجب نہیں کہ چرخ پیر کو نئے ستارہ میسّر آجائیں۔

(۱۳۶) "ورق" "تختہ" کاغذ اور "کشتی" بھی تختوں کی ہوتی ہے۔ "بحر بیکراں" وہ دریا جس کا کنارہ نامعلوم ہو۔ مطلب ہے کہ بحر بیکرانِ مدح کے لئے تختۂ کاغذ تو ختم ہو گیا سفینہ چاہئے۔

(۱۴۰) یعنی احباب کو اذن وصلا ہے کہ وہ بھی اس طرح طرح لکھا کریں جس اداسے خاص سے غالب نے نکتہ سرائیاں اور مضمون آفرینیاں کی ہیں۔

غزلیاتِ تمام

قصائد، قطعات

اور

متفرقات غالب

قصیدہ اوّل

در منقبت

(۱)
ساز یک ذرہ نہیں فیضِ چمن سے بیکار
سایۂ لالۂ بے داغ سویدائے بہار

(۲)
مستیٔ بادِ صبا سے ہے بعرضِ سبزہ
ریزۂ شیشۂ مے جوہرِ تیغِ کہسار

(۳)
سبز ہے جامِ زمرد کی طرح داغِ پلنگ
تازہ ہے ریشۂ نارنج صفت رشتۂ شرار

(۴)
مستیٔ ابر سے گلچینِ طرب ہے حسرت
کہ اس آغوش میں ممکن ہے دو عالم کا فشار

(۵)
کوہ و صحرا ہمہ معموریٔ شوقِ بلبل
راہِ خوابیدہ ہوئی خندۂ گل سے بیدار

(۶)
سونپے ہے فیضِ ہوا صورتِ مژگانِ یتیم
سرنوشتِ دو جہاں ابر بیک سطرِ غبار

(۷)
کاٹ کر پھینکیے ناخن تو بانداز ہلال
قوتِ نامیہ اس کو بھی نہ چھوڑے بیکار

(۸)
کفِ ہر خاک بہ گردوں شدہ قمری پرواز
دامِ ہر کاغذِ آتش زدہ طاؤس شکار

۹ میکدے میں ہو اگر آرزوئے گل چینی

بھول جا یک قدح بادہ بہ طاق گلزار

(١٠)
موجِ گل ڈھونڈھ بخلوت کدۂ غنچۂ باغ
گم کرے گوشۂ میخانہ میں گر تو دستار

(١١)
کھینچے گر مانیِ اندیشہ چمن کی تصویر
سبزہ مثلِ خطِ نوخیز ہو خطِ پرکار

(١٢)
لعل سے کی ہے پئے زمزمۂ مدحتِ شاہ
طوطیِ سبزۂ کہسار نے پیدا منقار

(١٣)
وہ شہنشاہ کہ جس کی پئے تعمیرِ سرا
چشمِ جبریل ہوئی قالبِ خشتِ دیوار

(١٤)
فلک العرش ہجومِ خمِ دوشِ مزدور
رشتۂ فیضِ ازل سازِ طنابِ معمار

(١٥)
سبزۂ نہ چمن و یک خطِ پشتِ لبِ بام
رفعتِ ہمتِ صد عارف و یک اوجِ حصار

(١٦)
واں کی خاشاک سے حاصل ہو جسے یک پرِ کاہ
وہ رہے مروحۂ بالِ پری سے بیزار

(١٧)
خاکِ صحرائے نجف جوہرِ سیرِ عرفا
چشمِ نقشِ قدم آئینۂ بختِ بیدار

(١٨)
ذرہ اس گرد کا خورشید کو آئینۂ ناز
گرد اس دشت کی امید کو احرامِ بہار

(١٩)
آفرینش کو ہے واں سے طلبِ مستیِ ناز
عرضِ خمیازۂ ایجاد ہے ہر موجِ غبار

مطلع ثانی

فیض سے تیرے ہے اے شمع شبستانِ بہار
(۲۰)
دلِ پروانہ چراغانِ پرِ بلبلِ گلزار

شکلِ طاؤس کرے آئینہ خانہ پرواز
(۲۱)
ذوق میں جلوے کے تیرے بہوائے دیدار

تیری اولاد کے غم سے ہے بروئے گردوں
(۲۲)
سلکِ اختر میں مہِ نو مژۂ گوہربار

ہم عبادت کو ترا نقشِ قدم مُہرِ نماز
(۲۳)
ہم ریاضت کو ترے حوصلے سے استظہار

مدح میں تیری نہاں زمزمۂ نعتِ نبیؐ
(۲۴)
جام سے تیرے عیاں بادۂ جوشِ اسرار

جوہرِ دستِ دُعا آئینہ یعنی تاثیر
(۲۵)
یک طرف نازشِ مژگاں و دگر سو غمِ خار

مردمک سے ہو عزا خانۂ اقبالِ نگاہ
(۲۶)
خاکِ در کی تری جو چشم نہ ہو آئینہ دار

دشمنِ آلِ نبی کو بطرب خانۂ دہر
(۲۷)
عرضِ خمیازۂ سیلاب ہو طاقِ دیوار

دیدہ تا دل اسد آئینۂ یک پرتوِ شوق
(۲۸)
فیضِ معنی سے خطِ ساغرِ راقم سرشار

(۱) یعنی فیضِ چمن (بہار) نے کسی شے کو بے مصرف نہیں رکھا۔ لالہ کا سایہ بے داغ، دلِ بہار کا "سویدا" معلوم ہوتا ہے۔

(۲) سبزہ زارِ چمن کو تشبیہاً جوہرِ تیغِ کہسار سمجھنا چاہیئے، بادِ صبا کی جولانی سے لہلہاتے ہیں ریزہ ہائے شیشہ سے معلوم ہوتے ہیں۔

(۳) چینہ کا داغ مثلِ جامِ زمرد ہے۔ اور شررِ مثلِ ریشۂ تاریخ۔

(۴) ہجومِ ابر سے حسرتِ دل اگلِ چینی سرور کرتی ہے اور چھائے ہوئے بادل پہ خیال ہوتا ہے کہ اس آغوش میں دونوں جہان کا فشار ممکن!

(۵) جنگل اور پہاڑ ترانہ ہائے عشقِ عندلیب سے معمور ہو گئے ہیں اور سنسان راستے پھولوں کے تختوں سے آباد ہو گئے ہیں۔

(۶) یعنی زمین کو ایک سطر بخطِ غبار سمجھنا چاہیئے، اور فیضِ ہوا، جو ابر تیار کرتا ہے، وہ دو جہان کی خوش نصیبوں کی تحریر کے برابر ہے، اسی طرح شبنم کی مژگانِ خاک آلود کی خاک کے بالمقابل اس کے اشکہائے بیکسی کا سلسلہ!

(۷) یعنی اگر ناخن بھی کاٹ کر پھینکا جائے، تو قوتِ نامیہ اس کو بھی بیکار نہ چھوڑے گی، بلکہ ہلال بنا دے گی!

(۸) "کاغذِ آتش زدہ" جلا ہوا کاغذ جس میں کچھ سوراخ اور کچھ سوکڑن پیدا ہو جاتے ہیں۔ دام سے تشبیہ ہے مطلب یہ ہے کہ ہر مشتِ خاک قمری بنکر آسمان کی طرف پرواز کناں ہے، اور کاغذِ آتش زدہ کا جال بھی طاؤسِ رقصاں کو شکار کر لیتا ہے! اگر طاؤس شعلۂ رقصاں سے استعارہ سمجھا جائے تو دامِ کاغذِ آتش زدہ طاؤس

شعلہ کا شکار کرنے والا کہنا چاہیئے!

(۹) یعنی شراب خانہ میں بیٹھے بیٹھے، اگر پھول توڑنے مقصود ہوں تو میخانہ کے نقش ونگار والے طاق پر ساغر شراب رکھ کر بھول جا تھوڑے ہی عرصہ میں طاق کے نقوش سبزہ وشاخ گل ہو جائینگے اور ساغر گل بن جائے گا۔

(۱۰) یعنی اگر گوشۂ میخانہ میں تیری دستار گم ہو گئی، تو اب تلاش دستار عبث ہے کیونکہ فیض موسم نے گوشۂ میخانہ کو تو غنچوں کے باغ کا خلوت کدہ بنادیا، اور دستار کو موج نکہت گل!

(۱۱) یعنی مصورِ خیال، اگر چمن کی تصویر کھینچے، تو پرکار تصورات کسی حسین کا سبزۂ خط بن جائے!

(۱۲) سبزہ زارِ کوہ کو طوطی، اور لعل (پتھر) کو منقارِ طوطی کہا ہے، گویا یہ طوطی کہسار حضرت مولیٰ علی کی مدح کرتی ہے!

(۱۳) وہ شہنشاہ، وہ عالیجناب ہے جس کی محلسرا کی تعمیر کے لئے چشم جبریل کے سانچہ کی ڈھلی ہوئی اینٹیں تیار ہوتی ہیں۔

(۱۴) اُس کی محلسرا کی تعمیر کے جو مزدور ہیں وہ اس قدر عالی مرتبہ ہیں کہ فلک العرش، ان کے بوجھ خم دوش کے برابر ہے، اور رشتۂ فیض ازل اُس کے معمار کی طناب، یا ڈوری ہے!

(۱۵) یعنی سبزۂ نہ افلاک، اُس کے پشت لب بام کا ایک خط ہے اور چار دیواری کی بلندی سینکڑوں عارفوں کی عالی ہمتی کی برابر ہے۔

(۱۶) وہاں کے خس وخاشاک میں سے اگر ایک تنکے کا ریشہ کسی کو میسر آجائے تو وہ بال پری کے پنکھے سے بیزار ہو جائے۔

(۱۷) یعنی صحرائے نجف کی خاک، رہروانِ معرفت کے لئے اکسیرِ سلوک ہے، اور خود راہرو کا نقشِ قدم اُس کے بختِ رسا کا آئینہ ہے۔

(۱۸) سرزمینِ نجف کا ایک ایک ذرّہ آفتاب کے لئے آئینہ ہے جس میں خود بینی کرتا ہے اور اِس جنگل کی خاک، اُمید کے لئے احرام ہے، کہ کعبۂ مقصود بہار کا طواف کرے!

(۱۹) زمین کی گردی شکل کو موجِ غبار سے تعبیر کیا ہے اور تشبیہاً خمیازۂ ایجاد کہا ہے "خمیازہ" خواہش و طلب کے آثار میں سے ہے مطلب ہے، کہ "ایجاد" موجِ غبار سے انگڑائیاں لیتی ہے اور خمار ظاہر کرتی ہے، یعنی عالمِ خلقت کو اس سرزمین سے، آفرینش پر ناز کرنے کی مستی مطلوب ہے!

(۲۰) یعنی اے آرام گاہِ بہار کی شمع! تیرے فیض سے پروانہ کا دل چراغاں بنا ہوا ہے اور پرِ بلبل گلزار، یعنی اُس کے دل میں چراغہائے عشقِ شمع روشن ہیں، اور اس کا پہلو وصلِ گل سے معمور!

(۲۱) "پرواز" محاورہ کے طور پر استعمال ہوا ہے، جس کے معنی اترانے اور ناز کرنے کے ہیں، اور لفظی رعایت سے، طاؤس سے تشبیہ ہے مطلب ہے کہ تیرے جلوہ کے ذوق میں آئینہ خانہ اُڑنے لگے۔ اور دیدار کی خواہش اُس کو طاؤسِ پراں بنا دے!

(۲۲) یعنی نجم امامین سے، ستاروں کی لڑی، چشمِ ہلال کی مژۂ اشکبار معلوم ہوتی ہے!

(۲۳) بے شک! عبادت کے لئے، تیرا نقشِ قدم سجدہ گاہ ہے یا فرمانِ قبولیت کی مُہر، اور ریاضت کے لئے تیرا حوصلہ، پشت پناہ!

(۲۴) تیری تعریف میں سرورِ کائنات کی توصیف کی صدا ہے، اور تیرے جام سے بادۂ اسرارِ معرفتِ الٰہی پُر جوش ہے!

(۲۵) تیرا دستِ دُعا آئینہ ہے، اور تاثیرِ اجابت اُس کا جوہر، پھر یہ جوہر ایک طرف تو حسینوں کی مژگاں کے لئے سرمایۂ ناز ہے، دُوسری طرف خار کے لئے باعثِ غم ہے، کہ مژگاں کی معشوقانہ ناوک فگنی اور چبھن اس سے زیادہ پُر تاثیر ہے!

(۲۶) جو آنکھ تیرے خاک در پر فرش نہ ہو، اُس کی سیاہ پوش پتلی بخت نگاہ و بصر کے لئے ماتم خانہ بن جائے۔

(۲۷) آلِ نبیؐ کے دُشمنوں کے لئے عشرت خانۂ دہر کا ہر طاق خمیازۂ طوفانِ حوادث ہو جائے!

(۲۸) آنکھوں سے دل تک پرتوِ شوق نے ایک آئینہ لگایا ہے اور معنی کے فیض نے، خطِ جامِ شعر کو سرشار و مست کر دیا ہے۔

قصیدۂ دوم

۱	دہر جز جلوۂ یکتائیِ معشوق نہیں	ہم کہاں ہوتے اگر حسن نہ ہوتا خودبیں
۲	بیدلی ہائے تماشا کہ نہ عبرت ہے نہ ذوق	بیکسی ہائے تمنا کہ نہ دُنیا ہے نہ دیں
۳	ہرزہ ہے نغمۂ زیر و بمِ ہستی و عدم	لغو ہے آئینۂ فرقِ جنون و تمکیں
۴	نقشِ معنی ہمہ خمیازۂ عرضِ صورت	سخنِ حق ہمہ پیمانۂ ذوقِ تحسیں
۵	لافِ دانش غلط و نفعِ عبادت معلوم	دُردِ یک ساغرِ غفلت ہے چہ دُنیا و چہ دیں
۶	مثلِ مضمونِ وفا باد بدستِ تسلیم	صورتِ نقشِ قدم خاک بفرقِ تمکیں
۷	عشق بے ربطیِ شیرازۂ اجزائے حواس	وصل زنگارِ رُخِ آئینۂ حسنِ یقیں
۸	کوہکن گرسنہ مزدورِ طرب گاہِ رقیب	بے ستوں آئینۂ خوابِ گرانِ شیریں
۹	کس نے دیکھا نفسِ اہلِ وفا آتش خیز	کس نے پایا اثر نالۂ دلہائے حزیں
۱۰	سامعِ زمزمۂ اہلِ جہاں ہوں لیکن	نہ سر و برگِ ستایش نہ دماغِ نفریں
۱۱	کس قدر ہرزہ سرا ہوں کہ عیاذاً باللہ	یک قلم خارجِ آداب و وقار و تمکیں
۱۲	نقشِ لاحول لکھ اے خامۂ ہذیاں تحریر	یا علیؑ عرض کر اے فطرتِ وسواس قریں
۱۳	مظہرِ فیضِ خدا جان و دلِ ختمِ رسل	قبلۂ آلِ نبی کعبۂ ایجادِ یقیں
۱۴	ہو وہ سرمایۂ ایجاد جہاں گرمِ خرام	ہر کفِ خاک ہو واں گردۂ تصویرِ زمیں
۱۵	جلوہ پرواز ہو نقشِ قدم اس کا جس جا	وہ کفِ خاک ہے ناموسِ دو عالم کی امیں
۱۶	نسبتِ نام سے اس کی ہے یہ رتبہ کہ رہے	ابدا پشتِ فلک خم شدۂ نازِ زمیں
۱۷	فیضِ خلق اس کا ہی شامل ہے کہ ہوتا ہے سدا	بوئے گل سے نفسِ بادِ صبا عطر آگیں
۱۸	برشِ تیغ کا اس کی ہے جہاں میں چرچا	قطع ہو جائے نہ سر رشتۂ ایجاد کہیں

کفر سوز اس کا وہ جلوہ ہے کہ جس سے ٹوٹے	۱۹	رنگ عاشق کی طرح رونق بتخانۂ چیں
جاں پناہا دل و جاں فیض رسانا شاہا	۲۰	وصیِ ختم رسل تو ہے بفتوائے یقیں
جسم اطہر کو ترے دوش پیمبر منبر	۲۱	نام نامی کو ترے ناصیۂ عرش نگیں
کس سے ممکن ہے تری مدح بغیر از واجب	۲۲	شعلۂ شمع مگر شمع پہ باندھے آئیں
آستاں پر ہے ترے جوہر آئینۂ سنگ	۲۳	رقم بندگی حضرت جبریل امیں
تیرے در کے لئے اسباب نثار آمادہ	۲۴	خاکیوں کو جو خدا نے دیئے جان و دل و دیں
تیری مدحت کیلئے ہیں دل و جاں کام و زباں	۲۵	تیری تسلیم کو ہیں لوح و قلم دست و جبیں
کس سے ہو سکتی ہے مداحی ممدوح خدا	۲۶	کس سے ہو سکتی ہے آرائش فردوس بریں
جنس بازار معاصی اسد اللہ اسد	۲۷	کہ سوا تیرے کوئی اس کا خریدار نہیں
شوخی عرض مطالب میں ہے گستاخ طلب	۲۸	ہے ترے حوصلۂ فضل پہ ازبسکہ یقیں
دے دعا کو مری وہ مرتبۂ حسن قبول	۲۹	کہ اجابت کہے ہر حرف پہ سو بار آمیں
غم شبیر سے ہو سینہ یہاں تک لبریز	۳۰	کہ رہیں خون جگر سے مری آنکھیں رنگیں
طبع کو الفت دلدل میں یہ سرگرمی شوق	۳۱	کہ جہاں تک چلے اس سے قدم اور مجھ سے جبیں
دل الفت نسب و سینۂ توحید فضا	۳۲	نگہ جلوہ پرست و نفس صدق گزیں
۳۳	صرف اعدا اثر شعلۂ دود دوزخ وقف احباب گل و سنبل فردوس بریں	

(۱) صوفیائے کرام کا عقیدہ ہے کہ تخلیق کائنات سے پہلے خدا نے اپنے جمال کو دیکھنا چاہا تو اس تماشائے دید سے یہ عالم ظہور پذیر ہوا شعر میں یہی تلمیح ہے کہ اگر حسن کو

اپنی خود بینی .... منظور

نہ ہوتی .... تو ہمارا وجود

کہاں ہوتا .... جو کہ
بمنزلہ آئینہ .... تجلیات
کے ہے۔

(۲) یعنی تماشا و نظارہ سے دل ایسا اُچاٹ ہو گیا ہے کہ نہ عبرت کی غرض سے نظر اُٹھتی ہے نہ دلچسپی مناظر کا شوقِ دیدار پیدا ہوتا ہے۔ اور تمنا کی بیکسی اور بے بسی کا یہ عالم ہے کہ نہ کوئی دین کی تمنا ہے، نہ دُنیا کا ارمان!

(۳) وجود اور عدم کے مباحث بیکار ہیں۔ اور عقل و جنون کے امتیازات عبث ہیں۔

(۴) یعنی جن نقوش پر معنی چسپاں کئے جاتے ہیں یا جن اعتبارات پر حقیقت آشناتی کا دعویٰ ہوتا ہے وہ سب لفظی اور ظاہری بھول بھلیاں اور اُلٹ پھیر ہیں اور دُنیا میں حق گوئی کے لئے نہیں بلکہ داد طلبی کے لئے ہے۔

(۵) یعنی عقل پر گھمنڈ یا عقلمندی کی شیخیاں غلط۔ عبادات سے نفع کی توقع ہی کیوں۔ دُنیا و دین ساغرِ عشق کی تلچھٹ ہیں۔ یا دُنیا و دین کو غرقِ مئے عشقِ الٰہی کر دینا بہتر ہے۔ عبادت معاوضہ اور اُجرت کے لئے نہ کرنی چاہئے اور معاملات و علائق کی آلودگی میں عقل پر گھمنڈ نہ ہونا چاہئے۔

(۶) یعنی طاعت و بندگی بھی وفا کی طرح برباد ہیں اور غرور و تمکنت نقشِ قدم کی طرح خاک بسر ہیں۔ یعنی نہ عجز کارآمد ہے نہ غرور کا انجام بخیر۔

(۷) یعنی عشق مخلِ حواس ہے۔ اور وصلِ آئینۂ اُلفت کو مکدّر کر دینے والا ہے۔

(۸) یعنی فرہاد عشرت گاہِ خسرو کا محض مزدور ہے۔ چونکہ تغافلِ شیریں کوہِ بے ستون کی طرح ناقابلِ جنبش ہے۔ اگر کوہ کن مزدورِ محض نہ ہوتا بلکہ جذبۂ کامل و صادق بھی رکھتا ہوتا تو تغافلِ شیریں قائم نہ رہتا۔

(۹) یعنی اہلِ وفا و عشق کی آہوں میں تاثیرِ گداز باقی نہ رہی، اور دلِ غمگیں کے نالے بے اثر ہو گئے!

(۱۰) یعنی ہم تو اہلِ زمانہ کے چپکے سُن لیتے ہیں، ورنہ، نہ اُن سے توقع تحسین رکھتے ہیں، نہ اُن کی نفریں پہ داغ دارا نہ شکایت!

(۱۱) خدا کی پناہ! کس قدر بیہودہ گوئی کر گیا، آدابِ توقیر و تعظیم سے گذر گیا!

(۱۲) یعنی اے قلمِ ہذیان تحریر یا اے قلمِ پریشان رقم لاحول لکھ، اور اے خیال وسوسہ قرین 'یا علیؑ' پکار، تاکہ لاحول لکھنے سے وساوس، ما سوے سے نجات ہو، اور جو لکھنا چاہتا ہوں وہ لکھ سکوں، اور آدابِ وقار و تمکیں سے بعید نہ ہو جاؤں)

(۱۳) (یعنی حضرت مولا علی کرم اللہ وجہہ) فیضِ الٰہی کے مظہر و پیکر، حضورِ رسالت پناہ کے جان و دل، آلِ رسول کے قبلہ اور عالمِ ایجاد و امکاں کے کعبہ ہیں!!

(۱۴) یعنی وہ حاصلِ عالمِ ایجاد، جہاں قدم رکھے، گویا اُس کے نقوشِ قدم سے تمام عالمِ امکان کا مرقع پیش ہو جاتے۔

(۱۵) اور جس خاک پر اُس کا نقش قدم منقش ہو جائے، وہ خاک دونوں جہانوں کے لئے، باعث حرمت و شرف ہے!

(۱۶) حضرت ممدوح کرم اللہ وجہہ، کی کنیت ابو تراب ہے، اس نسبت کی وجہ سے زمین کے فخر و ناز کا، آسمان ہمیشہ خم شدہ رہے گا۔

(۱۷) یعنی یہ آپ ہی کے فیض و لطافت کا اثر ہے، کہ صبا پھولوں سے معطر ہے۔

(۱۸) یعنی آپ کے تلوار کا کاٹ زمانہ بھر میں مشہور ہے، اور ڈر ہوتا ہے، کہ کہیں رشتہ ایجاد و امکاں نہ منقطع ہو جائے!

(۱۹) یعنی، اُس کا جلوہ کفر سوز ہے، اس لئے یقین ہے، کہ بتخانہ چین کی رونق اس طرح اُڑ جائے جیسے عشاق کا رنگ!

(۲۰) یعنی اے جان پناہ، اے دل و دیں کو مستفیض فرمانے والے، اور اے بادشاہ! تو یقیناً وصی رسول کریم ہے!

(۲۱) "ناصیۂ عرش نگیں" یعنی پیشانی عرش پر آپ کا نام نامی کندہ ہے۔

(۲۲) یعنی، جس طرح شمع کا فروغ، شعلہ ہی پر منحصر ہے، اسی طرح آپ کی توصیف صرف خداوند تعالیٰ فرما سکتا ہے، کیونکہ آپ ذات واجب الوجود میں فنا ہیں، اس لئے، ہم، اور ممکنات سے آپ کی مدح ناممکن ہے!

(۲۳) یعنی تیرے آستانہ کے آئینہ سنگ کے جوہر، وہ نشانات ہیں جو جبریل امین کے سجدوں سے بنے ہیں!

(۲۶) یعنی، بہشت کو سوائے خدا کے کوئی دوسرا آراستہ نہیں کر سکتا ہے! اسی طرح ممدوحین خدا کی مدحت کوئی غیر نہیں کر سکتا!

(۳۲) یعنی دل میں محبت ہو اور سینہ فضائے توحید بن جائے، اور اس فضا میں جو ہوا چلتی ہو وہ نفسِ صداقت معمور کی ہو، اور نگاہ ایسی جلوہ آشنا ہو، کہ جب نظر اٹھے، دیدار میسر آجائے!

قصیدہ سوم

ہاں مہِ نو سنیں ہم اس کا نام	۱	جس کو تو جھک کے کر رہا ہو سلام
دو دن آیا ہے تو نظر دمِ صبح	۲	یہی انداز اور یہی اندام
بارے دو دن کہاں رہا غائب	۳	بندہ عاجز ہے گردشِ ایام
اُڑ کے جاتا کہاں کہ تاروں کا	۴	آسماں نے بچھا رکھا تھا دام
مرحبا اے سرورِ خاصِ خواص	۵	حبذا اے نشاطِ عامِ عوام
عذر میں تین دن نہ آنے کے	۶	لے کے آیا ہے عید کا پیغام
اس کو بھولا نہ چاہیئے کہنا	۷	صبح جو جائے اور آئے شام
ایک میں کیا کہ سب نے جان لیا	۸	تیرا آغاز اور ترا انجام
رازِ دل مجھ سے کیوں چھپاتا ہے	۹	مجھ کو سمجھا ہے کیا کہیں نمام
جانتا ہوں کہ آج دنیا میں	۱۰	ایک ہی ہے امید گاہِ انام
میں نے مانا کہ تو ہے حلقہ بگوش	۱۱	غالب اسکا مگر نہیں ہے غلام؟
جانتا ہوں کہ جانتا ہے تو	۱۲	تب کہا ہے بطرزِ استفہام

مہرِ تاباں کو ہو تو ہو اے ماہ	۱۳	قرب ہر روزہ بر سبیلِ دوام
تجھ کو کیا پایہ روشناسی کا	۱۴	جز بہ تقریبِ عیدِ ماہِ صیام
جانتا ہوں کہ اسکے فیض سے تو	۱۵	پھر بنا چاہتا ہے ماہِ تمام
ماہ بن ماہتاب بن میں کون	۱۶	مجھ کو کیا بانٹ دے گا تو انعام
میرا اپنا جدا معاملہ ہے	۱۷	اور کے لین دین سے کیا کام
ہے مجھے آرزوئے بخششِ خاص	۱۸	گر تجھے ہے امیدِ رحمتِ عام
جو کہ بخشے گا تجھ کو فرِ فروغ	۱۹	کیا نہ دے گا مجھے مئے گلفام
جبکہ چودہ منازلِ فلکی	۲۰	کر چکے قطع تیری تیزیٔ گام
تیرے پرتو سے ہوں فروغ پذیر	۲۱	کوئے و مشکوئے و صحن و منظر و بام
دیکھنا میرے ہاتھ میں لبریز	۲۲	اپنی صورت کا اک بلوریں جام
پھر غزل کی روش پہ چل نکلا	۲۳	توسنِ طبع چاہتا تھا لگام
زہرِ غم کر چکا تھا میرا کام	۲۴	تجھ کو کس نے کہا کہ ہو بدنام
مئے ہی پھر کیوں نہ میں پیے جاؤں	۲۵	غم سے جب ہو گئی ہو زیست حرام
بوسہ کیسا یہی غنیمت ہے	۲۶	کہ نہ سمجھیں وہ لذتِ دشنام
کعبے میں جا بجائیں گے ناقوس	۲۷	اب تو باندھا ہے دیر میں احرام
اس قدح کا ہے دور مجھ کو نقد	۲۸	چرخ نے لی ہے جس سے گردشِ وام
بوسہ دینے میں انکو ہے انکار	۲۹	دل کے لینے میں جنکو تھا ابرام
چھیڑتا ہوں کہ انکو غصہ آئے	۳۰	کیوں رکھوں ورنہ غالب اپنا نام
کہہ چکا میں تو سب کچھ اب تو کہہ	۳۱	اے پری چہرہ پیکِ تیز خرام
کون ہے جسکے در پہ ناصیہ سا	۳۲	ہیں مہ و مہر و زہرہ و بہرام
تو نہیں جانتا تو مجھ سے سن	۳۳	نامِ شاہنشاہِ بلند مقام

قبلۂ چشم و دل بہادر شاہ	۳۴	مظہر ذوالجلال والاکرام
شہ سوارِ طریقۂ انصاف	۳۵	نو بہارِ حدیقۂ اسلام
جس کا ہر فعل صورتِ اعجاز	۳۶	جس کا ہر قول معنیِ الہام
بزم میں میزبانِ قیصر و جم	۳۷	رزم میں اُستادِ رستم و سام
اے ترا لطف زندگی افزا	۳۸	اے ترا عہد فرخی فرجام
چشمِ بد دور خسروانہ شکوہ	۳۹	لوحش اللہ عارفانہ کلام
جاں نثاروں میں تیرے قیصرِ روم	۴۰	جرعہ خواروں میں تیرے مرشد جام
وارثِ ملک جانتے ہیں تجھے	۴۱	ایرج و تور و خسرو و بہرام
زورِ بازو میں مانتے ہیں تجھے	۴۲	گیو و گودرز و بیژن و رہام
مرحبا موشگافیِ ناوک	۴۳	آفریں آبداریِ صمصام
تیر کو تیرے تیرِ غیر ہدف	۴۴	تیغ کو تیری تیغِ خصم نیام
رعد کا کر رہی ہے کیا دم بند	۴۵	برق کو دے رہا ہے کیا الزام
تیرے فیلِ گراں جسد کی صدا	۴۶	تیرے رخشِ سبک عناں کا خرام
فنِ صورت گری میں تیرا گرز	۴۷	گر نہ رکھتا ہو دستگاہ تمام
اس کے مضروب کے سر و تن سے	۴۸	کیوں نمایاں ہو صورتِ ادغام
جب ازل میں رقم پذیر ہوئے	۴۹	صفحہ ہائے لیالی و ایام
اور اُن اوراق میں بہ کلکِ قضا	۵۰	مجملاً مندرج ہوئے احکام
لکھ دیا شاہدوں کو عاشق کش	۵۱	لکھ دیا عاشقوں کو دشمن کام
آسماں کو کہا گیا کہ کہیں	۵۲	گنبدِ تیز گردِ نیلی فام
حکمِ ناطق لکھا گیا کہ لکھیں	۵۳	خال کو دانہ اور زلف کو دام
آتش و آب و باد و خاک نے لی	۵۴	وضعِ سوز و نم و رم و آرام

مہرِ رخشاں کا نام خسروِ روز	۵۵	ماہ تاباں کا نام شحنۂ شام
تیری توقیع سلطنت کو بھی	۵۶	دی بدستور صورت ارقام
کاتبِ حکم نے بموجبِ حکم	۵۷	اس رقم کو دیا طرازِ دوام
ہے ازل سے روانیٔ آغاز	۵۸	ہو ابد تک رسائیٔ انجام

(۱) جھک کر سلام کرنے، اور ہلالی شکل میں مشابہت ہے۔

(۹) "نمام" چغل خور۔

(۱۰) "انام" خلق۔

(۱۳) (مصرعِ ثانی) یعنی ہمیشہ کے لئے، روزانہ حضوری۔

(۱۴) یعنی سوائے عید کے، تیرا یہ مرتبہ نہیں، کہ بادشاہ کا روشناس ہو سکے۔

(۲۱) "مشکوئے" محلسرا۔

(۲۴) یعنی غمِ عشق تو مجکو ہلاک کر ہی چکا تھا، تو نے ناحق قتل کر کے الزام اپنے سر لیا۔ یا مجکو تو غمِ عشق ہلاک کر ہی چکا تھا، تو نے دمِ واپسیں آ کر، جبکہ میں لاعلاج ہو چکا تھا، کیوں اپنی مسیحائی کو رسوا کیا!

(۲۵) یعنی، مے بھی حرام ہے اور غم نے زندگی بھی حرام کر دی ہے، پھر شراب ہی کو کیوں اختیار نہ کروں، تاکہ افکار کی ہر لحظہ تلخی سے نجات پاؤں!

(۲۸) "وام" قرض۔

(۲۹) "ابرام" اصرار۔

(۳۱) "پری چہرہ" اور "پیکِ تیز خرام" چاند سے تخاطب ہے۔

(۳۲) "ناصیہ سا" جبیں سائیدہ "بہرام" مریخ۔

(۳۵) "حدیقہ" چمن۔

(۳۹) "وحش اللہ" "ماشاء اللہ" چشم بد دور۔

(۴۰) "فرشدِ جام" کا اشارہ جمشید کی جانب ہے۔

(۴۶) یعنی ہاتھی کی چنگھاڑ، رعد کی گرج سے زیادہ پرہیبت ہے اور گھوڑے کی رفتار، برق پر مضحکہ کرتی ہے!

(۴۹) "لیالی" لیل کی "ایام" یوم کی جمع ہے۔

(۵۶) "توقیع" سند۔

(۵۷) "طرازِ دوام" اندازِ ہمیشگی۔

قصیدۂ چہارم

صبح دم دروازۂ خاور کھلا	۱	مہرِ عالم تاب کا منظر کھلا
خسروِ انجم کے آیا صرف میں	۲	شب کو تھا گنجینۂ گوہر کھلا
وہ بھی تھی ایک سیمیا کی سی نمود	۳	صبح کو رازِ مہ و اختر کھلا
ہیں کواکب کچھ نظر آتے ہیں کچھ	۴	دیتے ہیں دھوکا یہ بازیگر کھلا
سطحِ گردوں پر پڑا تھا رات کو	۵	موتیوں کا ہر طرف زیور کھلا
صبح آیا جانبِ مشرق نظر	۶	اک نگارِ آتشیں رخ سر کھلا
تھی نظر بندی کیا جب ردِ سحر	۷	بادۂ گل رنگ کا ساغر کھلا
لا کے ساقی نے صبوحی کیلئے	۸	رکھ دیا ہے ایک جامِ زر کھلا
بزمِ سلطانی ہوئی آراستہ	۹	کعبۂ امن و اماں کا در کھلا
تاجِ زریں مہرِ تاباں سے سوا	۱۰	خسروِ آفاق کے منہ پر کھلا

شاہ روشن دل بہادر شہ کہ ہے	۱۱	راز ہستی اس پہ سر تا سر کھلا
وہ کہ جسکی صورت تکوین میں	۱۲	مقصد نہ چرخ و ہفت اختر کھلا
وہ کہ جس کے ناخن تاویل سے	۱۳	عقدۂ احکام پیغمبر کھلا
پہلے دارا کا نکل آیا ہے نام	۱۴	اُسکے سرہنگوں کا جب دفتر کھلا
روشناسوں کی جہاں فہرست ہے	۱۵	واں لکھا ہے چہرۂ قیصر کھلا
توسن شہ میں ہے وہ خوبی کہ جب	۱۶	تھان سے وہ غیرت صرصر کھلا
نقش پا کی صورتیں وہ دلفریب	۱۷	تو کہے بت خانۂ آزر کھلا
مجھ پہ فیض تربیت سے شاہ کے	۱۸	منصب مہر و مہ و محور کھلا
تھا دل وابستہ قفل بے کلید	۱۹	کس نے کھولا کب کھلا کیونکر کھلا
لاکھ عقدے دل میں تھے لیکن ہر ایک	۲۰	میری حد وسع سے باہر کھلا
باغ معنی کی دکھاؤں گا بہار	۲۱	مجھ سے گر شاہ سخن گستر کھلا
ہو جہاں گرم غزلخوانی نفس	۲۲	لوگ جانیں طبلۂ عنبر کھلا
کنج میں بیٹھا رہوں یوں پر کھلا	۲۳	کاش کے ہوتا قفس کا در کھلا
ہم پکاریں اور کھلے یوں کون جائے	۲۴	یار کا دروازہ پاویں گر کھلا
ہم کو ہے اس رازداری پر گھمنڈ	۲۵	دوست کا ہے راز دشمن پر کھلا
واقعی دل پر بھلا لگتا تھا داغ	۲۶	زخم لیکن داغ سے بہتر کھلا
ہاتھ سے رکھ دی کب ابرو نے کماں	۲۷	کب کمر سے غمزے کی خنجر کھلا
مفت کا کس کو برا ہے بدرقہ	۲۸	رہروی میں پردۂ رہبر کھلا
سوز دل کا کیا کرے باران اشک	۲۹	آگ بھڑکی مینہ اگر دم بھر کھلا
نامے کے ساتھ آ گیا پیغام مرگ	۳۰	رہ گیا خط میری چھاتی پر کھلا
دیکھیو غالب سے گر الجھا کوئی	۳۱	ہے ولی پوشیدہ اور کافر کھلا

پھر ہوا مدحت طرازی کا خیال	۳۲	پھر مہ و خورشید کا دفتر کھلا
خامے نے پائی طبیعت سے مدد	۳۳	بادہاں کے اُٹھتے ہی لنگر کھلا
مدح سے ممدوح کی دیکھی شکوہ	۳۴	یاں عرض ہے رتبۂ جوہر کھلا
مہر کانپا چرخ چکر کھا گیا	۳۵	بادشہ کا رایتِ لشکر کھلا
بادشہ کا نام لیتا ہے خطیب	۳۶	اب علوِ پایۂ منبر کھلا
سکۂ شاہ کا ہوا ہے روشناس	۳۷	اب عیارِ آبروئے زر کھلا
شاہ کے آگے دھرا ہے آئینہ	۳۸	اب مآلِ سعیِ اسکندر کھلا
ملک کے وارث کو دیکھا خلق نے	۳۹	اب فریبِ طغرل و سنجر کھلا
ہو سکے کیا مدح - ہاں اک نام ہے	۴۰	دفترِ مدحِ جہاں داور کھلا
فکر اچھی پر ستایش ناتمام	۴۱	عجزِ اعجازِ ستایش گر کھلا
جانتا ہوں ہے خطِ لوحِ ازل	۴۲	تم پہ اے خاقان نامآور کھلا
۴۳	تم کرو صاحبقرانی جب تلک ہے طلسمِ روز و شب کا در کھلا	

(۱) "دروازۂ خاور" مطلع آفتاب - دوسرا مصرعہ اسی کی توضیح ہے -

(۲) موتیوں کے خزانہ سے، ستارے، مشبہ ہیں، آفتاب کو ستاروں کا بادشاہ لکھتے ہیں، مطلب ہے کہ وہ موتیوں کا خزانہ جو رات کھلا تھا بادشاہ انجم کے خرچ میں آگیا، یعنی آفتاب نکلا اور ستارے چھپ گئے -

(۳) "سیمیا" شعبدہ، یا وہمی اشکال و صور - یعنی دن نکلنے پہ معلوم ہوا کہ ستاروں اور چاند کا وجود ثابت نہ تھا!

(۴) یعنی ستارے اصل میں، ہماری زمین کی طرح کُرات ہیں

لیکن ہم کو آسمان کا زیور نظر آتے ہیں!

(۶) "نگار آتشیں رخ" معشوقِ شعلہ رو۔ آفتاب سے مستعار ہے

(۷) "ساغرِ بادۂ گلرنگ" آفتاب سے استعارہ ہے۔

(۸) "صبوحی" وہ شراب، جو صبح کے وقت پی جاتی ہے "جامِ زرِ" سنہری ساغر۔ آفتاب کی تشبیہ ہے۔

(۱۰) مہرِ تاباں سے تاج زریں کو شبہ کیا ہے۔

(۱۲) "صورتِ تکوین" صرف خلقت مراد ہے۔

(۱۳) "تاویل" تفسیر۔

(۱۴) "سرہنگ" سپاہی۔

(۱۶ و ۱۷) گھوڑے کے نقوشِ پا کی دلکشی کو بتخانۂ آزر کے دلفریب بتوں سے تشبیہ کی ہے۔

(۱۸) "محور" وہ خط جس کے گرد کوئی کرہ گردش کرتا ہے۔

(۲۰) سبحان اللہ کیسی بیساختہ بندش ہے، اور ممدوح کی طرف کیسا تاکیدی و تصریحی اشارہ ہے۔

(۲۲) گویا اشعار سے مشامِ جاں معطر ہو جائے!

(۲۳) سبحان اللہ قفس و پر وغیرہ استعارات میں کیسے زبردست جذبہ کا اظہار ہوا ہے، کہ "باوجود اختیار مجبور ہوں"

(۲۴) یعنی یوں کون جائے کہ دروازۂ دوست کھلا ہی ہوا ہو، اور خاص و عام کا امتیاز نہ ہو، لطف تو یہ ہے کہ دروازہ بند ہو، ہم پکاریں، اور صرف ہمارے لئے کھولا جائے۔

(۲۵) یعنی ہم کو اس رازداری پر گھمنڈ ہے، اور اس کو یہ علم ہے، کہ

ہم ہی کامیاب ہیں،

(۳۱) یعنی، موجودہ دَور کی رہبری بس اس حیثیت کی ہے، کہ اگر کسی کی رہبری کے لیئے تیار ہوتے ہیں، تو اس لئے نہیں کرتے، کہ منزل تک پہنچا سکیں، بلکہ اس لیئے رہبر بنتے ہیں کہ چند مسفراۃ ساتھی مل جائیں جن سے اپنی راہ آسان ہو جائے!

(۳۲) گویا، اعلیٰ اعلیٰ تشبیہات کا دفتر کھلا۔

(۳۴) یعنی، ممدوح کی شان و عظمت جو بمنزلۂ جوہر کے ہے میرے بیان سے، جو بمصداق عرض ہے، ظاہر ہوتی ہے!

(۳۵) "رایت" جھنڈا۔

(۳۶) یعنی اس منبر کی بلندی و عظمت مرتبت اس سے ظاہر ہوتی ہے، کہ اس پر خطیب بادشاہ کا نام لیتا ہے۔

(۳۷) یعنی، بادشاہ کے نام سے مسکوک و منقوش ہونے سے معلوم ہوا، کہ سونا، واقعی قیمت رکھتا ہے۔

(۳۸) یعنی، سکندر کی کوشش کی غایت، معلوم ہوگئی، کہ آئینہ بادشاہ کے سامنے ہے!

(۳۹) یعنی، خلق نے اب حقیقی وارث ملک کو پہچان لیا، اور معلوم ہوگیا، کہ طغرل و سنجر وغیرہ، غاصب و غدار تھے اور مستحق سلطنت نہ تھے۔

(۴۰) "صاحبقرانی" فتح و خروج۔

مثنوی آموں کی تعریف میں

ہاں دلِ دردمند زمزمہ ساز ۱ کیوں نہ کھولے درِ خزینۂ راز
خامے کا صفحے پر رواں ہونا ۲ شاخِ گل کا ہے گل فشاں ہونا
مجھ سے کیا پوچھتا ہے کیا لکھیے ۳ نکتہ ہائے خرد فزا لکھیے
بارے آمونکا کچھ بیاں ہو جائے ۴ خامہ نخلِ رطب فشاں ہو جائے
آم کا کون مردِ میداں ہے ۵ ثمر و شاخ گوے و چوگاں ہے
تاک کے جی میں کیوں رہے ارماں ۶ آئے یہ گو ہے اور یہ میداں
آم کے آگے پیش جاوے خاک ۷ پھوڑتا ہے جلے پھپھولے تاک
نہ چلا جب کسی طرح مقدور ۸ بادۂ ناب بن گیا انگور
یہ بھی ناچار جی کا کھونا ہے ۹ شرم سے پانی پانی ہونا ہے
مجھ سے پوچھو تمہیں خبر کیا ہے ۱۰ آم کے آگے نیشکر کیا ہے
نہ گل اسمیں نہ شاخ و برگ نہ بار ۱۱ جب خزاں آئے تب ہو اسکی بہار
اور دوڑایئے قیاس کہاں ۱۲ جانِ شیریں میں یہ مٹھاس کہاں
جان میں ہوتی گر یہ شیرینی ۱۳ کوہکن باوجودِ غمگینی
جان دینے میں اسکو یکتا جان ۱۴ پر وہ یوں سہل دے نہ سکتا جان
نظر آتا ہے یوں مجھے یہ ثمر ۱۵ کہ دوا خانۂ ازل میں مگر
آتشِ گل پہ قند کا ہے قوام ۱۶ شیرے کے تار کا ہے ریشہ نام
یا یہ ہوگا کہ فرطِ رافت سے ۱۷ باغبانوں نے باغِ جنت سے
انگبیں کے بحکمِ رب الناس ۱۸ بھر کے بھیجے ہیں سربمہر گلاس

یا لگا کر خضر نے شاخِ نبات	۱۹	مدتوں تک دیا ہے آبِ حیات
تب ہوا ہے ثمر فشاں یہ نخل	۲۰	ہم کہاں ورنہ اور کہاں یہ نخل
تھا ترنجِ زر ایک خسرو پاس	۲۱	رنگ کا زرد پر کہاں بو باس
آم کو دیکھتا اگر اک بار	۲۲	پھینک دیتا طلائے دست افشار
رونقِ کارگاہِ برگ و نوا	۲۳	نازشِ دودمانِ آب و ہوا
رہروِ راہِ خلد کا توشہ	۲۴	طوبیٰ و سدرہ کا جگر گوشہ
صاحبِ شاخ و برگ و بار ہے آم	۲۵	ناز پروردۂ بہار ہے آم
خاص وہ آم جو دارزاں ہو	۲۶	نو برِ نخلِ باغِ سلطاں ہو
وہ کہ ہے والیِ ولایتِ عہد	۲۷	عدل سے اُس کے ہے حمایتِ عہد
فخرِ دیں عزِ شان و جاہ و جلال	۲۸	زینتِ طینت و جمالِ کمال
کار فرمائے دین و دولت و بخت	۲۹	چہرہ آرائے تاج و مسند و تخت
سایہ اُس کا ہما کا سایہ ہے	۳۰	خلق پر وہ خدا کا سایہ ہے
اے مفیضِ وجود سایۂ نور	۳۱	جب تلک ہے نمود سایۂ و نور
اس خداوند بندہ پرور کو	۳۲	وارثِ گنج و تخت و افسر کو

۳۳ شاد و دل شاد و شادماں رکھیو
اور غالب پہ مہرباں رکھیو

(۱) "زمزمہ ساز" نغمہ ساز۔

(۲) "شاخِ گل" قلم سے استعارہ ہے۔

(۳) "نکتہ ہائے خرد فزا" عقل زیادہ کرنے والے رموز۔

(۴) "نخل" کھجور کا درخت۔ "رُطب" کھجور۔

(۵) پھل اور شاخ کو گیند اور بلّے سے تشبیہ دی ہے۔

(۷) "تاک" انگور۔ چھالے، اور انگور میں مشابہت ہے۔

(۸) "بادہ ناب" شراب۔ گویا انگور شرم سے عرق عرق ہوگیا۔

(۱۶) "فرطِ رافت" جوشِ کرم "انگبیں" شہد۔

(۱۸) "شاخ نبات" مصری کی شاخ۔

(۲۱) "ترنجِ زر" سونے کا ترنج۔ طلائے دست افشار، ایسا نرم سونا جو ہاتھ سے مسل جائے۔

(۲۲) "کارگاہِ برگ ونوا" وہ مقام جہاں، درخت اور طائران نغمہ سنج ہوں "دودماں" گھرانا۔ خاندان "آب وہوا" موسم بہار مراد ہے۔

(۲۵) بادشاہ کے باغ کا تازہ ثمر۔

(۲۷) "عزشاں" شان کے لئے باعثِ عزت "جاہِ جلال" جلال کی شان و مرتبت "طینت سے اخلاق حسنہ اور پاک باطنی مراد ہے" جمال کمال" کمال کی نمود

(۲۸) "کارفرما" اہتمام کرنے والا "چہرہ آرا" باعثِ زیب و زینت۔

(۳۰) "مفیض" فیض پہنچانے والا۔

قصیدہ

مرحبا سال فرخی آئیں
عید شوال و ماہ فروردیں

شب و روز افتخار لیل و نہار
مہ و سال اشرف شہور و سنیں

گرچہ ہے بعد عید کے نوروز
لیک بیش از سہ ہفتہ بعد نہیں

سو اس اکیس دن میں ہولی کی
مجلسیں جابجا ہوئیں رنگیں

شہر میں کو بکو عبیر و گلال
باغ میں سو بسو گل و نسریں

شہر گویا نمونۂ گلزار
باغ گویا نگار خانۂ چیں

تین تیوہار اور ایسے خوب
جمع ہرگز ہوئے نہ ہوں گے کہیں

پھر ہوئی ہے اسی مہینہ میں
منعقد محفل نشاط قریں

محفل غسل صحت نواب
رونق افزائے مسند تمکیں

بزم گہ میں امیر شاہ نشاں
رزم گہ میں حریف شیر کمیں

پیشگاہ حضور شوکت و جاہ
خیر خواہ جناب دولت و دیں

جن کی مسند کا آسماں گوشہ
جن کی خاتم کا آفتاب نگیں

جن کی دیوار قصر کے نیچے
آسماں ہے گدائے سایہ نشیں

دہر میں اس طرح کی بزم سرور
نہ ہوئی ہو کبھی بروئے زمیں

انجم چرخ گوہر آگیں فرش
نور مے ماہ ساغر سیمیں

راجہ اندر کا جو اکھاڑا ہے
ہے وہ بالائے سطح چرخ بریں

وہ نظر گاہ اہل وہم و خیال
یہ ضیا بخش چشم اہل یقیں

واں کہاں یہ عطا و بذل و کرم　　کہ جہاں گدیہ گر کا نام نہیں
یاں زمیں پر نظر جہاں تک جائیے　　ژالہ آسا بچھے ہیں دُرِ ثمیں
نغمۂ مطربانِ زہرہ نوا　　جلوۂ لولیانِ ماہ جبیں
اُس اکھاڑے میں جو کہ ہے مظنون　　یاں وہ دیکھا بچشمِ صورت بیں

سرورِ مہر فر ہوا جو سوار　　بکمالِ تجمل و تزئیں
سب نے جانا کہ ہے پری توسن　　اور بالِ پری ہے دامنِ زیں
نقشِ سُمِ سمند سے یکسر　　بن گیا دشت دامنِ گلچیں
فوج کی گردِ راہ مشک فشاں　　رہرووں کی مشام عطر آگیں
بسکہ بخشی ہے فوج کو عزت　　فوج کا ہر پیادہ ہے فرزیں
مرکبِ خاص یوں زمیں پر تھا　　جس طرح ہے سپہر پر پروین
چھوڑ دیتا تھا گور کو بہرام　　ران پر داغ تازہ دیجے وہیں
اور داغ آپ کی غلامی کا　　خاص بہرام کے ہے زیبِ سُریں

بندہ پرور ثنا طرازی سے　　مدعا عرضِ فنِ شعر نہیں
آپ کی مدح اور میرا منہ　　گر کہوں بھی تو کس کو آئے یقیں
اور پھر اب کہ ضعفِ پیری سے　　ہو گیا ہوں نزار و زار و حزیں
پیری و نیستی خدا کی پناہ　　دستِ خالی و خاطرِ غمگیں
صرف اظہار ہے ارادت کا　　ہے قلم کے جو سجدہ ریز جبیں
مدح گستر نہیں دعا گو ہے　　غالبِ عاجزِ نیاز آگیں
ہے دعا بھی یہی کہ دنیا میں　　تم رہو زندہ جاوداں، آمیں

سلام

سلام اُسے کہ اگر بادشاہ کہیں اس کو
تو پھر کہیں کہ کچھ اسکے سوا کہیں اس کو

نہ بادشاہ نہ سلطاں، یہ کیا ستایش ہے
کہو کہ خامسِ آلِ عبا کہیں اس کو

خدا کی راہ میں شاہی و خسروی کیسی
کہو کہ رہبرِ راہِ خدا کہیں اس کو

خدا کا بندہ، خداوندگار بندوں کا
اگر کہیں نہ خداوند کیا کہیں اس کو

فروغِ جوہرِ ایماں، حسینؑ ابنِ علیؑ
کہ شمعِ انجمنِ کبریا کہیں اس کو

کفیلِ بخششِ امت ہے، بن نہیں پڑتی
اگر نہ شافعِ روزِ جزا کہیں اس کو

مسیح جس سے کرے اخذِ فیضِ جاں بخشی
ستم ہے کشتۂ تیغِ جفا کہیں اس کو

وہ جسکے ماتمیوں پر ہے سلسبیل سبیل
شہیدِ تشنہ لبِ کربلا کہیں اس کو

عدو کی سمعِ رضا میں جگہ نہ پائے وہ بات
کہ جن و انس و ملک سب بجا کہیں اس کو

بہت ہے پایۂ گردِ رہِ حسینؑ بلند
بقدرِ فہم ہے گر کیمیا کہیں اس کو

نظارہ سوز ہے یاں تک ہر ایک ذرۂ خاک
کہ لوگ جوہرِ تیغِ قضا کہیں اس کو

ہمارے درد کی یارب کہیں دوا نہ ملے
اگر نہ درد کی اپنے دوا کہیں اس کو

ہمارا منہ ہے کہ دیں اُسکے حسنِ صبر کی داد
مگر نبیؐ و علیؑ مرحبا کہیں اس کو

زمامِ ناقہ کفِ اُسکے میں ہے کہ اہلِ یقیں
پس از حسینؑ علیؑ پیشوا کہیں اس کو

وہ ریگِ تفتۂ وادی پہ گام فرسا ہے
کہ طالبانِ خدا رہنما کہیں اس کو

امامِ وقت کی یہ قدر ہے کہ اہلِ عناد
پیادہ لے کے چلیں اور ناسزا کہیں اس کو

یہ اجتہاد عجب ہے کہ ایک دشمنِ دیں
علیؑ سے آکے لڑے اور خطا کہیں اس کو

یزید کو تو نہ تھا اجتہاد کا پایہ
بُرا نہ مانیئے اگر ہم بُرا کہیں اس کو

علیؑ کے بعد حسنؑ اور حسن کے بعد حسینؑ
کرے جو اُن سے بُرائی بھلا کہیں اس کو

نبیؐ کا ہو نہ جسے اعتقاد کافر ہے
رکھے امام سے جو بغض کیا کہیں اس کو

بھرا ہے غالبؔ دل خستہ کے کلام میں درد
غلط نہیں ہے کہ خونیں نوا کہیں اس کو

قطعہ

کرتا ہے چرخ روز بصد گونہ احترام
فرمانروائے کشور پنجاب کو سلام

حق گو و حق پرست و حق اندیش و حق شناس
نواب مستطاب امیر شہ احتشام!

جم رتبہ مکلوڈ بہادر کہ وقت رزم
ترک فلک کے ہاتھ سے وہ چھین لیں حسام

جس بزم میں کہ ہو نہیں آئین میکشی
واں آسمان شیشہ بنے آفتاب جام

چاہا تھا میں نے تم کو مہ چاردہ کہوں
دل نے کہا کہ یہ بھی ہے تیرا خیال خام

دو رات میں تمام ہے ہنگامہ ماہ کا
حضرت کا عز و جاہ رہے گا علی الدوام

سچ ہے تم آفتاب ہو جس کے فروغ سے
دریائے نور ہے فلک آبگینہ فام

میری سنو کہ آج تم اس سرزمین پر

حق کے تفضلات سے ہو مرجع انام

اخبار لودھیانہ میں میری نظر پڑی
تحریر ایک۔ جس سے ہوا بندہ تلخ کام

ٹکڑے ہوا ہے دیکھ کے تحریر کو جگر
کاتب کی آستیں ہے مگر تیغ بے نیام

وہ فرد جس میں نام ہے میرا غلط لکھا
جب یاد آ گئی ہے، کلیجہ لیا ہے تھام!

سب صورتیں بدل گئیں ناگاہ یک قلم
نمبر رہا، نہ نذر، نہ خلعت کا انتظام!

ستر برس کی عمر میں یہ داغ جانگداز
جس نے جلا کے راکھ مجھے کر دیا تمام

تھی جنوری مہینے کی تاریخ تیرھویں
استادہ ہو گئے لب دریا پہ جب خیام

اس بزم پُر فروغ میں اس تیرہ بخت کو
نمبر ملا نشست میں از روئے اہتمام

سمجھا اسے گر اب ہوا پاش پاش دل
دربار میں جو مجھ پہ چلی چشمک عوام

عزت پہ اہل نام کے ہستی کی ہے بنا
عزت جہاں گئی تو نہ ہستی رہی نہ نام

تھا ایک گونہ ناز جو اپنے کمال پہ
اس ناز کا فلک نے لیا مجھ سے انتقام

آیا تھا وقت ریل کے کھلنے کا بھی قریب
تھا بارگاہِ خاص میں خلقت کا ازدحام

اس کشمکش میں آپ کا مداح دردمند
آقائے نامور سے نہ کچھ کر سکا کلام

جو واں نہ کر سکا وہ لکھا ہے حضور کو
دیں آپ میری داد کہ ہوں فائز المرام

ملک و سپہ نہ ہو تو نہ ہو کچھ ضرر نہیں
سلطانِ بر و بحر کے در کا ہوں میں غلام

وکٹوریا کا دہر میں جو مدح خواں ہو
شاہانِ عصر چاہیئے ایں عزت اُس کو دام

خود ہے تدارک اس کا گورنمنٹ کو ضرور
بے وجہ کیوں ذلیل ہو غالبؔ ہے جس کا نام

امرِ جدید کا تو نہیں ہے مجھے سوال
بارے قدیم قاعدے کا چاہیئے قیام

ہے بندہ کو اعادۂ عزت کی آرزو
چاہیں اگر حضور تو مشکل نہیں یہ کام

دستورِ فنِ شعر یہی ہے قدیم سے
یعنی دعا پہ مدح کا کرتے ہیں اختتام

ہے یہ دعا کہ زیرِ نگیں آپ کے رہے
اقلیم ہند و سندھ سے تا ملکِ روم و شام

قطعہ عرض بحضورِ شاہ

۱	اے شہنشاہِ فلک پایۂ[۱] بے مثل و نظیر	اے جہاندارِ کرم شیوۂ بے شبہ و عدیل
۲	پاؤں سے تیرے ملے فرقِ ارادت اورنگ	فرق سے تیرے کرے کسبِ سعادت اکلیل
۳	تیرا اندازِ سخن شانۂ زلفِ الہام	تیری رفتارِ قلم جنبشِ بالِ جبریل
۴	تجھ سے عالم پہ کھلا رابطۂ قربِ کلیم	تجھ سے دنیا میں بچھا مائدۂ بذلِ خلیل
۵	بسخن اوج دہ مرتبۂ معنی و لفظ	بکرم داغ نہ ناصیۂ قلزم و نیل
۶	تا ترے وقت میں ہو عیش و طرب کی توفیر	تا ترے عہد میں ہو رنج و الم کی تقلیل
۷	ماہ نے چھوڑ دیا ثور سے جانا باہر	زہرہ نے ترک کیا حوت سے کرنا تحویل
۸	تیری دانش مری اصلاحِ مفاسد کی رہین	تیری بخشش مری انجاحِ مقاصد کی کفیل
۹	تیرا اقبالِ ترحم مرے جینے کی نوید	تیرا اندازِ تغافل مرے مرنے کی دلیل
۱۰	بختِ ناساز نے چاہا کہ نہ دے مجھ کو اماں	چرخِ کج باز نے چاہا کہ کرے مجھ کو ذلیل
۱۱	پیچھے ڈالی ہے سرِ رشتۂ اوقات میں گانٹھ	پہلے ٹھونکی ہے بنِ ناخنِ تدبیر میں کیل
۱۲	تپشِ دل نہیں بے رابطۂ خوفِ عظیم	کششِ دم نہیں بے ضابطۂ جرِ ثقیل
۱۳	درِ معنی سے مرا صفحہ لقا کی ڈاڑھی	غمِ گیتی سے مرا سینہ عمر کی زنبیل
۱۴	فکر میری گہر اندوزِ اشاراتِ کثیر	کلک میری رقم آموزِ عباراتِ قلیل
۱۵	میرے ابہام پہ ہوتی ہے تصدق توضیح	میرے اجمال سے کرتی ہے تراوش تفصیل
۱۶	نیک ہوتی مری حالت تو نہ دیتا تکلیف	جمع ہوتی مری خاطر تو نہ کرتا تعجیل

۱۷

قبلۂ کون و مکاں خستہ نوازی میں یہ دیر
کعبۂ امن و اماں عقدہ کشائی میں یہ ڈھیل

(۱) "فلک منظر" بلند نظر ـ بے مثل و نظیر ـ بے شبہ و عدیل۔

(۲) "اورنگ" "تخت" ۔ "فرقِ ارادت" "سر عقیدت و اطاعت" "کسب سعادت" "سعادت حاصل کرنا" "اکلیل" تاج۔

(۳) "شانۂ زلف الہام" یعنی اشارات غیب کی توضیح و تفصیل کرنیوالا یا کلام کی اُلجھنیں دور کرنے والا طریقہ۔

(۴) یعنی موسیٰ جن کو مرتبۂ قرب و ہمکلامی حاصل تھا، اس کی نظیر تو نے پیش کر دی۔ "مائدہ" "خوانِ نعمت"۔ اور تو نے اپنے کرمِ عام سے خاص و عام کے لئے، گویا "بذلِ خلیل" کا مائدہ بچھا دیا ہے۔

(۵) یعنی تیری باتوں سے، لفظ و معنی کا مرتبہ بلند ہوتا ہے۔ اور تیرے فیضانِ جاری سے قلزم، نیل کی پیشانی پر داغ ہے۔

(۶) "توفیر" "زیادتی" "تقلیل" کمی۔

(۷) "ثور" نجومیات میں، ایک برج کا نام ہے، اور "حوت" بھی برج کی ایک شکل ہے، چاند، جب "ثور" میں، اور زہرہ "حوت" میں ہو تو عیش و طرب کے آثار زمانہ میں پیدا ہوتے ہیں۔ "تحویل" "خارج ہونا" "نکلنا" مراد ہے۔

(۸) "اصلاح مفاسد" سے یہاں رفع مشکلات مراد ہے۔ "انحلال" حل و کشود۔

(۹) "اقبالِ ترحم" میلانِ رحم۔

(۱۲) "رابطہ" "شرکت" ۔ ضابطہ جذر ثقیل، بے حد مشکل سے سانس لینے کو تمثیل کیا ہے۔

(۱۴) یعنی میری فکر بہت سے اشارات کے موتی چُنتی ہے، اور میرا قلم مختصر عبارات تحریر کرتا ہے۔ یعنی طبیعت کنایہ پسند ہے۔

قطعہ

کلکتے کا جو ذکر کیا تو نے ہم نشیں	۱	اک تیر میرے سینے میں مارا کہ ہائے ہائے
وہ سبزہ زار ہائے مطرا کہ ہے غضب	۲	وہ نازنیں بتانِ خود آرا کہ ہائے ہائے
صبر آزما وہ اُن کی نگاہیں کہ حف نظر	۳	طاقت رُبا وہ اُنکا اشارا کہ ہائے ہائے
وہ میوہ ہائے تازہ و شیریں کہ واہ وا	۴	وہ بادہ ہائے ناب گوارا کہ ہائے ہائے

(۳) "حف نظر" چشم بد دور۔

قطعہ

ہے جو صاحب کے کفِ دست پہ یہ چکنی ڈلی	۱	زیب دیتا ہے اسے جسقدر اچھا کہیئے
خامہ انگشت بدنداں کہ اُسے کیا لکھیئے	۲	ناطقہ سر بہ گریباں کہ اُسے کیا کہیئے
مہرِ مکتوبِ عزیزانِ گرامی لکھیئے	۳	حرزِ بازوئے شگرفانِ خود آرا کہیئے
مسی آلودہ سرِ انگشت حسیناں لکھیئے	۴	داغِ طرفِ جگرِ عاشقِ شیدا کہیئے
خاتمِ دستِ سلیماں کے مشابہ لکھیئے	۵	سرِ پستانِ پری زاد سے مانا کہیئے
اخترِ سوختۂ قیس سے نسبت دیجے	۶	خالِ مشکیں رخِ دلکش لیلا کہیئے
حجر الاسود دیوارِ حرم کیجیئے فرض	۷	نافہ آہوئے بیاباں ختن کا کہیئے
وضع میں اس کو اگر سمجھیئے قافِ تریاق	۸	رنگ میں سبزۂ نوخیز مسیحا کہیئے
صومعے میں اُسے ٹھہرایئے گر مہرِ نماز	۹	میکدے میں اسے خشتِ خمِ صہبا کہیئے
کیوں اسے قفلِ درِ گنجِ محبت لکھیئے	۱۰	کیوں اُسے نقطۂ پرکارِ تمنا کہیئے
کیوں اُسے گوہرِ نایاب تصور کیجیے	۱۱	کیوں اُسے مردمکِ دیدۂ عنقا کہیئے
کیوں اُسے تکمۂ پیراہنِ لیلا کیجیے	۱۲	کیوں اُسے نقشِ پئے ناقۂ سلمیٰ کہیئے

بندہ پرور کے کفِ دست کو دل کیجیے فرض	۱۳	اور اس چکنی سپاری کو سویدا کہیے

(۲) "انگشت بدندان ہونا" متحیر ہونا" سر بگریباں ہونا" متفکر ہونا" "ناطقہ" گویائی"

(۳) "مکتوب" خط" "حرز" تعویذ" "شکرفانِ خود آرا" معشوقانِ خود پسند۔

(۵) "مانا" مشابہ۔

قطعہ

منظور ہے گزارشِ احوالِ واقعی
اپنا بیانِ حسنِ طبیعت نہیں مجھے

سو پشت سے ہے پیشۂ آبا سپہگری
کچھ شاعری ذریعۂ عزت نہیں مجھے

آزادہ رو ہوں اور مرا مسلک ہے صلحِ کل
ہرگز کبھی کسی سے عداوت نہیں مجھے

کیا کم ہے یہ شرف کہ ظفر کا غلام ہوں
مانا کہ جاہ و منصب و ثروت نہیں مجھے

استاد شہ سے ہو مجھے پرخاش کا خیال
یہ تاب یہ مجال یہ طاقت نہیں مجھے

جامِ جہاں نما ہے شہنشاہ کا ضمیر
سوگند اور گواہ کی حاجت نہیں مجھے

میں کون اور ریختہ ہاں اس سے مدعا

جز انبساط خاطر حضرت نہیں مجھے

سہرا لکھا گیا زرہِ امتثال امر
دیکھا کہ چارہ غیر اطاعت نہیں مجھے

مقطع[1] میں آپڑی ہے سخن گسترانہ بات
مقصود اس سے قطع محبت نہیں مجھے

روئے سخن کسی کی طرف ہو تو رو سیاہ
سودا نہیں جنوں نہیں وحشت نہیں مجھے

قسمت بُری سہی پہ طبیعت بُری نہیں
ہے شکر کی جگہ کہ شکایت نہیں مجھے

صادق ہوں اپنے قول میں غالبؔ خدا گواہ
کہتا ہوں سچ کہ جھوٹ کی عادت نہیں مجھے

---

[1] یہ اشارہ سہرے کے اس مقطع کی جانب ہے:۔
ہم سخن فہم ہیں غالبؔ کے طرفدار نہیں دیکھیں اس سہرے سے کہدے کوئی بڑھکر سہرا

"سہرا"

خوش ہو اے بخت کہ ہے آج ترے سر سہرا
باندھ شہزادے جواں بخت کے سر پہ سہرا

کیا ہی اس چاند سے مکھڑے پہ بھلا لگتا ہے
ہے ترے حسن دل افروز کا زیور سہرا

سر پہ چڑھنا تجھے پھبتا ہے پر اے طرف کلاہ
مجھ کو ڈر ہے کہ نہ چھینے ترا لمبر سہرا

ناؤ بھر کر ہی پروئے گئے ہونگے موتی
ورنہ کیوں لائے ہیں کشتی میں لگا کر سہرا

سات دریا کے فراہم کئے ہوں گے موتی
تب بنا ہوگا اس انداز کا گز بھر سہرا

رُخ پہ دولھا کے جو گرمی سے پسینا ٹپکا
ہے رگِ ابرِ گہر بار، سراسر سہرا

یہ بھی اک بے ادبی تھی کہ قبا سے بڑھ جائے
رہ گیا آن کے دامن کے برابر سہرا

جی میں اترائیں نہ موتی کہ ہمیں ہیں اک چیز
چاہیئے پھولوں کا بھی ایک مقرر سہرا

جبکہ اپنے میں سمائیں نہ خوشی کے مارے
گوندھے پھولوں کا بھلا پھر کوئی کیونکر سہرا

رُخِ روشن کی دمک گوہرِ غلطاں کی چمک
کیوں نہ دکھلائے فروغِ مہ و اختر سہرا

تار ریشم کا نہیں ہے یہ رگِ ابرِ بہار
لائے گا تابِ گرانباریٔ گوہر سہرا

ہم سخن فہم ہیں غالب کے طرفدار نہیں
دیکھیں اس سہرے سے کہدے کوئی بہتر سہرا

نصرت الملک بہادر مجھے بتلا کہ مجھے
تجھ سے جو اتنی ارادت ہے تو کس بات سے ہے
گرچہ تو وہ ہے کہ ہنگامہ اگر گرم کرے
رونق بزم مہ و مہر تری ذات سے ہے
اور میں وہ ہوں کہ گر جی میں کبھی غور کروں
غیر کیا خود مجھے نفرت مری اوقات سے ہے
خستگی کا ہو بھلا جس کے سبب سے سر دست
نسبت اک گونہ مرے دل کو ترے ہات سے ہے
ہاتھ میں تیرے رہے توسن دولت کی عناں
یہ دعا شام و سحر قاضی حاجات سے ہے
تو سکندر ہے مرا فخر ہے ملنا تیرا
گو شرف خضر کی بھی مجھ کو ملاقات سے ہے
اس پہ گذرے نہ گماں ریو و ریا کا زنہار
غالب خاک نشیں اہل خرابات سے ہے

متفرقات

ہے چار شنبہ آخر ماہ صفر چلو
رکھ دیں چمن میں بھر کے مے مشک بو کی ناند
جو آئے جام بھر کے پیئے اور ہو کے مست
سبزے کو روندتا پھرے پھولوں کو جائے پھاند

غالب یہ کیا بیاں ہے بجز مدح بادشاہ
بھاتی نہیں ہے اب مجھے کوئی نوشت و خواند

بٹتے ہیں سونے روپے کے چھلے حضور میں
ہے جن کے آگے سیم و زر مہر و ماہ ماند

یوں سمجھئے کہ بیچ سے خالی کئے ہوئے
لاکھوں ہی آفتاب ہیں اور بےشمار چاند

در مدح شاہ

اے شاہ جہانگیر جہاں بخش جہاں دار
ہے غیب سے ہر دم تجھے صد گونہ بشارت

جو عقدۂ دشوار کہ کوشش سے نہ وا ہو
تو وا کرے اس عقدے کو سو بھی باشارت

ممکن ہے کرے خضر سکندر سے ترا ذکر
گر لب کو نہ دے چشمۂ حیواں سے طہارت

آصف کو سلیماں کی وزارت سے شرف تھا
ہے فخر سلیماں جو کرے تیری وزارت

ہے نقش مریدی ترا فرمان الٰہی
ہے داغ غلامی ترا توقیع امارت

تو آب سے گر سلب کرے طاقت سیلاں
تو آگ سے گر دفع کرے تاب شرارت
(ق)

ڈھونڈھے نہ ملے موجۂ دریا میں روانی

باقی نہ رہے آتش سوزاں میں حرارت

ہے گرچہ مجھے نکتہ سرائی میں توغل
ہے گرچہ مجھے سحر طرازی میں مہارت

کیونکر نہ کروں مدح کو میں ختم دعا پر
قاصر ہے ستایش سے تری میری عبارت

نوروز ہے آج اور وہ دن ہے کہ ہوئے ہیں
نظارگی صنعتِ حق اہل بصارت

تجھ کو شرف مہر جہانتاب مبارک
غالب کو ترے عتبۂ عالی کی زیارت

قطعہ

افطار صوم کی کچھ اگر دستگاہ ہو
اُس شخص کو ضرور ہے روزہ رکھا کرے
جس پاس روزہ کھول کے کھانے کو کچھ نہ ہو
روزہ اگر نہ کھائے تو ناچار کیا کرے

گذارش مصنف بحضور شاہ

اے شہنشاہ آسماں اورنگ
اے جہاندار آفتاب آثار
تھا میں اک بے نوائے گوشہ نشیں
تھا میں اک دردمند سینہ فگار
تم نے مجھ کو جو آبرو بخشی
ہوئی میری وہ گرمی بازار
کہ ہوا مجھ سا ذرۂ ناچیز
روشناس ثوابت و سیار
گرچہ از روئے ننگ بے ہنری
ہوں خود اپنی نظر میں اتنا خوار
کہ گر اپنے کو میں کہوں خاکی
جانتا ہوں کہ آئے خاک کو عار

شاد ہوں لیکن اپنے جی میں کہ ہوں
بادشہ کا غلام کار گزار

خانہ زاد اور مرید اور مداح
تھا ہمیشہ سے یہ عریضہ نگار

بارے نوکر بھی ہو گیا صد شکر
نسبتیں ہو گئیں مشخص چار

نہ کہوں آپ سے تو کس سے کہوں
مدعائے ضروری الاظہار

پیر و مرشد اگرچہ مجھ کو نہیں
ذوقِ آرائشِ سر و دستار

کچھ تو جاڑے میں چاہیئے آخر
تا نہ دے بادِ زمہریر آزار

کیوں نہ درکار ہو مجھے پوشش
جسم رکھتا ہوں، ہے اگرچہ نزار

کچھ خریدا نہیں ہے اب کے سال
کچھ بنایا نہیں ہے اب کی بار

رات کو آگ اور دن کو دھوپ
بھاڑ میں جائیں ایسے لیل و نہار

آگ تاپے کہاں تلک انسان
دھوپ کھائے کہاں تلک جاندار

دھوپ کی تابش آگ کی گرمی
وَقِنَا رَبَّنَا عَذَابَ النَّار

میری تنخواہ جو مقرر ہے
اُس کے ملنے کا ہے عجب ہنجار

رسم ہے مردے کی چھ ماہی ایک
خلق کا ہے اسی چلن پہ مدار

مجھ کو دیکھو تو ہوں بقیدِ حیات
اور چھ ماہی ہو سال میں دو بار

بسکہ لیتا ہوں ہر مہینے قرض
اور رہتی ہے سود کی تکرار

میری تنخواہ میں تہائی کا
ہو گیا ہے شریک ساہوکار

آج مجھ سا نہیں زمانے میں
شاعرِ نغز گوئے خوش گفتار

رزم کی داستاں اگر سنیئے
ہے زباں میری تیغ جوہر دار

بزم کا التزام گر کیجے
ہے قلم میری ابر گوہر بار

ظلم ہے گر نہ دو سخن کی داد
قہر ہے گر کرو نہ مجھ کو پیار

آپ کا بندہ اور پھروں ننگا!
آپ کا نوکر اور کھاؤں اُدھار

میری تنخواہ کیجے ماہ بماہ
تا نہ ہو مجھ کو زندگی دشوار

ختم کرتا ہوں اب دعا پہ کلام
شاعری سے نہیں مجھے سروکار

تم سلامت رہو ہزار برس
ہر برس کے ہوں دن پچاس ہزار

قطعات

بخت سیہ گلیم ہوں لازم ہے میرا نام نہ لے
جہاں میں جو کوئی فتح و ظفر کا طالب ہے
ہوا نہ غلبہ میسر کبھی کسی پہ مجھے
کہ جو شریک ہو میرا شریک غالب ہے

سہل تھا مسہل ولے یہ سخت مشکل آپڑی
مجھ پہ کیا گزرے گی اتنے روز حاضر بن ہوئے
تین دن مسہل سے پہلے تین دن مسہل کے بعد
تین مسہل تین تبریدیں یہ سب کے دن ہوئے

خجستہ انجمن طوئے میرزا جعفر
کہ جس کے دیکھے سے سب کا ہوا ہے جی محفوظ
ہوئی ہے ایسی ہی فرخندہ سال میں غالب
نہ کیوں ہو مادۂ سال عیسوی محفوظ

ہوئی جب میرزا جعفر کی شادی
ہوا بزم طرب میں رقص ناہید

کہا غالب سے تاریخ اسکی کیا ہے
تو بولا انشراح جشن جمشید

گو ایک بادشاہ کے سب خانہ زاد ہیں
دربار دار لوگ بہم آشنا نہیں

کانوں پہ ہاتھ دھرتے ہیں کرتے ہوئے سلام
اس سے ہے یہ مراد کہ ہم آشنا نہیں

رباعی

بعد از اتمام بزمِ عیدِ اطفال
ایامِ جوانی رہے ساغر کش حال
آپہنچے ہیں تا سوادِ اقلیمِ عدم
اے عمرِ گذشتہ یک قدم استقبال

شب زلف و رخِ عرق فشاں کا غم تھا
کیا شرح کروں کہ طرفہ تر عالم تھا
رویا میں ہزار آنکھ سے صبح تلک
ہر قطرۂ اشک دیدۂ پرنم تھا

آتشبازی ہے جیسے شغلِ اطفال
ہے سوزِ جگر کا بھی اسی طور کا حال
تھا موجدِ عشق بھی قیامت کوئی
لڑکوں کیلئے گیا ہے کیا کھیل نکال

دل تھا کہ جو جانِ دردِ تمہید سہی
بیتابیٔ رشک و حسرتِ دید سہی
ہم اور فسردن اے تجلی افسوس
تکرار روا نہیں تو تجدید سہی

ہے خلق حسد قماش لڑنے کیلئے
وحشتکدۂ تلاش لڑنے کے لئے
یعنی ہر بار صورتِ کاغذِ باد
ملتے ہیں یہ بدمعاش لڑنے کیلئے
دل سخت نژند ہو گیا ہے گویا
اس سے گلہ مند ہو گیا ہے گویا
پر یار کے آگے بول سکتے ہی نہیں
غالب منہ بند ہو گیا ہے گویا

دکھ جی کے پسند ہو گیا ہے غالب
دل رک رک کر بند ہو گیا ہے غالب
واللہ کہ شب کو نیند آتی ہی نہیں
سونا سوگند ہو گیا ہے غالب

مشکل ہے زبس کلام میرا اے دل
سن سن کے اسے سخنورانِ کامل
آسان کہنے کی کرتے ہیں فرمائش
گویم مشکل وگرنہ گویم مشکل

بھیجی ہے جو مجھکو شہِ جم جاہ نے دال
ہے لطف و عنایاتِ شہنشاہ پہ دال
یہ شاہ پسند دال بے بحث و جدال
ہے دولت و دین و دانش و داد کی دال

ہیں شہ میں صفات ذوالجلالی باہم
آثار جلالی و جمالی باہم
ہوں شاد نہ کیوں سافل و عالی باہم
ہے اب کی شب قدر و دوالی باہم

حق شہ کی بقا سے خلق کو شاد کرے
تاشاہ شیوع دانش و داد کرے
یہ دی جو گئی ہے رشتۂ عمر میں گانٹھ
ہے صفر کہ افزائش اعداد کرے

اس رشتے میں لاکھ تار ہوں بلکہ سوا
اتنے ہی برس شمار ہوں بلکہ سوا
ہر سیکڑے کو ایک گرہ فرض کریں
ایسی گرہیں ہزار ہوں بلکہ سوا

کہتے ہیں کہ اب وہ مردم آزار نہیں
عشاق کی پرسش سے اسے عار نہیں
جو ہاتھ کہ ظلم سے اٹھایا ہوگا
کیونکر مانوں کہ اس میں تلوار نہیں

ہم گرچہ بنے سلام کرنے والے
کرتے ہیں درنگ کام کرنے والے
کہتے ہیں کہیں خدا سے اللہ اللہ
وہ آپ ہیں صبح و شام کرنے والے

سامان خور و خواب کہاں سے لاؤں

آرام کے اسباب کہاں سے لاؤں
روزہ مرا ایمان ہے غالب لیکن
خس خانہ و برف آب کہاں سے لاؤں

ان سیم کے بیجوں کو کوئی کیا جانے
بھیجے ہیں جو ارمغان شہ والا نے
گن کر دیں گے ہم دعائیں سو بار
فیروزے کی تسبیح کے ہیں یہ دانے

ضمیمہ

غزل

لطفِ نظارہ قاتل دمِ بسمل آئے
جان جائے تو بلا سے پہ کہیں دل آئے
اُن کو کیا علم کہ کشتی پہ مری کیا گذری
دوست جو ساتھ مرے تالبِ ساحل آئے
وہ نہیں ہم کہ چلے جائیں حرم کو اے شیخ
ساتھ حجاج کے اکثر کئی منزل آئے
آئیں جس بزم میں وہ لوگ پکار اٹھتے ہیں
لو وہ برہم زن ہنگامۂ محفل آئے
دیدہ خونبار ہے مدت سے ولے آج ندیم
دل کے ٹکڑے بھی کئی، خون کے شامل آئے

سامنا حور و پری نے نہ کیا ہے نہ کریں
عکس تیرا ہی مگر تیرے مقابل آئے

اب ہے دلی کی طرف کوچ ہمارا غالبؔ
آج ہم حضرتِ نواب سے بھی مل آئے

غزل دیگر

میں ہوں مشتاقِ جفا مجھ پہ جفا اور سہی
تم ہو بیداد سے خوش اس سے سوا اور سہی

تم ہو بُت پھر تمہیں پندارِ خدائی کیوں ہے
تم خداوند ہی کہلاؤ خدا اور سہی

خلد میں کیجیئے تو دوزخ بھی ملالیں یارب
سیر کے واسطے تھوڑی سی فضا اور سہی

ہم سے غالبؔ یہ علائی نے غزل لکھوائی
ایک بیداد گرِ رنج فزا اور سہی

جاناہوں جدھر اٹھتی ہے سب کی دھر انگشت	یکدست جہاں مجھ سے پھرا ہے مگر انگشت
کسقدر خاک ہوا ہے دلِ مجنوں یارب	نقشِ ہر ذرہ سویدائے بیاباں نکلا

برہن شرم ہے باوصف شوخی اہتمام اُس کا
نگیں میں جوں شرارِ سنگ ناپیدا ہے نام اُس کا

مسی آلودہ ہے مُہر نوازش نامہ ظاہر ہے
کہ داغِ آرزوئے بوسہ دیتا ہے پیام اُس کا

بامید نگاہِ خاص ہوں محمل کشِ حسرت
مبادا ہو عناں گیرِ تغافل لطفِ عام اُس کا

گئے وہ دن کہ نادانستہ غیروں کی وفاداری
کیا کرتے تھے تم تقریر ہم خاموش رہتے تھے

بس اب بگڑے پہ کیا شرمندگی جانے دو ملجاؤ
قسم لو ہم سے گر یہ بھی کہیں کیوں ہم نہ کہتے تھے

شب کہ ذوقِ گفتگو سے تیرے دل بیتاب تھا
شوخیٔ وحشت سے افسانہ فسونِ خواب تھا

واں ہجومِ نغمہائے سازِ عشرت تھا اسدؔ
ناخنِ غم یاں سرِ تارِ نفس مضراب تھا

دود کو آج اس کے ماتم میں سیہ پوشی ہوئی
وہ دلِ سوزاں کہ کل تک شمع ماتم خانہ تھا

شکوۂ یارانِ غبارِ دل میں پنہاں کر دیا
غالبؔ ایسے گنج کو شایاں یہی ویرانہ تھا

پھر وہ سوئے چمن آتا ہے خدا خیر کرے	رنگ اڑتا ہے گلستاں کے ہواداروں کا
معزولیٔ تپش ہوئی افراطِ انتظار	چشمِ کشودہ حلقۂ بیرونِ در ہے آج
میرؔ کے شعر کا احوال کہوں کیا غالبؔ	جس کا دیوان کم از گلشنِ کشمیر نہیں
مے کشی کو نہ سمجھ بے حاصل	بادہ غالبؔ عرقِ بید نہیں
ہے نزاکت بسکہ فصلِ گل میں معمارِ چمن	قالبِ گل میں ڈھلی ہے خشتِ دیوارِ چمن

ظاہر ہیں میری شکل سے افسوس کے نشاں
خارِ الم سے پشت بدنداں گزیدہ ہوں

ہوں گرمیٔ نشاطِ تصور سے نغمہ سنج
میں عندلیبِ گلشنِ نا آفریدہ ہوں

ہے کہ بزم طرب آمادہ کرد | برق تیشی ہے کہ فرصت کوئی دم ہے ہمکو

ان سایۂ گل پائے تخت تھا
ال عہد وصال بتاں نہ پوچھ

ہر داغ تازہ یک دل داغ انتظار ہے
عرض فضائے سینۂ درد امتحاں نہ پوچھ

کل وہ محرم راز اپنے سے کہ آہ
ائی اسد اللہ خاں نہ پوچھ

یزش خوں کے سبب رنگ اڑ نہیں سکتا	حنائے پنجۂ صیاد مرغ رشتہ بر پا ہے
زبسکہ سوکھ گئے چشم میں سر شک	آنسو کی بوند گوہر نایاب ہو گئی
ہے یاں تک اشکوں میں غبار کلفت خاطر	کہ چشم تر میں ہر اک پارۂ دل پائے در گل ہے
ہی اگر موقوف انداز تغافل ہو	تکلف برطرف تجھ سے تری تصویر اچھی ہے
ہوں شوخی رنگ یاقوت دیکھ کر	یاں ہے کہ صحبت خس و آتش برابر ہے
ہی کی حقیقت حضور والا نے تے گیہوں نکلتے نہ خلد سے باہر	مجھے جو بھیجی ہے بیسن کی روغنی روٹی جو کھاتے حضرت آدم یہ بیسنی روٹی

(تمام شد)

Ghulam Mustafa Daim

rekhta

मध्य प्रदेश उर्दू अकादमी
مدھیہ پردیش اردو اکیڈمی